کلیاتِ اکبر

(حصہ اوّل)



مُقدّمہ

برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد جب انگریزی اقتدار کے سائے تلے انگریزی تہذیب و تمدن نے اپنا اثر و نفوذ شروع کیا تو اس کا ردِّ عمل کئی طرح سے ظاہر ہوا۔ ایک گروہ نے سیاست کی بازی گاہ سے راہ فرار اختیار کر کے مسجد اور خانقاہ کے حجروں میں عزلت گزینی اختیار کی تو دوسرے گروہ نے سیاست کی بازی گاہ سے نکل کر مدرسوں اور کالجوں کو اپنا میدان تگ و تاز بنایا۔ یہ دونوں گروہ اپنی اپنی دانست میں مغربی تہذیب و تمدن کے اس طوفان بلاخیز کے آگے بند باندھنے کی کوشش کر رہے تھے جو آہستہ آہستہ تمام برصغیر کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا تھا لیکن ان دونوں گروہوں کے بین بین ایک شخص ایسا بھی تھا جو سیاست، مسجد، خانقاہ اور مدرسہ و کالج کو الگ الگ دائروں میں محصور کر دینے کی بجائے ان میں ایک تعلق باہمی پیدا کرنے کا قائل تھا۔ جہاں اس کی نظر تہذیب مغرب کے معائب پر تھی، وہیں وہ زوال آمادہ تہذیب مشرق کی خرابیوں سے بھی بے خبر نہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں نے تہذیب مغرب کے خلاف جس ردِّ عمل کا اظہار کیا، اس کی سب سے زیادہ جان دار تصویر اسی شخص کے ہاں ملتی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جسے آج دنیا اکبر الٰہ آبادی کے نام سے جانتی ہے اور طنز و ظرافت کا شہنشاہ مانتی ہے۔

حالاتِ زندگی

اکبر الٰہ آبادی جن کا پورا نام سیّد اکبر حسین اور تخلص اکبر تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو باڑہ (الٰہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک معزز سادات خاندان تھا جس کے مورثِ اعلیٰ ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کے والد سیّد تفضل حسین ایک جید عالم تھے اور انہیں تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اسی طرح ان کی والدہ بھی نہایت پرہیزگار اور پارسا خاتون تھیں۔ چنانچہ اکبر کو دینی شغف اور مذہب کی محبت ایک طرح سے ورثے میں ملی۔ یہ وہ ورثہ تھا جسے انہوں نے عمر بھر حرزِ جان بنائے رکھا۔

اکبر کا خاندان مالی لحاظ سے کچھ ایسا آسودہ حال نہ تھا اس لئے اس امر کے باوجود کہ اوائل عمری سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ظاہر تھے، اکبر کی تعلیم بچپن میں نہایت معمولی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ علمی ذوق اور مستقل ذاتی مطالعہ کی بدولت انہوں نے بعد میں اس کی تلافی کر لی اور فارسی و عربی کے علاوہ انگریزی سے بھی خاصی واقفیت پیدا کر لی۔ ان کی خداداد قابلیت و لیاقت کا ایک ثبوت اس بات سے بہم پہنچتا ہے کہ ان کی عمر ابھی مشکل سے دس سال تھی کہ وہ اردو میں نہایت عمدہ خط لکھ لیتے تھے اور فارسی کی قابلیت میں اپنے اکثر ہم عمروں سے پیش پیش تھے۔

اکبر کے والد گرامی نے انہیں انگریزی تعلیم کے لئے مشن اسکول میں داخل کرایا تھا اور اس طرح ایک ایسی دور اندیشی اور وسعتِ نظری کا ثبوت بہم پہنچایا تھا جس سے اس زمانے کے بہت کم لوگ متصف تھے لیکن اکبر نے ابھی انگریزی کی چند ابتدائی کتابیں ہی پڑھی تھیں کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر گھر کے معاملات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ انہیں باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی اور کم سنی ہی کا عالم تھا کہ دنیا داری میں پڑ گئے لیکن انہوں نے اپنے طور پر انگریزی کی تعلیم و تحصیل جاری رکھی اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔

۱۸۵۹ء میں انہوں نے بطور نقل نویس سرکاری ملازمت اختیار کی لیکن یہ کام ان کی طبیعت سے کچھ مناسبت نہ رکھتا تھا، چنانچہ انہوں نے قانون پڑھنا شروع کیا اور ۱۸۶۷ء میں قانون کا پہلا امتحان پاس کیا جس کی بنا پر انہیں وکالت کرنے کی سند مل گئی لیکن وکالت کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ امتحان پاس کرتے ہی وہ نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے۔

۱۸۷۰ء میں وہ الٰہ آباد ہائیکورٹ میں ریڈر ہو گئے اور اس حیثیت میں انہوں نے اپنے انگریزی اور قانون کے علم میں معتدبہ اضافہ کیا۔ ۱۸۷۳ء میں انہوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۸۸۰ء میں وہ منصف کی حیثیت سے دوبارہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور کچھ مدت تک علی گڑھ میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

علی گڑھ میں سیّد اکبر حسین کا تقرر سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفیقِ کار مولوی سمیع اللہ خاں کی خاص درخواست پر عمل میں آیا تھا کیونکہ وہ علی گڑھ کے عظیم الشان تعلیمی کام کے سلسلے میں سیّد اکبر حسین کی ذہانت اور قابلیت سے مدد لینا چاہتے تھے لیکن اس امید میں انہیں مایوسی ہوئی، اس لئے کہ اکبر سر سیّد اور اُن کی تعلیمی کوششوں کے مداح و معترف ہونے کے باوجود ان کے ہم نوا نہ تھے۔ تعلیم عامہ اور اس کے مقاصد کے بارے میں سر سیّد احمد خاں اور اکبر متضاد خیالات و نظریات کے حامل تھے۔ اس لئے باوجود مدت العمر ایک دوسرے کے محبِ صادق رہنے کے اکبر کو کبھی سر سیّد کی رائے سے اتفاق نہ ہوا۔ البتہ سر سیّد کا فیضِ صحبت ان کی شاعری کے لئے ایک زبردست محرک ثابت ہوا۔ چنانچہ سر سیّد کا نام نامی اور ان کے کارنامے اکبر کی بہت سی دلچسپ اور معنی خیز نظموں کی شانِ نزول ہیں۔

۱۸۸۸ء میں سیّد اکبر حسین سب جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پھر ۱۸۹۴ء میں انہیں الٰہ آباد کی عدالتِ خفیفہ کا جج مقرر کیا گیا۔ اسی سال وہ ترقی پا کر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہو گئے اور اس حیثیت سے انہوں نے الٰہ آباد، جھانسی، مین پوری اور بنارس میں فرائض انجام دیئے۔ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ مسٹر جسٹس ایکمن کی مدت ملازمت ختم ہونے پر سیّد اکبر حسین کو الٰہ آباد ہائی کورٹ میں جج بنایا جائے گا لیکن اس وقت کے آنے سے پہلے ہی ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی تکلیف پیدا ہو گئی کہ وہ ۱۹۰۳ء میں ملازمت کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔

ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد اُن کا بیشتر وقت علمی و ادبی مشاغل کی نذر ہونے لگا۔ آخر عمر میں انہیں یکے بعد دیگرے دو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ان کی زوجۂ محترمہ کا انتقال ہوا اور پھر ۵ جون ۱۹۱۲ء کو ان کے دوسرے بیٹے سیّد ہاشم حسین نے عین عالم جوانی میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ ان صدمات کے باوجود اُن کا دماغ تر و تازہ اور تخیل شاداب رہا۔ ہرچند کہ اُن پر ضعیفی اور کہولت کا غلبہ ہو چکا تھا لیکن اس ضعیفی اور کہولت کے اثرات اُن کی شاعری پر کہیں دکھائی نہ دیتے تھے، اور ان کے اشعار طنز و ظرافت کا وہی رنگ لئے ہوتے تھے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

سیّد اکبر حسین خط و کتابت کے معاملے میں نہایت باقاعدہ تھے اور اپنے دور کے بے شمار ادیبوں کے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ شاعری کے

ظریفانہ رنگ کے برعکس اُن کے خطوط میں بلا کی سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر خطوط میں بڑھاپے کے جسمانی عوارض اور اُن دماغی تکالیف کا ذکر ہے جو بیوی اور بیٹے کی جدائی کے صدمے کا نتیجہ تھیں یا پھر دنیاوی امور کی بجائے اُمورِ آخرت کا تذکرہ ہے جو ان کے دل میں مذہب کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آخر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انہوں نے الٰہ آباد کے مقام پر اس عالم رنگ و بو سے منہ موڑ کر سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

اکبر کی شاعری

اکبر نے بارہ سال کی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری عطیۂ الٰہی تھی۔ شروع شروع وہ اپنا کلام آتش کے شاگرد غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے تاہم کلیاتِ اکبر میں اٹھارہ انیس سال عمر کی جو غزلیں درج ہیں، اُن کی نادر الکلامی صاف بتا دیتی ہے کہ شاعر ہونہار ہے۔ اگرچہ ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنز و مزاح کی وہ خصوصیات جن کی بنا پر اکبر اپنے دور کے منفرد اور فقید المثال شاعر قرار پائے، ان کے ابتدائی کلام میں نہیں پائی جاتیں لیکن اردو شاعری کے روایتی معیار کے مطابق دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اکبر نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں جو اشعار کہے ہیں، وہ اچھے اچھے کہنہ مشق شاعروں کے لئے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔

اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی شعرا کی طرح غزل گوئی سے ہی کیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں جب کہ ان کی عمر اکیس سال تھی، انہوں نے پہلی بار ایک مشاعرے میں غزل پڑھی اور تحسین عام حاصل کی تو وہ ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ بعدازاں وہ چند سال تک عام رنگ کی غزلیں لکھتے رہے۔ ان غزلوں میں شوخی اور تغزل کی اس قدر افراط ہے کہ ان کی نسبت "آورد" یا "تصنع" کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف تو وہ کسی مبالغہ آرائی کو پسند نہیں کرتے، دوسری طرف حقائق اور وارداتِ قلبی کو نہایت نادر اور بدیع اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے حسن و عشق کے باہمی راز و نیاز کی ایسی شوخ و شنگ اور کیف انگیز تصویریں پیش کی ہیں کہ اردو ادب میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

غزل گوئی اکبر کی شاعری کا ابتدائی میدان تنگ و تاز تھا، لیکن غزل جیسی چیز میں بھی انہوں نے پند و موعظت، اصلاحِ تہذیب و تمدن اور لطیف طنز پر مبنی بڑے بڑے پیارے اشعار کہہ ڈالے ہیں، پھر غزل سے چل کر جب وہ رباعیات و قطعات کی دنیا میں داخل ہوئے تو موضوعات کے ایک عالم کو جیسے اپنا موضوعِ سخن بنا ڈالا۔ مذہب اور لامذہبیت خدا اور رسول کی محبت، نوجوانوں کی مذہب سے بیگانگی، مغربی تہذیب اور اس کی اندھا دھند تقلید، اخلاق و معاشرت، بے ہودہ رسم و رواج، معاشرتی معائب، دنیا کی بے ثباتی، فکرِ آخرت، علی گڑھ کالج اور سر سید احمد خاں، گاندھی اور ان کی تحریکیں، پردہ، تعلیم نسواں، عورتوں کی آزادی، نئی اور پرانی تہذیب، نئی اور پرانی تعلیم، استاد اور شاگرد انگریز اور انگریزی حکومت، مسلمانوں کی حالت، اردو ہندی، نوجوانوں کی ملازمتوں کے لئے دوڑ دھوپ، اسمبلی، ممبری، چندہ، سکول غرض کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کا کوئی موضوع ایسا نہیں جس کو انہوں نے موضوعِ سخن نہ بنایا ہو۔

اکبر نے خود اپنی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) پہلا دور ۱۸۶۶ء تک

یہ زمانہ ان کی نومشقی کا تھا۔ اس وقت کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے مستند اساتذہ کی تقلید میں ہے۔ مضامین فرسودہ ہونے کے باوجود جذبات میں صفائی، زبان میں سادگی اور روانی سے ان کا خوش آئند مستقبل صاف ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک

اس دور میں کلام میں بے تکلفی کا عنصر کافی بڑھ گیا ہے اور فرسودہ مضامین اور حشو و زوائد کی معتد بہ کمی ہے۔ درد و اثر بندش اور طرزِ ادا میں وہ دوسروں سے ممتاز و ممیز نظر آنے لگتے ہیں۔

(۳) تیسرا دور ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۸ء تک

اس دور میں ان کے کلام میں استادانہ رنگ آ گیا ہے۔ نومشقی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور بیان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ غزلیں زیادہ لکھتے ہیں لیکن پرانے رنگ کی بجائے اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے اور کلام میں ظرافت کا عنصر بڑھ رہا ہے۔ کہیں کہیں روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔

(۴) چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

یہ دور اگرچہ تیسرے دور سے الگ نہیں لیکن پھر بھی بہت ترقی کا دور ہے۔ اب حضرت اکبر فی الحقیقت لسان العصر ہو گئے ہیں۔ قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی ہے اور فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق اور ظرافت میں ترقی ہو رہی ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر نہایت بے باکی اور شوخی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اخلاقی، روحانی اور فلسفیانہ رنگ کا زور ہے۔ عاشقانہ رنگ اگرچہ مدھم ہو چکا ہے لیکن اس کو بھولے نہیں۔ خیالات میں اب ایسا زور پیدا ہو گیا ہے کہ شاعری کے مسلمہ قیود ٹوٹ چکے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار نئے نئے انداز سے کرتے ہیں۔ کہیں انگریزی کے قافیے لاتے ہیں اور کہیں جدید استعارے اور تشبیہیں۔ اس دور میں اکبر اپنے فن کے صناعِ کامل ہیں۔

(۵) پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک

اس دور کے کلام میں جو کہ آخری دور ہے، عاشقانہ رنگ بہت کم ہے۔ اشعار پر ظریفانہ، سیاسی، اخلاقی اور روحانی رنگ چڑھا ہوا ہے اور یہ دور حقیقت میں ان کی شاعری کی معراج ہے۔ اگرچہ اس میں شباب کی سی شوخی اور جوش نہیں لیکن وسیع تجربے اور طویل عمر نے ان کے کلام کو فلسفیانہ بنا دیا ہے۔ اس دور کے اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ انسان انہیں اپنا دستور العمل بنائے۔

اکبر اور علی گڑھ تحریک

اکبر کی شاعری کو روایتی غزل گوئی کی محدود دنیا سے نکالنے میں بالواسطہ طور پر سر سید احمد خاں کی علمی تحریک کا بڑا ہاتھ ہے۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ علی گڑھ میں منصف کی حیثیت سے سید اکبر حسین کا تقرر سر سید احمد خاں اور اُن کے رفیقِ کار مولوی سمیع اللہ خاں کی خاص درخواست پر عمل میں آیا تھا کیونکہ وہ علی گڑھ کے عظیم الشان تعلیمی کام کے سلسلے میں سید اکبر حسین کی ذہانت اور قابلیت سے مدد لینا چاہتے تھے لیکن علی گڑھ میں جس کالج کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، وہ اکبر کی نظر میں مغربی خیالات و اثرات کا زندہ مجسمہ تھا۔ اکبر انگریزی کی تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ انہوں نے خود بڑی کاوش سے انگریزی میں استعداد پیدا کی تھی اور اسی استعداد کی بدولت سرکاری ملازمت پر فائز ہوئے تھے لیکن وہ ہر مسلمان کو صحیح اسلامی تہذیب اور اسلامی عقائد و اوصاف سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں وہ بُرے رسم و رواج، معاشرتی معائب

مذموم عادات و اطوار اور تباہ کن بدعات و خرافات کی بیخ کنی کے آرزومند تھے وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں غیرت و حمیت پیدا ہو۔

چنانچہ انہوں نے لطیف طنز کے پیرائے میں لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا کہ کالج اور انگریزی تعلیم کی ظاہری دلفریبیوں سے مسحور ہو کر روحانی ترقی اور قومی غیرت و حمیت سے غافل نہ ہو جانا۔ شروع شروع میں ان کی وہ نظمیں جن میں انہوں نے سرسید احمد خاں کی مساعی کی کامیابی پر تشویش کا اظہار کیا تھا صرف ان لوگوں میں مقبول ہوئیں جو علانیہ سرسید اور اُن کی تحریک کے مخالف تھے لیکن آہستہ آہستہ جب انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سامنے آئے اور کالج سے ایسے نوجوان نکلے جن کی نظروں میں خدا اور رسول، قوم اور ملک، مذہب اور تہذیب غرض کہ اپنی کسی بھی چیز کی کوئی وقعت نہ تھی اور جن کی نظروں میں صرف انگریزوں ہی کا ہر قول و فعل محبت تھا، تو رائے عامہ اکبر کے موافق ہو گئی اور ان کی آواز توجہ سے سُنی جانے لگی اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس تیزی سے بعض تعلیم یافتہ مسلمان مغرب کی کورانہ تقلید کے راستے پر بڑھتے چلے جاتے تھے، اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے ان کی اصلاح و فلاح کے ضمن میں ایک نمایاں خدمات انجام دی ہے۔

تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ سرسید نے مسلمانوں میں اشاعتِ تعلیم کے ضمن میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، انہیں اکبر نے نظر انداز کر دیا۔ نہیں بلکہ اکبر نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے برملا یہ اعتراف کیا ہے کہ سرسید کا نصب العین اپنی قوم کی ترقی تھا۔ انہیں اختلاف تھا تو صرف اس طریق کار سے جو علی گڑھ میں اختیار کیا گیا۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ محض کتابی علم یا زبانی جمع خرچ سے یا مذہب کی ظاہرداری اور برائے نام عزت سے نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی وہ محبت پیدا نہیں ہو سکتی جو انہیں صحیح مسلمان بنانے اور ان کی غیرت و حمیت کو بیدار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ بزرگوں کا فیضانِ صحبت اُن کے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا ٭ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اسی طرح ایک اور مقام پر وہ اس افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے دلدادہ اپنے آباؤ اجداد سے صرف ظاہری طور پر مشابہ رہ گئے ہیں اور ان کی باطنی خوبیوں کو ضائع کر چکے ہیں ؎

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم ٭ رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

اس اختلاف کے باوصف سرسید احمد خاں کی وفات پر اکبر نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا تھا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا ٭ نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر ٭ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے قومی مقاصد اور سرگرمیوں سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود اکبر اُن کی علمی قابلیتوں اور پُرخلوص کارگزاریوں کی بہت قدر کرتے تھے، اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کے بارے میں بھی عدل و انصاف کی رائے کا اظہار کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے۔

محاسن کلام

اکبر الٰہ آبادی اُن اکابرین سے تھے جنہوں نے مغلوں کے زوال سے قریب تر زمانے میں آنکھ کھولی۔ اُودھ کے اجڑنے کا سماں دیکھا اور اُن لوگوں سے ملے جلے بھی جنہوں نے اودھ کے دورِ نشاط میں سکون و آسائش سے زندگی گزاری تھی۔ قوم کے زوال کے بعد قوم کی شکست خوردہ ذہنیت اور قنوطیت کو سرسید اور حالی کی طرح اکبر نے بھی محسوس کیا۔ سرسید نے تو قوم کی اصلاح کے لئے جدید تعلیم کا نسخہ تجویز کیا اور حالی نے سیرت و اخلاق کی درستی کو قوم کے مرض کی دوا سمجھا لیکن اکبر کے نزدیک ساری خرابی مذہبی اصولِ تعلیم اور انسانی کردار سے بے خبری کا نتیجہ تھی۔ سرسید اور حالی کے برعکس اکبر نے اپنی رائے پیش کرنے کا ایسا طریقہ وضع کیا کہ ہر شخص اسے دلچسپی اور توجہ سے پڑھ سکے۔

اکبر اور اقبال اس صدی کے دو مصلحِ اعظم شاعر تھے۔ ان میں ایک بذلہ سنج تھا تو دوسرا رجز خواں۔ لیکن دونوں نے قوم کو ایک ہی پیغام دیا۔ دونوں کا مقصد قوم کے افراد کو تہذیبِ مغرب کے دجل و فریب سے محفوظ رکھنا اور اپنے تہذیبی شعائر کی حفاظت کے لئے اپنے وقارِ گم گشتہ کو پانا اور غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اقبال نے قوم کے سامنے فلسفۂ خودی پیش کیا لیکن اکبر کا کمال یہ ہے کہ اس نے گہری حکیمانہ باتوں کو بھی عام فہم اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا اور طنز و ظرافت کے پردے میں حقائق و معارف کی ایسی نادر مثالیں پیش کیں کہ ہمارا متمدن اور ترقی یافتہ دور بھی اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

شوخی، طنز اور ظرافت اکبر کے کلام کے وہ نمایاں اوصاف ہیں جن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ ان کی شوخی اور طنز و ظرافت کا مقصد نہ تو وقتی خوش طبعی ہے اور نہ رنجش و مناقشہ پیدا کرنا۔ ان کی شوخی اور ظرافت اگرچہ واقعات و حقائق پر مبنی ہوتی ہے لیکن اس سے کسی کا دل دکھانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد نتیجہ کے لحاظ سے نہایت بلند اور نصیحت آموز ہیں۔ وہ معاشرتی معائب، مغرب پرستی اور ذہنی غلامی کو خاص طور پر اس کا ہدف بناتے ہیں۔

اکبر نے اپنے کلام میں شوخی اور ظرافت کے لئے کئی ایسے طریقوں سے کام لیا ہے کہ کلام کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ وہ جدید و لطیف عام فہم تشبیہات و استعارات کو ایک نیا رنگ دے کر دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ معمولی الفاظ بالکل انوکھے طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ غیر زبانوں کے الفاظ قافیے کے طور پر لاتے ہیں، بعض سبک الفاظ جو عام شعراء استعمال نہیں کرتے نہایت خوبی اور شوخی سے اپنے شعروں میں لے آتے ہیں۔ اس ضمن میں بدھو، جمّن اور کلو وغیرہ کے الفاظ اکبر نے اپنے شعروں میں نگینوں کی طرح جڑے ہیں۔

اکبر جگہ اساتذہ کے بعض معروف اشعار پر اپنے انداز میں کوئی ایسی شوخ اور ظریفانہ بات کہہ گزرتے ہیں کہ قاری کو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے اور ان کی بات کا لطف بدرجہا بڑھ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پیروڈی، تحریف، تضمین سبھی طریقوں سے کام لیا ہے مثلاً سعدیؒ کا شعر ہے ؎

کریما بہ بخشائے برحالِ ما ٭ کہ ہستم اسیر کمند ہوا

زاغ ہو جائے گا اک دن آخری عندلیب ؛ پارک میں اُن کے دیا کرتا ہے آپ یہی دغا

غرض انگریزی الفاظ کے استعمال سے تیر و نشتر کا جو کام اکبر نے لیا ہے، وہ اور کسی سے نہیں ہو سکا۔ یہ وہ دلیرانہ جدت اور طرزِ ادا تھی جس کے اکبر آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہیں۔

اکبر کی زندہ دلی

زندہ دلی حضرت اکبر کی ایک امتیازی خصوصیت تھی۔ اشعار میں تو اُن کا یہ وصف جگہ جگہ نمایاں ہے لیکن ان کی طبیعت میں بھی یہ رنگ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اکبر کے بے تکلف دوست تھے۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں اور اس کی پابندی کو کئی لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں بلکہ اپنے پرچے "دلگداز" میں پردے کے خلاف ایک زوردار مقالہ بھی لکھا ہے۔ اکبر الٰہ آباد سے سیدھے لکھنؤ پہنچے، شرر کے مکان کا پتا چلایا اور بغیر کسی کو اطلاع دیئے زنان خانے میں جا دھمکے۔ عورتوں نے یہ دیکھ کر چیخ پکار شروع کر دی کہ یہ کون مُوا بے دھڑک اندر چلا آیا ہے، نکالو اسے! ڈاڑھی رکھ کر بھی تو شرم نہیں آتی۔ اتنے میں مولانا شرر بھی بیٹھک سے اندر آئے۔ دیکھا کہ یہ تو حضرت اکبر ہیں۔ فوراً بغل گیر ہوتے اور انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ بظاہر بدگمانی کی کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اکبر جیسا سنجیدہ اور نیک دل شخص کسی نازیبا حرکت کا مرتکب ہی کیونکر ہو سکتا تھا۔ پھر بھی شرر نے ہنسی ہنسی میں دریافت کیا "حضرت! خلافِ معمول آپ نے یہ جسارت کیونکر گوارا فرمائی اور اس میں کون سی حکمت پیشِ نظر تھی؟" حضرت اکبر نے جواب دیا "بھئی آپ جو پردے کے مخالف سُنے گئے تھے۔ اس لئے میں نے دیکھنا چاہا کہ اپنے حق میں اس قول پر کہاں تک عمل پیرا ہو۔ سو جو چیز کوئی شخص اپنی ذات کے لئے برداشت نہ کر سکے، اس کی تلقین دوسروں کو کیوں کرے!" اس کے جواب میں شرر صرف ایک ندامت آمیز سکوت اختیار کر کے رہ گئے۔ اکبر چند روز لکھنؤ میں رہ کر واپس الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے شرر کو جو خط لکھا، اس میں ان واقعات کی طرف طنزاً یوں اشارہ کیا گیا تھا ؎

بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے ؛ اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق

صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے ؛ بے حجابی مرے ہمسائے کی خاطر سے نہیں

اسی طرح ایک واقعہ ہے۔ شب برات کا دن تھا۔ ملنے والے جمع تھے۔ ان میں ایک صاحب قدسی جائسی نامی بھی تھے۔ ڈاڑھی مونچھ صاف، لڑکے سے معلوم ہوتے تھے۔ بہت شوخیاں کر رہے تھے اور بے تکلف اور گستاخ ہوئے جاتے تھے۔ بار بار حضرت اکبر سے کہتے "آج شب برات ہے، شب براتی دلوایئے!"

اصرار زیادہ بڑھا تو حضرت اکبر نے تنگ آ کر ایک شعر میں قدسی صاحب کو جواب دیا ؎

میری جاں! تم تو خود پٹاخا ہو ؛ تحفۂ شب برات میں کیا دوں

قدسی صاحب جھینپ گئے اور یار لوگ مدتوں انہیں یہ شعر سناتے رہے۔

ایک دفعہ حضرت اکبر کے بڑے بیٹے سید عشرت حسین نے اپنے چند انگریز دوستوں کو چائے پر مدعو کیا۔ مقررہ وقت پر مہمان آتے گئے اور کمرے میں بیٹھتے گئے۔ اسی کمرے میں ایک طرف حضرت اکبر بھی کرسی پر بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ چونکہ وہ کُرتا پاجامہ اور گول ٹوپی پہنے بیٹھے تھے اس لئے کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہ دی۔ جب عشرت آئے تو انہوں نے ان کا تعارف سب مہمانوں سے کرایا کہ یہ میرے والد ہیں اور جج ہیں۔ اس پر مہمانوں نے معذرت کی کہ ہم نے آپ کو بیٹھے ضرور دیکھا تھا لیکن مصافحہ و معانقہ نہ کیا۔ اس پر حضرت اکبر نے کہا "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایک دفعہ انگلستان میں اللہ میاں خود آ گئے۔ خلقت کی نظر پڑی تو سوال کیا کہ یہ کون بوڑھا ہے۔ جواب ملا کہ ہیں تم اللہ میاں سے واقف نہیں جنہوں نے سارا عالم پیدا کیا ہے۔ لیکن سننے والوں نے ان سُنی کر دی۔ اللہ میاں نے ہر چند لوگوں سے پکار پکار کر کہا کہ "لوگو! میں اللہ ہوں، مجھے دیکھو! مجھے پہچانو!" لیکن کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ پھر اللہ میاں نے کہا "لوگو! میں حضرت مسیح کا باپ ہوں" اتنا سنتے ہی سب لوگ دوڑ پڑے اور اتنا مجمع ہو گیا کہ اللہ میاں کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر واقعات حضرت اکبر کی زندہ دلی، خوش مذاقی اور حاضر جوابی کے شاہد ہیں۔ وہ کہتے وہی تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا لیکن ایسے الفاظ میں کہ جس کے خلاف کہا جاتا، وہ برا نہ مانتا۔ ان کی بات کیا تھی، ایک پھلجھڑی سی چھٹتی تھی اور انہیں بھی لطف دے جاتی جن پر پھلجھڑی چھٹتی تھی۔

مذہب سے شیفتگی

حضرت اکبر کو خدا نے اسلام کے لئے دلِ دردمند عطا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں اعمالِ حسنہ دیکھنا چاہتے تھے۔ مذہب کے خلاف کسی قسم کی نکتہ چینی انہیں گوارا نہ تھی۔ مذہب سے شیفتگی، توحیدِ باری تعالےٰ، اطاعتِ رسول اور ذکرِ الٰہی ایسے جذبات ہیں جو ان کے کلام میں اس طرح جاری و ساری ہیں جس طرح خون جسمِ انسانی میں گردش کرتا ہے ؎

یہی وہ در ہے کہ ذلّت نہیں سوال کے بعد ؛ خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے اے اکبر

معلوم ہوا بس تری پہچان یہی ہے ؛ تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

جو سمجھ میں آ گیا، پھر وہ خدا کیونکر ہوا؟ ؛ ذہن میں جو گھر گیا، لا انتہا کیونکر ہوا؟

خالی ملے جو ذکرِ خدا و رسولؐ سے ؛ ہرگز اُس انجمن کو نہ سمجھو ممدِ قوم

قلزم کی تہ ٹٹولو یا اِبرِ شب میں جھولو ۔ جب بھی، یہی کہوں گا، اللہ کو نہ بھولو

تاہم حضرتِ اکبر کے نزدیک مذہب محض "رسمیات" تک محدود نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی تہذیب کی تمام اعلیٰ خصوصیات برقرار رکھتے ہوئے نئی تہذیب کی اچھائیاں اپنے اندر جذب کرلیں تو ٹھیک ہے، ورنہ کچھ نہیں ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔ تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

انہوں نے قدامت پسند ہوتے ہوئے خود انگریزی ملازمت اختیار کی اور ایک اونچے عہدے پر پہنچے۔ اپنے بیٹے سید عشرت حسین کو انگریزی تعلیم دلائی بلکہ ولایت بھی بھیجا مگر ان کی روح ہمیشہ مسلمان رہی یہی بات وہ مسلمانوں میں عام طور پر دیکھنا چاہتے تھے ؎

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو ۔ جائز ہے غباروں پہ اُڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد ۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اور قصہ کوتاہ یہ کہ ؎

گو اپنے ساتھ آپ کا "بُرا" نہ لے گیا ۔ اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

کلامِ اکبر کی اشاعت

حضرتِ اکبر کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۰ء میں "کلیاتِ اکبر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سر شیخ عبدالقادر کے مطبع مخزن کی طرف سے ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ جو غزلیں اور نظمیں پہلے مجموعہ میں شائع ہونے سے رہ گئی تھیں یا بعد میں کہی گئی تھیں، ۱۹۱۲ء میں کلیاتِ اکبر حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئیں۔

کلامِ اکبر کی یہ اشاعت بڑی حد تک اُن کے بڑے بیٹے سید عشرت حسین کی مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت تھی۔ وہ کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے مذاقِ ادب اپنے گرامی قدر والد سے ورثہ میں پایا تھا۔ ان کا سفرِ انگلستان اکبر کی بہت سی دلچسپ نظموں کا موضوع ہے۔

حضرتِ اکبر کے کلام کو ان کی زندگی ہی میں قبولیتِ عام ہو چکی تھی۔ کلیات کے حصہ اول و دوم کے پہلے ایڈیشن اُن کے سامنے چھپے، چھپ کر ختم ہوئے اور پھر دوبارہ چھپے ایک طویل عرصہ تک نایاب رہنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں کلیاتِ اکبر کی اشاعت بزمِ اکبر کراچی کے حسنِ انتظام سے عمل میں آئی تھی اور اس لحاظ سے غنیمت تھی کہ بزمِ اکبر نے "کلیاتِ اکبر" سے گمرہائے نایاب کو مشتاقانِ کلامِ اکبر کے دامن میں ڈال دیا تھا، لیکن اب بزمِ اکبر کے شائع کردہ کلیات بھی ایک عرصے سے نایاب ہیں۔

اسے دلدادگانِ کلامِ اکبرؔ کی خوش قسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ محترم و مکرم شیخ نیاز احمد صاحب نے اپنی روشن کتابوں کے جریدی سلسلے میں کلیاتِ اکبر کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اسی حسنِ اہتمام کا کرشمہ ہے کہ کلیاتِ اکبر ایک بار پھر سے مشتاقانِ کلامِ اکبر کی بزمِ ناز میں جلوہ گر ہے۔

اس سلسلے میں راقم السطور کو جس سب سے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، وہ یہ تھی کہ گزشتہ مطبوعہ کلیات (بشمول کلیات شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی) میں بے شمار اغلاط تھیں ان اغلاط کی درستی "ہفت خوانِ رستم" طے کرنے سے کم نہ تھی اور اس کے لئے مختلف حلقوں سے رجوع کرنے کے علاوہ مجھے بڑی حد تک اس اصول پر تکیہ کرنا پڑا ہے جسے اُردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی نے "داخلی شہادت کا اصول" قرار دیا ہے۔ گو اب بھی اغلاط کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن آنا لیقین سے کہا جا سکتا ہے کہ قارئین سابقہ مطبوعہ کلیات کے مقابلے میں اسے صحت کے زیادہ قریب پائیں گے۔

جیسے کہ اُوپر عرض کیا جا چکا ہے، کلامِ اکبر میں انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ایسے تمام انگریزی الفاظ کی اِملا بحروفِ انگریزی اور حسبِ ضرورت ان کے معانی بھی دے دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں اِملا میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں تاکہ قارئین کو اِملا کے قدیم اسلوب سے اُلجھن محسوس نہ ہو اور وہ کلام سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہو سکیں۔

میرے والدِ گرامی قدر **الحاج چودھری شاہ نواز خاں مرحوم** (اللہ تعالےٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے) حضرتِ اکبرؔ کے بڑے مداح اور اُن کے کلام کے شروع ہی سے دلدادہ تھے۔ اُنہی کے شوق کی بدولت مجھے اوائل عمر ہی میں کلامِ اکبر سے متعارف ہونے کی سعادت نصیب ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ تعارف شیفتگی کا رنگ اختیار کرتا گیا۔۔۔۔ میں اپنی یہ حقیر سی کاوش انہی کے نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں کہ یہ حقیقتاً انہی کا فیض ہے۔

محمد یونس حسرت ایم اے
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج، سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دورِ اوّل

(۱۸۶۲ — ۱۸۶۳ء)

سترہ اور اٹھارہ سال عمر کی غزلیں

(۱)

چشمِ عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتاب و اشک
آپ یوں دیکھیں تماشہ جان کر سیماب و اشک

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اُسے کرتے خراب
جانتے یکساں اگر ہم گوہرِ نایاب و اشک

(۲)

جانبِ زنجیرِ گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دل
دیکھیے اب میرے سر پہ کیا بلا لاتا ہے دل

لوگ کیوں کر چھوڑ دیتے ہیں محبت دفعتاً
میں تو جب یہ قصد کرتا ہوں مچل جاتا ہے دل

رکھ کے تصویرِ خیالِ یار کی پیشِ نظر
رات بھر مجھ کو شبِ فرقت میں تڑپاتا ہے دل

داغ ہائے سینہ گل ہیں، آہِ سرد اپنی نسیم
گلشنِ ہستی میں کیا اچھی ہوا کھاتا ہے دل

بارگاہِ عشق کہیئے تیرے دولت خانہ کو
جو کوئی آتا ہے یاں تجھ سے لگا جاتا ہے دل

خوف کے پردے میں چھپ جاتی ہے جانِ ناتواں
عاشقی کے معرکہ میں کام آ جاتا ہے دل

ساتھ ساتھ اپنے جنازے کے یہ چلّاتی تھی روح
ان کو مٹی میں ملانے کے لیے جاتا ہے دل

شیخ اگر کعبہ میں خوش ہے برہمن بُت خانہ میں
اپنے اپنے طور پر ہر شخص بہلاتا ہے دل

قصد کرتا ہوں جو اُٹھنے کا تو فرماتے ہیں وہ (ق)
اور بیٹھو دو گھڑی صاحب کہ گھبراتا ہے دل

یہ نہیں کہتے یہیں رہ جاؤ اب تم رات کو
بس انہیں باتوں سے اکبرؔ میرا جل جاتا ہے دل

(۳)

لکھتے ہیں کلکِ تصوّر سے ترے نام کو ہم
کام میں لاتے ہیں لوحِ دلِ ناکام کو ہم

بادہ نوشی میں بسر کرتے ہیں ایّام کو ہم
خطِ تقدیر سمجھتے ہیں خطِ جام کو ہم

شکل اس شوخ کی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے
آنکھیں دکھلاتے ہیں اب گردشِ ایّام کو ہم

نظر آتی ہے جو گلزار میں پھولوں کی بہار
یاد کرتے ہیں حسینانِ گل اندام کو ہم

آبِ حیواں کا اثر بادۂ گلرنگ میں ہے
لبِ جاں بخش سمجھتے ہیں لبِ جام کو ہم

گردشِ چشمِ حسیناں کا نہ کہیئے احوال
جانتے ہیں اثرِ گردشِ ایّام کو ہم

ایک دن تم کو لبِ گور سے سُنوا دیں گے
کہہ نہیں سکتے ابھی عشق کے انجام کو ہم

رہتی ہے کارِ دو عالم سے ہمیں وحشت سی
نہیں معلوم یہاں آئے ہیں کس کام کو ہم

رہ چکے ہیں جو کبھی فصلِ بہاری میں اسیر
کانپ کانپ اٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں دام کو ہم

(۴)

اجل سے وہ ڈریں جینے کو جو اچھا سمجھتے ہیں
یہاں ہم چار دن کی زندگی کو کیا سمجھتے ہیں

ہمیں ہے خاکساری میں بھی ڈر مغرور ہونے کا
اُسے بھی ہم غبارِ خاطرِ اعدا سمجھتے ہیں

کوئی کیا سمجھے الطافِ خفی انکارِ جاناں کے
یہ رمزِ لن ترانی حضرتِ موسیٰؑ سمجھتے ہیں

تمھاری ناخوشی کا ڈر ہمیں مجبور رکھتا ہے
نہیں تو اے صنم اغیار کو ہم کیا سمجھتے ہیں

یقیں کفار کو آتا نہیں روزِ قیامت کا
اُسے بھی وہ تمھارا وعدۂ فردا سمجھتے ہیں

جنوں زائل ہوا، ہوش آ گیا، صحت ہوئی ہم کو
بڑے عیّار ہو تم، اب تو ہم اتنا سمجھتے ہیں

کسی ناکس سے کیوں سرگوشیاں کرتے ہو محفل میں
خبر بھی ہے کہ لوگ اپنے دلوں میں کیا سمجھتے ہیں

ہے سرسبز گلشن ان کی بزمِ عیش و عشرت کا
نکل جاؤں گا میں، مجھ کو اگر کانٹا سمجھتے ہیں

نگاہوں کے اشارے سے جو حکم اٹھنے کا ہوتا ہے
مجھے بھی آپ کیا دردِ دلِ شیدا سمجھتے ہیں

میں اپنے نقدِ دل سے جنسِ اُلفت مول لیتا ہوں
اطبّا کو ذرا دیکھو، اسے سودا سمجھتے ہیں

اُسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغولِ حق رکھے
خدا سے جو کرے غافل، اسے دنیا سمجھتے ہیں

نثار اپنے تصوّر کے کہ جس کے فیض سے ہر دم
جو ناپیدا ہے نظروں سے، اُسے پیدا سمجھتے ہیں

وہ ہم کو کچھ نہ سمجھیں اے رقیبو، اختیار اُن کا
یہ تم کیوں خوش ہوا تنے وہ تمھیں کو کیا سمجھتے ہیں

یہی رُخ ہے کہ جس پر پھول کا اطلاق ہوتا ہے
یہی آنکھیں ہیں جن کو نرگسِ شہلا سمجھتے ہیں

تو وہ برقِ تجلّی ہے کہ تیرے دیکھنے والے
ترے نقشِ کفِ پا کو یدِ بیضا سمجھتے ہیں

غزل اک اور پڑھیئے آج ایسے رنگ میں اکبرؔ
کہ اربابِ بصیرت جس کو عبرت زا سمجھتے ہیں

(۵)

جو اپنی زندگانی کو حبابِ آسا سمجھتے ہیں
نفس کی موج کو موجِ لبِ دریا سمجھتے ہیں

گواہی دیں گے روزِ حشر یہ سارے گناہوں کی
سمجھتا میں نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں

شریکِ حال دنیا میں نظر آتا نہیں کوئی
فقط اک بےکسی ہے جس کو ہم اپنا سمجھتے ہیں

جو ہیں اہلِ بصیرت اس تماشہ گاہِ ہستی میں
طلسمِ زندگی کو کھیل لڑکوں کا سمجھتے ہیں

معرّا ہوں ہنر سے میں، سراپا عیب ہوں اکبرؔ
عنایت ہے احبّا کی اگر اچھا سمجھتے ہیں

(۶)

شوقِ نظارہ کبھی دل سے نکلتا ہی نہیں
جی ہمارا ہے ترے دیکھے بہلتا ہی نہیں

چین سے ہو بیٹھنا کیوں کر نصیب اے ہم نشیں
جوششِ وحشت سے مزاج اپنا سنبھلتا ہی نہیں

وصل کے ایّام میں کیا کیا دکھائے انقلاب
ہجر میں رنگِ فلک اب تو بدلتا ہی نہیں

کس غضب کا ہے معاذ اللہ طولِ روزِ ہجر
حشر مجھ پہ ہو گیا لیکن یہ ڈھلتا ہی نہیں

ہر قدم پر دل پڑے ہیں حسرتِ پامال میں
اب زمیں پہ پاؤں رکھ کر یار چلتا ہی نہیں

چند روز آیا تھا میری قبر پہ وہ شعلہ رُو
اب تو مدّت سے چراغِ گور جلتا ہی نہیں

ہم نے چاہا تھا نہ ہو لیکن ہوئی صبحِ فراق
موت کا جب وقت آ جاتا ہے ٹلتا ہی نہیں

بوسہ کیسا گالی دینے میں بھی اُن کو بخل ہے
اِن لبوں سے کام اپنا کچھ نکلتا ہی نہیں

صورتِ پروانہ جل کر خاک بھی میں ہو گیا
دل ترا اے شمع رُو لیکن پگھلتا ہی نہیں

نخلِ حسرت وہ ہوں میں جس کو ہیں یکساں چار فصل
وہ شجر ہوں باغِ عالم میں جو پھلتا ہی نہیں

وہ تمنّا ہوں جو رہتی ہے ہمیشہ جی کے ساتھ
حوصلہ وہ ہوں جو دنیا میں نکلتا ہی نہیں

رنگ وہ ہوں جو زمانے کے ہے باہر رنگ سے
وہ زمانہ ہوں جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں

شوق وہ ہوں وسعتِ دل جس کے آگے تنگ ہے
حرفِ مطلب وہ ہوں جو دل سے نکلتا ہی نہیں

نقدِ سودا وہ ہوں جو رائج نہیں بازار میں
سکّۂ داغِ جنوں وہ ہوں جو چلتا ہی نہیں

(۷)

(۱۸۶۴ — ۱۸۶۵ء)

اُنیس اور بیس سال عمر کی غزلیں

سُنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی
یاد آتی ہے بلبل مجھے تقریر کسی کی

(۸)

بے تکلف بوسۂ زُلفِ چلیپا لیجیے
نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجیے

لہ صرف مصرعۂ اوّل حضرت اکبرؔ کا ہے، ۲۰ سال کے تھے جب امتحان لیا گیا تھا۔

دل تو سینے سے ٹپکنے کو ہے اب جان کو تیار ہیں آپ
اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار، اچھا لیجیے

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو
وحشتِ دل کا ہے ایما راہِ صحرا لیجیے

غیر کو تو کر کے ضد کرتے ہیں کھانے میں شریک
مجھ سے کہتے ہیں، اگر کچھ بھوک ہو کھا لیجیے

خوشنما چیزیں ہیں بازارِ جہاں میں بے شمار
ایک نقدِ دل سے یارب مول کیا کیا لیجیے

کشتۂ آخر آتشِ فرقت سے ہونا ہے مجھے
اور چندے صورتِ سیماب تڑپا لیجیے

فصلِ گل کے آتے ہی اکبرؔ ہوئے بیہوش آپ
کھولیے آنکھوں کو صاحب جامِ صہبا لیجیے

(۹)

تصور سے غمِ فرقت کے اپنا جی دہلتا ہے
کریم بخت آخر سینے سے دم مرے کے نکلتا ہے

خدا کی شان وہ میرا تڑپنا دل لگی سمجھیں
کسی کی جان جاتی ہے، کسی کا جی بہلتا ہے

خیالِ زلف میں لے دل نہ طے کر منزلِ اُلفت
اندھیری رات میں نادان کوئی راہ چلتا ہے

وہ جوں جوں ہوتے ہیں ہشیار بڑھتی ہے مری وحشت
سنبھالیں ہوش وہ اپنا، یہاں دل کب سنبھلتا ہے

مریضِ غم کیا کرتا ہے ضبطِ نالہ ہمت سے
مگر منہ زرد ہو جاتا ہے جب کروٹ بدلتا ہے

وصالِ یار کا وعدہ ہے کل اور آج موت آئی
کریں کیا اب، مقدر پر کسی کا زور چلتا ہے

محبت ان سے کر کے پھنس گئے ہیں ہم تو آفت میں
نہ دل قابو میں آتا ہے نہ اُن پر زور چلتا ہے

کیا کرتا ہوں موزوں وصف ان کے روئے روشن کا
مرا ہر شعر اکبرؔ نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

(۱۰)

شاعری رنگِ طبیعت کا دکھا دیتی ہے
بوئے گل راہِ گلستاں کی بتا دیتی ہے

سیرِ غربت کوئی جلسہ جو دکھا دیتی ہے
یادِ احبابِ وطن مجھ کو رُلا دیتی ہے

بےخودی پردۂ کثرت جو اُٹھا دیتی ہے
ہر طرف جلوۂ توحید دکھا دیتی ہے

آمدِ یاس یہ ہو قہرِ خدا کا نازل
رہروِ منزلِ اُلفت کو ڈرا دیتی ہے

ہو نہ رنگین طبیعت بھی کسی کی یارب
آدمی کو یہ مصیبت میں پھنسا دیتی ہے

نگہِ لطف تری بادِ بہاری ہے مگر
غنچۂ خاطرِ عاشق کو کھلا دیتی ہے

اچھی صورت میں بھی خالق نے بھرا ہے جادو
اپنے مشتاق کو دیوانہ بنا دیتی ہے

پوچھتا ہوں میں جو عبرت سے مآلِ ہستی
راستہ گورِ غریباں کا بتا دیتی ہے

نظر آتا جو نہیں نزع میں بالیں پہ کوئی
بےکسی اُن کے تغافل کو دعا دیتی ہے

کیا صفائی رُخِ جاناں کی ہے اللہ اللہ
دیکھنے والوں کو آئینہ بنا دیتی ہے

دشمنِ اہلِ نظر ہے نگہِ حسن پرست
الفتِ پاک کو بھی عیب لگا دیتی ہے

موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے
الجھے دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے

بدسلوکی تری لاتی ہے جو حسرت ابھی مجھ پہ
میری تقدیر کو الزام لگا دیتی ہے

نگہِ شوق سے کیوں کر نہ گلوں کو دیکھوں
ان کی رنگت ترے عارض کا پتہ دیتی ہے

قیدِ ہستی ہے غبارِ رُخِ آئینۂ روح
جانِ مشتاق کو جاناں سے چھڑا دیتی ہے

کشتہ ہوں مرگِ حسیناں کی میں بےدردی کا
خاک میں چاند سی صورت کو ملا دیتی ہے

فکرِ اکبرؔ گلِ مضموں کا دکھا کر جلوہ
محفلِ شعر میں رنگ اپنا جما دیتی ہے

(۱۱)

زیرِ گیسو روئے روشن جلوہ گر دیکھا کیے
شانِ حق ہے ایک جا شام و سحر دیکھا کیے

گل کو خنداں، بلبلوں کو نوحہ گر دیکھا کیے
باغِ عالم کی دورنگی عمر بھر دیکھا کیے

جنبشِ ابرو ہی کافی تھی ہمارے قتل کو
آپ تو ناحق سوئے تیغ و تبر دیکھا کیے

صبر کر بیٹھے تھے پہلے ہی سے ہم تو جانِ زار
عشق نے جو کچھ دکھایا بےخطر دیکھا کیے

دیکھیے اب کیا دکھائے قسمتِ بد بعدِ مرگ
رنج و اندوہ و الم تو عمر بھر دیکھا کیے

خوابِ غفلت سے نہ چونکے اہلِ عالم، ہے غضب
گو بہت نیرنگیٔ شام و سحر دیکھا کیے

وعدۂ شب پر گمانِ صدق سے سوئے نہ ہم
راہ اس پیماں شکن کی رات بھر دیکھا کیے

یاد میں رخسارِ تاباںِ صنم کی رات بھر
دیدۂ حسرت سے ہم سوئے قمر دیکھا کیے

(۱۲)

پیدا وہ جفا کے جو نئے ڈھنگ کریں گے
تیغِ نگہ ناز سے پُر رنگ کریں گے

کافی ہیں وہ مستانہ نگاہیں، وہ خطِ سبز
اب ہم نہ کبھی شوقِ مے و بنگ کریں گے

ان کے دہنِ تنگ کا مضموں نہیں بندھتا
اب قافیۂ شعر کو ہم تنگ کریں گے

کرے گا جگہ مثلِ شرر جذبۂ الفت
وہ سخت جو دل کو صفتِ سنگ کریں گے

دمسازوں سے ملنے بھی تو پائیں کبھی اے چرخ
آراستہ پھر بزم نے و چنگ کریں گے

نالے دلِ پُر داغ کو سکھلائیں گے موزوں
طاؤس کو ہم مرغِ خوش آہنگ کریں گے

کچھ زمزمہ سنجی ہی پہ موقوف نہیں لطف
نالے بھی کریں گے تو خوش آہنگ کریں گے

ان سے تو کوئی صلح کی صورت نہیں بنتی
غیروں ہی سے دل کھول کے اب جنگ کریں گے

میلے ہیں حسینوں کے پری زادوں کے جمگھٹ
اب جا کے قیام اپنا لبِ گنگ کریں گے

راضی ہی نہ ہوں گے وہ کسی طور تو کیا بس
تقدیر سے پھر کہیے تو کیا جنگ کریں گے

ارشاد جو ہوتا ہے کہ لکھو وصفِ دہن کچھ
معلوم ہوا آپ مجھے تنگ کریں گے

رنگینیٔ مضموں جو دلِ صاف میں ہوگی
شیشہ میں گماں ان سے گل رنگ کریں گے

اکبرؔ نہ ہو دمسازِ بتاں بہرِ خدا تم
دل دو گے تو وہ جان کا آہنگ کریں گے

(۱۳)

جب عشق کے نشہ میں چُور ہوئے کیونکر کہیں نیک انجام ہے
مستوں کی طرح گلیوں میں پھرتے رندی میں کیا بدنام ہے

اب ہم تو خدا کی عنایت سے اے عہد شکن آزاد ہوئے
پھنس جائیں گے بتوں کے طائرِ دل زلفوں کا مسلسل دام ہے

لکھا جو تھا قسمت میں لکھا تدبیروں سے کچھ حاصل نہ ہوا
ناموں کی ہوئی تحریر بہت اک مدت تک پیغام ہے

(۱۴)

منہ ترا دیکھ کے فق رنگِ گلستاں ہو جائے
دیکھ کر زلف کو سنبل بھی پریشاں ہو جائے

یادِ قامت میں جو میں نالہ و فریاد کروں
پیشتر حشر سے یاں حشر کا ساماں ہو جائے

جلوۂ مصحفِ رخسار جو آ جائے نظر
حسرت ایسی میں کافر بھی مسلماں ہو جائے

آپ کے فیضِ قدم سے ہو بیاباں گلزار
باغ میں جائیے تو گلشنِ رضواں ہو جائے

ناز و انداز و ادا سے جو چلیں چال حضور
جس جگہ پاؤں پڑے گنجِ شہیداں ہو جائے

آفتِ گردشِ افلاک سے پاؤں جو نجات
گردشِ چشم مجھے گردشِ دوراں ہو جائے

آپ دکھلائیں جو اپنے رخِ رنگیں کی بہار
بو کے مانند ہوا رنگِ گلستاں ہو جائے

لاغر اس درجہ ہوا ہوں کہ جو لیٹوں میں کبھی
تارِ بستر مجھے وسعت میں بیاباں ہو جائے

حسرتیں اس میں ہوا کرتی ہیں اکثر مدفوں
کیا عجب خانۂ دل گورِ غریباں ہو جائے

(۱۵)

شباب جوش پہ ہے ولولے ہیں جوبن کے
کبھی وہ جھوم کے چلتے ہیں اور کبھی تن کے

جب اُن کو رحم کچھ آیا، حیا نے سمجھایا
بگڑ بگڑ گئی تقدیر میری بن بن کے

مریضِ غم کو ڈرایا کرے نہ پھر اتنا
قضا جو دیکھ لے تیور تمہاری چتون کے

نگاہِ ناز سے سارا زمانہ بسمل ہے
ہمیں شہید نہیں تیری کافر بھی چتون کے

کمر پہ یار کی رہتا ہے قبضۂ خنجر
شہید ہم تو ہوئے رشکِ بختِ آہن کے

(۱۶)

ان دنوں یار کے کچھ ذہن نشین اور بھی ہے
جانتا ہے کہ نشست ان کی کہیں اور بھی ہے

ایک دل تھا سو دیا اور کہاں سے لاؤں — جھوٹ کہیے تو میں کہہ دوں کہ نہیں اور بھی ہے
ناز بے جا نہ کیا کیجیے ہم سے اتنا — اسی انداز کا اِک یارِ حسیں اور بھی ہے
غمِ فرقت میں بھی آتی نہیں اے چرخ جو موت — کیا کوئی صدمہ پئے جانِ حزیں اور بھی ہے
کہیو اس غیرتِ لیلےٰ سے یہ پیغامِ صبا — پہلوئے قیس میں اِک دشت نشیں اور بھی ہے
جان دینا جو ہو لازم ہے اسے دم دینا — تمہیں بتلا دو یہ دستور کہیں اور بھی ہے
میرے بہلانے کا احسان جتاؤ نہ بہت — مہرباں ایک بُتِ پردہ نشیں اور بھی ہے
اِن ردیفوں میں غزل کیوں نہ ہو دشوار اکبرؔ — ناتراشیدہ کوئی ایسی زمیں اور بھی ہے؟

(۱۷)

اے خوفِ مرگ دل میں جو انساں کے تو رہے — پھر کچھ ہوس رہے نہ کوئی آرزو رہے
فتنہ رہے، فساد رہے، گفتگو رہے — منظور سب مجھے، جو مرے گھر میں تو رہے
زلفیں ہٹائی چہرۂ رنگیں سے کیا ضرور — بہتر ہے مشک کی گلِ عارض میں بُو رہے
ہنگامِ نزعِ رُوح نے قالب سے یہ کہا (ق) — اِس خاکدانِ تیرہ میں سب آبرو رہے
اب تک ترے سبب سے رہے ہم بلا نصیب — اب تا بہ حشر گور کے پہلو میں تو رہے
یہ اشکِ انفعال نہ خالی اثر سے ہوں — یا رب ہمارے موتیوں کی آبرو رہے
بُلبُل رہا ہے طائرِ دل اس میں عمر بھر — سر سبز حشر تک چمنِ آرزو رہے
اے چشم عینِ بزم میں رونا نہیں ہے خوب — وُہ بات کر کہ جس میں تیری آبرو رہے
پیرِ مغاں کا سلسلہ دیکھے جو محتسب — امیدوارِ بیعتِ دستِ سبو رہے
ہر دم یہ انتظار کا ایما ہے قبر میں — آنکھوں میں جائے اشکِ جگر کا لہو رہے
احباب کیا کریں گے ٹھہر کر مزار پر — بالیں پہ خاک اُڑانے کو ناں آرزو رہے
خاطر تو ہم نے آج بہت کی مگر حضور — کل پھر یہی نگاہ یہی گفتگو رہے

(۱۸)

ہر چند دل سے یار کے جاتا نہیں غبار — رونے سے عاشقوں میں مری آبرو تو ہے
ہوں میں تو رند مجھ کو تکلف سے کام کیا — پیمانہ ساقیا جو نہیں ہے سبُو تو ہے
ہر چند میں غریب ہوں گو کچھ نہیں ہے پاس — لیکن ہزار دولتوں سے بڑھ کے تُو تو ہے
ہم خوش رہیں بھلا دلِ نالاں سے کس طرح — جو آپ کا ہے دوست، ہمارا عدو تو ہے
زندہ جو تیرے ہجر میں ہوں میں تو کیا عجب — گو تُو نہیں ہے پاس تری آرزو تو ہے
مجھ کو تو دیکھ لینے سے مطلب ہے ناصحا — بدخُو اگر ہے یار تو ہو، خوب رُو تو ہے

(۱۹)

جذبۂ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہے — گھنگروؤں کی جانبِ در کچھ صدا آئی تو ہے
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے — پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے
آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں — بے تکلف آئیے کمرہ میں تنہائی تو ہے
سب کہا میں نے تڑپتا ہے بہت اب دل مرا — ہنس کے فرمایا تڑپتا ہو گا سودائی تو ہے
دیکھئے ہوتی ہے کب راہی سُوئے مُلکِ عدم — خانۂ تن سے ہماری رُوح گھبرائی تو ہے
دل دھڑکتا ہے مرا، لُوں بوسۂ رُخ یا نہ لُوں — نیند میں اس نے دُلائی منہ سے سرکائی تو ہے
دیکھئے کب تک نہیں آتی گلِ عارض کی یاد — دل کو وحشت ہو تو ہو، کم بخت سودائی تو ہے
میں بلا میں کیوں پھنسوں دیوانہ بن کر اس کے ساتھ — سیرِ گلشن سے طبیعت ہم نے بہلائی تو ہے
خاک میں دل کو ملایا جلوۂ رفتار سے — کیوں نہ ہو اے نوجواں اک شانِ رعنائی تو ہے
یُوں مروّت سے تمہارے سامنے چُپ ہو رہیں — کل کے جلسوں کی مگر ہم نے خبر پائی تو ہے
بادۂ گل رنگ کا ساغر عنایت کر مجھے — ساقیا تاخیر کیا ہے اب گھٹا چھائی تو ہے

جس کی اُلفت پر بڑا دعویٰ تھا کل اکبرؔ تمہیں — آج ہم جا کر اُسے دیکھ آئے، ہرجائی تو ہے

(۲۰)

کیا ہی رہ رہ کے طبیعت مری گھبراتی ہے — موت آتی ہے شبِ ہجر نہ نیند آتی ہے
وہ بھی چُپ بیٹھے ہیں، اغیار بھی چُپ، میں بھی خموش — ایسی صحبت سے طبیعت مری گھبراتی ہے
کیوں نہ ہو اپنی لگاوٹ کی نظر پہ نازاں — جانتے ہو کہ دلوں کو یہ لگا لاتی ہے
بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں — کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

۱۸۶۶ء

اکیس سال عمر کی غزلیں

[یہ پہلی غزل ہے جو مشاعرے میں پڑھی گئی اور پبلک نے حضرت اکبرؔ کا نوٹس لیا]

(۲۱)

سمجھے وہی اس کو جو ہو دیوانہ کسی کا — اکبرؔ یہ غزل میری ہے افسانہ کسی کا
دکھلاتے ہیں بُت جلوۂ مستانہ کسی کا — یاں کعبۂ مقصود ہے بُت خانہ کسی کا
گر شیخ و برہمن سُنیں افسانہ کسی کا — معبد نہ رہے کعبہ و بُت خانہ کسی کا
اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت — روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا
اس گوچہ سے ہے گبر و مسلماں کو عقیدت — کعبہ جو کسی کا ہے تو بُت خانہ کسی کا
اشک آنکھوں میں آ جائیں عوض نیند کے صاحب — ایسا بھی کسی شب سُنو افسانہ کسی کا
جاں اپنی جو دی شمع کے شعلہ سے لپٹ کر — سمجھا رُخِ روشن اُسے پروانہ کسی کا
شمعِ رُخِ روشن کا وُہ جلوہ تو دکھائیں — ہے حوصلہ بھی صورتِ پروانہ کسی کا
کیا برق کی شوخی مری آنکھوں میں سمائے — ہے پیشِ نظر جلوۂ مستانہ کسی کا
اُلفت مجھے اُس سے ہے اُسے غیر سے ہے عشق — میں شیفتہ اس کا ہوں وُہ دیوانہ کسی کا
حسرت نہیں آتی جو مرے دل میں نہ آئے — حسرت ہی سے آباد ہے ویرانہ کسی کا
حیراں ہوں اُسے تابِ جمال آئے گی کیوں کر — لے خود ہے جو دل حُسن ہی کے افسانہ کسی کا
پہنچی جو نگہ عالمِ مستی میں فلک پر — ہم سمجھے مہِ نو کو بھی پیمانہ کسی کا
کرتے نہیں دیتے جو بیاں حالتِ دل کو — سُن لے گا لبِ گور سے افسانہ کسی کا
سامانِ تکلف نظر آئیں گے جو ہر سُو — جنت میں بھی یاد آئے گا کاشانہ کسی کا
نالاں ہے اگر وُہ تو یہ ہے چاک گریباں — بُلبُل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا
چشم و دلِ عاشق کا نہ کچھ پوچھئے احوال — وُہ محو کسی کا ہے، یہ دیوانہ کسی کا
تاثیر جو کی صحبتِ عارض نے دمِ خواب — خجلت دہِ آئینہ ہوا شانہ کسی کا
کوئی نہ ہوا رُوح کا ساتھی دمِ آخر — کام آیا نہ اِس وقت میں یارانہ کسی کا
کچھ دُور نہیں ساقیِ کوثر کے کرم سے — بھر دے مئے وحدت سے جو پیمانہ کسی کا
رکھتا ہے قدم کوچۂ گیسو میں جو بے خوف — کیا تو دلِ صد چاک ہے اے شانہ کسی کا
تاثیرِ محبت سے جو ہو جاتے ہیں بے چین — رو دیتے ہیں اب سُن کے وہ افسانہ کسی کا
احباب نے پوچھا جو مرا حال تو بولے — سُنتے ہیں وہ اِن روزوں ہے دیوانہ کسی کا
دیکھا ہے عجب رنگ کچھ اس دورِ فلک میں (ق) — کوئی نہیں اے ساقی مے خانہ کسی کا
یاں شیشۂ دل خونِ تمنا سے ہے لبریز — واں بادۂ گلفام سے پیمانہ کسی کا
سب مست مئے شوق ہیں اِن آنکھوں نے دل — اس دور میں خالی نہیں پیمانہ کسی کا
بخشی ہے جبیں سائی کی در پر جو اجازت — واجب ہے مجھے سجدۂ شکرانہ کسی کا
اے حضرتِ ناصح نہ سُنے گا یہ تمہاری — میرا دلِ وحشی تو ہے دیوانہ کسی کا

کرتے وہ نگاہوں سے اگر بادہ فروشی
ہوتا نہ گذر جانبِ مے خانہ کسی کا

حسرت ہی رہی زلفوں کے نظارے کی مجھ کو
یہ پنجۂ مژگاں نہ بنا شانہ کسی کا

کس طرح ہوا مائل گیسو نہیں معلوم
پابند نہ تھا یہ دلِ دیوانہ کسی کا

ہم جان سے بیزار رہا کرتے ہیں اکبر
جب سے دلِ بے تاب ہے دیوانہ کسی کا

(۲۲)

اُلفت جو کیجئے تو غرض آشنا سے کیا
وعدہ جو کیجئے تو بُتِ بے وفا سے کیا

موسیٰؑ نے کوہِ طور پہ باتیں خدا سے کیں
رُتبہ بشر کا دیکھئے ہوتا ہے کیا سے کیا

مرتا ہوں جان جاتی ہے اب ہجر میں، مگر
اظہار اس کا کیجئے اس بے وفا سے کیا

لطفِ چمن ہے، بادۂ گلگوں ہے، یار ہے
اب موسمِ بہار میں مانگوں خدا سے کیا

قاتل نہیں کہیں گے جہاں میں، ہمیں شہید
اے یار اور ہوگا تمہاری جفا سے کیا

دارِ فنا سے لے نہ چلے کچھ تو غم نہیں
فرمائیے تو، لائے تھے ملکِ بقا سے کیا

تیرے مریضِ غم کو جو کوئی اثر نہیں
کچھ کہہ دیا ہے آ کے قضا نے دوا سے کیا

کیا کیا صفت لکھی تری زلفِ دراز کی
مضمون ہاتھ آئے ہیں فکرِ رسا سے کیا

لیتا ہے یاں غمِ شبِ ہجراں تو اپنی جان
اُمیدِ صبح دیتی ہے ہم کو دلاسے کیا

صد چاک مثلِ شانہ کرے عاشقوں کا دل
ہوگا بس اور آپ کی زلفِ دوتا سے کیا

دل میں جو ہے وہ ہوگا شبِ وصل میں ضرور
ہوگا حضور آپ کی شرم و حیا سے کیا

میں حالِ دل تمام شب ان سے کہا کیا
ہنگامِ صبح کہنے لگے کس ادا سے "کیا؟"

بہرِ نمودِ غیب گوارا ہوا ہے خوں
مضمون ہاتھ آیا ہے برگِ حنا سے کیا

(۲۳)

کس قدر جوشِ مسرت میں ہے سر پر سہرا
خود ہے خوشبو کی طرح جامہ سے باہر سہرا

مصرِ خوبی کا تو نوشاہ ہے مثلِ یوسف
سایۂ لطفِ خدا ہے ترے سر پر سہرا

عارض و خال کا تیرے ہے اُسے قرب نصیب
کس طرح سے نہ ہو رشکِ مہ و اختر سہرا

آج ہر گل کی تمنا ہے یہی گلشن میں
کہ ترے فرقِ مبارک پہ ہو آ کر سہرا

بے سبب تو نے سنبھالا نہیں ہاتھوں سے اُسے
غش ہے عارض کی صفائی پہ مقرر سہرا

نکہتِ گیسوئے مشکیں نے دکھایا جو اثر
ہو گیا اور بھی خوشبو سے معطر سہرا

روزِ روشن کا گماں کیوں شبِ عشرت پہ نہ ہو
عکسِ رخسار سے ہے مہرِ منور سہرا

گلشنِ حسن میں اللہ رے رسائی اس کی
ہو گیا سنبلِ گیسو کے برابر سہرا

زینتِ حسنِ خداداد جو شادی سے ہوئی
بن گیا چہرۂ پُرنور کا زیور سہرا

جلوۂ حسن کے نظارے کی لاتا نہیں تاب
اس لئے چہرہ سے ہٹ جاتا ہے اکثر سہرا

یہ طراوت عرقِ رُخ کی نہیں ہے اس میں
آب آئینۂ خورشید میں ہے تر سہرا

کہہ دیا ہم نے یہ اک دوست کی فرمائش سے
ورنہ واقف بھی نہیں کہتے ہیں کیونکر سہرا

۱۸۶۷ء

بائیس سال عمر کی غزلیں

(یہ دوسری غزل ہے جو حضرت اکبر نے مشاعرے میں پڑھی)

(۲۴)

مبارک مے کشو موسم پھر آیا بادہ خواری کا
چمن میں شور ہے پھر آمد فصلِ بہاری کا

نہایت اجتماعِ آتش و سیماب مشکل ہے
خیالِ رُخ میں کیوں کر حال لکھوں بیقراری کا

ہمارا غنچۂ خاطر شگفتہ کر نہیں سکتی
فقط کلیاں کھلانا کام ہے بادِ بہاری کا

چمن میں خندہ زن گل ہے تو مے خانہ میں پیمانہ
یہاں ہے فیضِ ساقی، واں کرم بادِ بہاری کا

مسخر کرتا ہوں پریوں کو میں جادو بیانی سے
حسینوں میں فسانہ ہے مری ذی اقتداری کا

ہوئی ہے الفتِ معبود میں دیوانگی مجھ کو
مُقِر کیوں کر نہ ایک عالم ہو میری ہوشیاری کا

(۲۵)

آپ سے آتے ہو کب عشاقِ مضطر کی طرف
جذبِ دل یہ تم کو لایا ہے مرے گھر کی طرف

پوچھتا ہے جب کوئی اُن سے کیسے ہے تم سے عشق
دیکھتے ہیں پیار سے شرما کے اکبر کی طرف

(۲۶)

انہیں نگاہ ہے اپنے جمال ہی کی طرف
نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

توجہ اپنی ہو کیا فنِ شاعری کی طرف
نظر ہر ایک کی جاتی ہے عیب ہی کی طرف

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

تمہارا سایہ بھی جو لوگ دیکھ لیتے ہیں
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے پری کی طرف

بلا میں پھنستا ہے دل، مفت جان جاتی ہے
خدا کسی کو نہ لے جائے اس گلی کی طرف

کبھی جو ہوتی ہے تکرار غیر سے ہم سے
تو دل سے ہوتے ہو درپردہ تم اُسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے اُن پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

نگاہ اُس بتِ خود بیں کی ہے مرے دل پر
نہ آئینہ کی طرف ہے، نہ آرسی کی طرف

قبول کیجئے للہ تحفۂ دل کو!
نظر نہ کیجئے اس کی شکستگی کی طرف

یہی نظر ہے جو اب قاتلِ زمانہ ہوئی
یہی نظر تھی کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

غریب خانہ میں للہ دو گھڑی بیٹھو
(ق) بہت دنوں میں تم آئے ہو اس گلی کی طرف

ذرا سی دیر ہی ہو جائے گی تو کیا ہوگا
گھڑی گھڑی نہ اٹھاؤ نظر گھڑی کی طرف

جو گھر میں پوچھے کوئی، خوف کیا ہے، کہہ دینا
چلے گئے تھے ٹہلتے ہوئے کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حسنِ بتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اُسی کی طرف

(۲۷)

یہ مصرع چاہیے لکھنا بیاضِ چشمِ وحدت میں
خدا کا عشق ہے عشقِ مجازی بھی حقیقت میں

بہ رنگِ حسن جو ہے جلوہ فرما اُن کی صورت میں
خمیرِ عشق بن کر ہے وہی میری طبیعت میں

اگر میں ڈوب جاؤں قلزمِ اشکِ ندامت میں
گناہوں کا سفینہ غرق ہو دریائے رحمت میں

بھریں گلہائے حسرت ہی سے دامانِ تمنا کو
جو آ نکلے ہیں بہرِ سیرِ گلزارِ محبت میں

لکھا خونِ جگر سے صفحۂ دل پر اسے اکبر
اثر ممکن نہیں پیدا نہ ہو نقشِ محبت میں

(۲۸)

گلے لگائیں کریں پیار تم کو عید کے دن
اِدھر تو آؤ مرے گلعذار عید کے دن

غضب کا حسن ہے آرائشیں قیامت کی
عیاں ہے قدرتِ پروردگار عید کے دن

سنبھل سکی نہ طبیعت کسی طرح میری
رہا نہ دل پہ مجھے اختیار عید کے دن

وہ سال بھر سے کدورت بھری جو تھی دل میں
وہ دور ہو گئی بس ایک بار عید کے دن

لگا لیا اُنہیں سینے سے جوشِ الفت میں
غرض کہ آ ہی گیا مجھ کو پیار عید کے دن

کہیں ہے نغمۂ بلبل، کہیں ہے خندۂ گل
عیاں ہے جوشِ شباب بہار عید کے دن

سوئیاں، دودھ، شکر، میوہ سب مہیا ہے
مگر یہ سب ہے مجھے ناگوار عید کے دن

ملے اگر لبِ شیریں کا تیرے اک بوسہ
تو لطف ہے مجھے البتہ یار عید کے دن

(۲۹)

مضمونِ سوزِ غم نہ ہو کیوں کر چراغ میں
پروانوں کے پرِ دل کا ہے دفتر چراغ میں

ہو لطفِ حسن و عشق نہ کیوں کر چراغ میں
ہے روشنی و سوز برابر چراغ میں

درگاہ جاتے والے ہیں غیروں کے ساتھ وہ
گھی جل رہا ہے آج تو گھر گھر چراغ میں

مژگاں کا عکس عارضِ روشن میں دیکھ لے
دیکھا نہ جس نے ہو کبھی خنجر چراغ میں

خورشیدِ رُخ نے تیر سے جو بے نور کر دیا
کیا روشنی تھی صورتِ اختر چراغ میں

اُس بُت کے دل کا اس دلِ روشن میں ہے خیال
ہے حُسنِ اتفاق سے پتھر چراغ میں

جلنا نصیب میں ہے تو ہو کچھ فسردہ غم ہی
بتّی کی جا رہے تنِ لاغر چراغ میں

پھیلی ہمارے سوزِ محبت کی داستاں
بتّی پڑی جو شام سے گھر گھر چراغ میں

رنگینی اُس کے عارضِ پُر نور میں نہیں
ہے جلوۂ بہارِ گلِ تر چراغ میں

داغِ گناہ سے دلِ مومن کو کیا ضرر
ہوتی سیاہی بھی تو ہے اکبر چراغ میں

(۳۰)

خودی بھی مجھ سے جب واقف نہ تھی میں تب سے بسمل ہوں
"ازل[۱] سے کشتۂ تیغِ نگاہِ نازِ قاتل ہوں"

دلا کیوں کر میں اس رخسارِ روشن کے مقابل ہوں
جسے خورشیدِ محشر دیکھ کر کہتا ہے "میں تِل ہوں"

خمِ گیسو پہ اک رشکِ پری کے دل سے مائل ہوں
مجھے بھی ان دنوں سودا ہے دیوانوں میں داخل ہوں

نہیں معلوم اس کو تیری چتون سے مقابل ہوں
مجھے واعظ سمجھتا ہے کہ میں مرنے سے غافل ہوں

نگاہِ ناز سے تم نے اگر دیکھا نہیں مجھ کو
تو پھر میں کیوں تڑپتا ہوں؟ نہ زخمی ہوں نہ بسمل ہوں

فغاں کیسی کہ حرفِ شکوہ بھی سب پہ نہ لائے گا
یہ جب تک تم نہ کہہ لو گے "وفا کا تیری قائل ہوں"

رہِ الفت وہ کوچہ ہے قضا بھی جس سے ڈرتی ہے
قدم رکھتا ہے دل اس میں، نثارِ ہمتِ دل ہوں

جو یوں ہی لحظہ لحظہ داغِ حسرت کی ترقی ہے
عجب کیا رفتہ رفتہ میں سراپا صورتِ دل ہوں

مدد اے رہنمائے گمرہاں، اس دشتِ غربت میں
مسافر ہوں، پریشاں حال ہوں، گم کردہ منزل ہوں

یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں

گلِ مقصد جسے سمجھا، وہ نکلا داغِ ناکامی!
غرض باغِ جہاں میں خوبیٔ قسمت کا قائل ہوں

اگر دعوائے یکرنگی کروں، ناخوش نہ ہو جانا
میں اس آئینہ خانہ میں ترا عکسِ مقابل ہوں

توقع رہتی ہے ہر دم کہ دم لینے کی مہلت ہے
معاذاللہ اپنی موت سے کس درجہ غافل ہوں

رسائی زلف نے پائی قدم تک، اب وہ کیوں آئیں
بہانہ خوب ہاتھ آیا کہ پابندِ سلاسل ہوں

خبر لیتے ہیں اس کی جس کو بیگانہ سمجھتے ہیں!
مجھے کب پوچھتے ہیں، یوں تو اک تحصیلِ حاصل ہوں

زمینِ شعر جس سے آسماں بن جائے اے اکبر
علوئے طبع سے ایسی غزل پڑھنے پہ مائل ہوں

(۳۱)

جو لذت آشنائے دردِ الفت ہے، میں وہ دل ہوں
اجل جس کو قیامت تک نہ آئے گی، وہ بسمل ہوں

نصیب ایسے کہاں جو زینتِ فتراکِ قاتل ہوں
جسے صیاد نے دیکھا نہیں، وہ مرغِ بسمل ہوں

پئے نظارہ جب سے عالمِ حیرت میں داخل ہوں
یہ محوِ روئے قاتل ہوں کہ شکلِ چشمِ بسمل ہوں

سنا کر وصفِ قاتل میں نے لاکھوں کو کیا بسمل
میں اس تعریف سے گویا زبانِ تیغِ قاتل ہوں

فضائے دہر ہے تنگ اپنی بے تابی کی وسعت سے
تڑپنے کی جگہ ملتی نہیں جس کو، وہ بسمل ہوں

فنا ہے ہستیٔ موہوم میری بے قراری میں
دلِ بیتاب کے ہاتھوں سے میں تسکینِ بسمل ہوں

خوشی میں رُوح جامے سے رہے گی حشر تک باہر
لپٹ کر جس سے قاتل رو رہا ہے، میں وہ بسمل ہوں

توسل چاہتا ہوں جس سے وہ دامن بچاتا ہے
یہ عالم قتل کا میدان ہے، میں خونِ بسمل ہوں

قضا کا وہم بھی جس جا نہ پہنچے گا قیامت تک
وہاں تیغِ نگاہِ نازِ قاتل سے میں بسمل ہوں

جو کی کچھ گفتگو پیرِ خرد نے راہِ الفت میں
کہا تقریر نے "خاموش میں گم کردہ منزل ہوں"

دکھایا بے خودی نے آئینہ جب میری ہستی کو
ہوا یہ صاف روشن وہ صنم حق ہے، میں باطل ہوں

عجب مضمون میں پیدا ہوا ہوں بیتِ ہستی میں
عبارت میں بہت آساں ہوں، معنیٰ میں مشکل ہوں

ثبوت اس کا مجھے بھی خود فراموشی سے یاد آیا
وہ دعویٰ کر رہے تھے شکلِ انساں کا میں حاصل ہوں

ازل میں روئے جاناں سے اشارہ تھا یہ مصحف کا
تمنا ہے کہ میں بھی تیری ہی صورت میں نازل ہوں

جو پوچھا نیستی ہستی میں کیوں کر فرق ظاہر ہو
کمرِ یار کی ایما کیا، میں حدِ فاصل ہوں

کرے اک قطرہ جس کا بے خبر شورِ دو عالم سے
اُسی جامِ شرابِ تند کا ساقی سے سائل ہوں

عیاں ہے رنگِ داغِ عشق میری خاکساری سے
گلستانِ محبت کا ہوں گُل، گو صورتِ گِل ہوں

عجب مجموعہ ہوں میں سرکشی اور خاکساری کا
جو شعلہ باد و آتش سے تو آب و خاک سے گِل ہوں

وہ داغِ آرزو ہوں جس سے دل دامن بچاتا ہے
کوئی پہلو نہیں ملتا جسے دنیا میں وہ دل ہوں

تصور وہ ہوں جو ہم رنگ ہے تصویرِ جاناں کا
خیالِ یار سے مل کر بنا ہے جو، میں وہ دل ہوں

جسے چشمِ تصور خواب میں بھی پا نہیں سکتی
سراپا چشم ہو کر میں اُسی محفل میں داخل ہوں

رہِ الفت میں آتی ہے یہی آواز دوزخ سے
کہ میں بھی اک شرارِ شعلۂ بے تابیٔ دل ہوں

صدائے صور سے شورِ قیامت کا یہ ایما ہے
کہ میں بے ساختہ اک نالۂ مستانۂ دل ہوں

وہ مجنوں ہوں کہ جس کی ہر نظر تصویرِ لیلیٰ ہے
حجابِ حسن اُٹھ جاتا ہے جس سے میں وہ محمل ہوں

اجل سے پوچھتا ہے ہر نفس جو باہر آتا ہے
اجازت ہو اگر تیری تو پھر سینہ میں داخل ہوں

کہاں اس بحر سے جائیں گے بچ کر گوہرِ مضموں
سخن دریا ہے طبعِ رسا ہے، میں بھی ساحل ہوں

غزل ایسی پڑھوں جس سے برابر یہ صدا نکلے
عروجِ فکرِ عالی ہوں نشانِ عشقِ کامل ہوں

(۳۲)

وفورِ شوقِ قاتل سے نثارِ ہمتِ دل ہوں
امیدِ جذبۂ دل سے مقیمِ کوئے قاتل ہوں

ہجومِ آہِ سوزاں سے، خیالِ روئے جاناں سے
فروغِ بزمِ ماتم ہوں، چراغِ خانۂ دل ہوں

حجابِ روئے قاتل سے، غمِ ناکامیٔ دل سے
نگاہِ چشمِ حسرت ہوں، شہیدِ نازِ قاتل ہوں

وفورِ شوقِ ماتم سے، صدائے نالۂ غم سے
شریکِ حالِ حسرت ہوں، شکستِ شیشۂ دل ہوں

ہوائے باغِ عالم سے، جفائے خنجرِ غم سے
لقائے رنگِ عشرت ہوں، دعائے موجِ بسمل ہوں

بلائے بادِ گیسو سے، خیالِ تیغِ ابرو سے
ظہورِ جوششِ سودا ہوں، گواہِ حالِ بسمل ہوں

خیالِ حسنِ صورت سے، ہجومِ دردِ الفت سے
ہمائے اوجِ معنی ہوں، نشانِ عشقِ کامل ہوں

ہوائے شعلۂ غم سے، جفائے چرخِ ظالم سے
چراغِ داغِ حسرت ہوں، گرفتارِ غمِ دل ہوں

نسیمِ صبحِ عشرت سے، فروغِ شوقِ دولت سے
ہجومِ خوابِ غفلت ہوں، چراغِ عمرِ غافل ہوں

لبِ پیمانۂ دل سے، وفورِ شوقِ کامل سے
مریضِ لذتِ غم ہوں، لبِ اظہارِ سائل ہوں

جفائے تیغِ فرقت سے، خیالِ رازِ الفت سے
زبانِ حالِ بسمل ہوں، سکوتِ شمعِ محفل ہوں

علوئے جوشِ مستی سے، صفائے طبعِ عالی سے
فدائے فکرِ اکبر ہوں، نثارِ شعرِ مشکل ہوں

درِ گنجینۂ اسرارِ معنی کھول دو اکبر
بس اب پیرِ خرد استاد کہتا ہے کہ جاہل ہوں

(۳۳)

کہیں دل ہوں، کہیں میں باعثِ بیتابیٔ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں، کہیں میں نازِ قاتل ہوں

کہیں تمکینِ خوبی ہوں، کہیں ہنگامۂ الفت
کہیں رنگِ رخِ گل ہوں، کہیں شورِ عنادل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا، کہیں ہوں شاہدِ معنیٰ
کہیں ہوں محملِ لیلیٰ، کہیں لیلائے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں، کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبورِ مطلق ہوں، کہیں مختارِ کامل ہوں

کہیں ہوں شوقِ آزادی، کہیں تدبیرِ پابندی
کہیں میں جوشِ سودا ہوں، کہیں طوقِ سلاسل ہوں

کہیں عمرِ دو روزہ ہوں، کہیں ہوں آرزو دل کی
کہیں گھٹنے کے لائق ہوں، کہیں بڑھنے کے قابل ہوں

کہیں جذبِ محبت ہوں، کہیں دردِ دلِ عاشق
کہیں دل مجھ میں داخل ہے، کہیں میں دل میں داخل ہوں

کہیں جوشِ اہلِ معنی کا، کہیں جوشِ اہلِ صورت کا
کہیں شورِ انا الحق ہوں، کہیں دعوائے باطل ہوں

کہیں ہوں حسن کا ایماں، کہیں ہوں درد کی لذت
کہیں قاتل کی چتون ہوں، کہیں چتون کا بسمل ہوں

[۱] مصرعِ طرح

کہیں ہوں صورتِ لیلیٰ، کہیں حالِ دلِ مجنوں
کہیں چھپنے کے لائق ہوں، کہیں کھلنے کے قابل ہوں

کہیں یاروں کی محفل میں، کہیں ہنگامۂ دل میں
کہیں میں رندِ مشرب ہوں، کہیں درویش کامل ہوں

کہیں تصویرِ حسرت ہوں، کہیں محوِ پریشانی
کہیں ہوں شیفتہ رخ کا، کہیں زلفوں کا مائل ہوں

معاون ہوں کسی جا میں، کہیں امداد کا طالب
کہیں خضرِ ہدایت ہوں، کہیں گم کردہ منزل ہوں

کہیں ہوں گوہرِ مقصد، کہیں دامن تمنا کا
کہیں ہمت کریموں کی، کہیں امیدِ سائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا، کہیں رکنے میں ساحل ہوں

نہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبرؔ
مگر ساکت ہوں جب تک آپ میں آنے کے قابل ہوں

(۳۴)

لگی ہے آگ الفت کی ہمارے رشتۂ جاں میں
جلا کرتے ہیں مثلِ شمع ہم بزمِ حسیناں میں

کروں گا جستجو مضموں کی وصفِ چشمِ جاناں میں
پھرے گی بن کے پتلی کی طرح چشمِ غزالاں میں

پروئے یار نے موتی جو اپنی زلفِ پیچاں میں
نظر آنے لگے شبنم کے قطرے سنبلستاں میں

کیا موزوں جو مطلع میں نے وصفِ روئے جاناں میں
نظر آنے لگا خورشیدِ تاباں برجِ میزاں میں

نزاکت سے جو فرشِ گل پہ سوتے تھے گلستاں میں
اب اُن کی خاک اُڑتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں

نہ کیوں کر وحشتِ دل پر گماں ہو شوقِ موسیٰؑ کا
تجلی وادیٔ ایمن کی ہے اپنے بیاباں میں

انہیں کی آنکھ سے ممکن ہے اُن کا دیکھنا اے دل
بنوں حیرت سے آئینہ نہ کیونکر بزمِ جاناں میں

غزالانِ ختن آ آکے مجھ پہ صدقے ہوتے ہیں
کبھی بیمار پڑتا ہوں جو یادِ چشمِ جاناں میں

خزاں میں کیوں نہ ہو سرسبز نخلِ ماتمِ بلبل
عوض پانی کے جب حسرت برستی ہو گلستاں میں

تری زلفِ مسلسل دیکھ کر ظاہر ہوا مجھ کو
یہی زنجیرِ پائے دل کی ہے ہستی کے زنداں میں

اگر زنجیرِ پا ہوتی نہ الفت تیری زلفوں کی
نہ رہتے ہم سے دیوانے کبھی ہستی کے زنداں میں

اثر بعدِ فنا بھی گردشِ قسمت کا باقی ہے
بگولا بن کے میری خاک اُڑتی ہے بیاباں میں

خیالِ ہجرِ یارانِ وطن سے جان جاتی ہے
غضب ہے ہوش آنا اے جنوں مجھ کو بیاباں میں

زبانِ حال سے کہتا ہے میرا سبزۂ تربت
نشاں حسرت کا ہے نشو و نما بھی اس گلستاں میں

اسی مصرع پہ میں تو فصلِ گل میں وجد کرتا ہوں
"تری قدرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں گلستاں میں"

خزاں آتی ہے بلبل دیکھ لے اچھی طرح گل کو
خدا جانے کب آئے موسمِ گل پھر گلستاں میں

سناتا ہوں جو افسانہ کسی کی بزمِ عشرت میں
نسیمِ نو بہاری رقص کرتی ہے گلستاں میں

کریں گے حشر میں ظاہر جو ہم مجبوریٔ الفت
ہمارا نامۂ اعمال ہوگا دستِ جاناں میں

سرِ خاکِ شہنشاہانِ عالم کہتی ہے عبرت
قدم رکھے بچا کر، آئے جو شہرِ خموشاں میں

(۳۵)

پئے تسلیم سر جھکتا تھا سب کا جن کے ایواں میں
انھیں کی خاک اب پامال ہے گورِ غریباں میں

پھرا کی شکلِ یارانِ گزشتہ، چشمِ گریاں میں
ہماری عمر روتے ہی کٹی گورِ عزیزاں میں

جمالِ حور کو کہتا ہے افزوں حسنِ انساں سے
کوئی عاشق بھی ان کا زاہدا ہے باغِ رضواں میں

جب آنا موت کا ممکن نہیں جنت میں اے واعظ
تو پھر کس کام کے حوروں کے غمزے باغِ رضواں میں

نہ پوچھو حال کچھ چاہت کا ان زہرہ جبینوں کی
فرشتوں کے بھی دل ڈوبے ہوتے چاہِ زنخداں میں

کسی کو ہوتی کیا پروا ہمارے جینے مرنے کی
بسانِ سبزۂ بیگانہ ہم تھے اس گلستاں میں

نہیں سروِ سہی کو باغ میں اندیشۂ صرصر
غرض ہے راستی بھی خوب شیوہ اس گلستاں میں

(۳۶)

ابھی تو موسمِ گل بھی نہ آیا تھا گلستاں میں
میں کیوں جامے سے باہر ہو گیا شوقِ بیاباں میں

نظر آتا نہیں جز آہ کوئی مونس و ہمدم
بدل جاتی ہے دنیا کی ہوا شب ہائے ہجراں میں

میں رونا جاؤں یارانِ وطن کو کیا بتا اپنا
خدا جانے مجھے لے جائے وحشت کس بیاباں میں

سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے جب فصلِ بہاری کا
گلوں کو یاد کر کے خوب روتا ہوں گلستاں میں

وہ جالیں پر بیٹھنا ضبط کیونکہ اُن سے رخصت ہوں
نہیں طاقت اشارے کی بھی مجھ دم بھر کے مہماں میں

مزا کیا جب حسینوں نے اطاعت کی حکومت سے
نہیں کچھ لطف پریاں تھیں جو تابع سلیماں میں

وفورِ اشک سے لیل ہیں ہرے داغِ جگر اپنے
چمن سرسبز ہو جاتا ہے جیسے فصلِ باراں میں

یقیں تھا گوہر آمرزگاری کے جو ملنے کا
دمِ آخر تلک ڈوبے رہے ہم بحرِ عصیاں میں

ہیں اپنے داغِ سینہ طعنہ زن خورشیدِ محشر پہ
تماشا حشر کا ہے کوچۂ چاکِ گریباں میں

یہ مجھ دیوانے کو اکثر صدا آتی ہے زنداں سے
کھلا ہے خانۂ زنجیر کا در شوقِ مہماں میں

عجب کیا موسمِ پیری میں اے دل ٹھنڈی سانس کا
ہوائے سرد اکثر چلتی ہے فصلِ زمستاں میں

بقولِ رند مہمانِ فلک میں بھی ہوں اے اکبرؔ
مری قسمت کا ٹکڑا بھی ہے اس کے خوانِ الواں میں

(۳۷)

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی
یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی

دوست احباب سے ہنس بول کے کٹ جائے گی رات
رند آزاد ہیں، ہم کو شبِ فرقت کیسی

جس حسیں سے ہوئی الفت وہی معشوق اپنا
عشق کس چیز کو کہتے ہیں، طبیعت کیسی

جس طرح ہو سکے دن زیست کے پورے کر لو
چار دن کے لیے انسان کو حسرت کیسی

ہے جو قسمت میں، وہی ہوگا نہ کچھ کم نہ سوا
آرزو کہتے ہیں کس چیز کو، حسرت کیسی

حال کھلتا نہیں کچھ دل کے دھڑکنے کا مجھے
آج رہ رہ کے بھر آتی ہے طبیعت کیسی

کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا
قیس آوارہ ہے جنگل میں، یہ وحشت کیسی

حسنِ اخلاق پہ جی لوٹ گیا ہے میرا
میں تو کشتہ تری باتوں کا ہوں، صورت کیسی

آپ بوسہ جو نہیں دیتے تو میں دل کیوں دوں
ایسی باتوں میں مری جان، مروت کیسی

ہم نہ کہتے تھے کہ زینت بھی ہے معشوق کو شرط
کیوں؟ نظر آتی ہے آئینہ میں صورت کیسی

(۳۸)

ملے ہر اک سے محبت مگر انہیں سے رہی   وہ عاشقانہ جو تھی اک نظر انہیں سے رہی
یہ کون بات پسند آ گئی ہے غیروں کی   لگاوٹ ان کی جو آٹھوں پہر انہیں سے رہی
چھٹو گے دامِ بلا سے کبھی نہ اے اکبر   طبیعت الجھی ہوئی یوں اگر انہیں سے رہی

(۳۹)

(۱۸۶۸ء)

۲۳ سال عمر کی غزل

جلوۂ رفتارِ جاناں ہے نمونہ حشر کا   حق بجانب ہے جو ہے زاہد کو دھڑکا حشر کا
ہے تأمل تیری قامت کے جو مضموں مل گئے   شاید اب نزدیک آ پہنچا زمانہ حشر کا
جلوۂ قامت نے کچھ ایسا ہمیں گھبرا دیا   جیتے جی ہم سمجھے آ پہنچا زمانہ حشر کا
میری آنکھیں نوحؑ کے طوفاں کی دکھلاتی تھیں سیر   ان کی چتون نے تو دکھلایا تماشا حشر کا
یادِ قامت نے کیا ہے واعظوں کا معتقد   روز ہیں سننے کو جاتا ہوں فسانا حشر کا
ورقِ قسمت کے مطابق نامۂ عصیاں ہے جب   پھر بھلا ہونے لگا کیوں مجھ کو کھٹکا حشر کا
ہے شبِ ہجراں درازی میں بسانِ زلفِ یار   طول میں روزِ جدائی دن ہے گویا حشر کا
یادِ قامت سے جو اُس دن مل گئی فرصت ہمیں   دیکھ لیں گے دُور سے ہم بھی تماشا حشر کا
بے خبر جو ایک کے احوال سے ہے دوسرا   آپ کی محفل بھی گویا ہے نمونہ حشر کا
جنسِ عصیاں نفعِ خاطر خواہ پر بیچیں گے ہم   اے عزم نقصان ذرا ہونے دے میلہ حشر کا
فاتحہ پڑھنے مری تربت پہ خوش قد آتے ہیں   ہر شبِ آدینہ یاں ہوتا ہے میلہ حشر کا
کیا قیامت نامہ پڑھ پڑھ کے سناتا ہے مجھے (ق) خوف تُو مجھ کو دلاتا ہے بھلا کیا حشر کا
واعظا میں اس کا محوِ جلوۂ رفتار ہوں   جس کا ہر نقشِ قدم ہے اک رسالہ حشر کا
انتہا کا حسن بخشا ہے اُسے اللہ نے (ق) کیوں دل و جاں سے نہیں ہو جاؤں شیدا حشر کا
نامۂ اعمال میرا اس کی ہے زلفِ سیاہ   نُورِ رحمت ہائے حق ہے رُوئے زیبا حشر کا
وحشتِ دل مجھ سے کہتی ہے چلو بھی یاں سے اب (ق) طے ابھی برسوں نہ ہوگا یہ بکھیڑا حشر کا
خواہشِ خلدِ بریں میں آرزوئے حُور میں   کون مدت تک اُٹھائے نازِ بے جا حشر کا
حشر تک اب ہاتھ آنے کے نہیں مضمونِ حشر   تم نے اے اکبر کوئی پہلو نہ چھوڑا حشر کا

(۴۰)

(۱۸۷۰ء)

پچیس سال عمر کی غزلیں

لاکھ جرأت کی کہ تنہائی میں لپٹا لیں انہیں   دل میں رُعبِ حسن سے خوف و خطر آ ہی گیا
میں بھی اب اچھی طرح غیروں سے کرتا ہوں فساد   رنج تو مجھ سے تجھے اے فتنہ گر آ ہی گیا
دھیان میں لایا سرِ مُو بھی نہ اس کی نازکی   کھُل کے جُوڑا خود سری سے تا کمر آ ہی گیا
گو بہت کچھ رنجِ یارانِ وطن سے تھا ہمیں   آنکھ میں آنسو مگر وقتِ سفر آ ہی گیا
میری آہیں سُن کے کان اپنے کئے تھے تم نے بند   رو دیئے آخر کو، دل میں کچھ اثر آ ہی گیا
آ کے جب غش میں مجھے دیکھا تو گھبرا کر کہا   ہوش میں آ، اب تو میں اے بے خبر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی   سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

(۴۱)

حسرت کو شہرِ عشق میں بھیجا خدا نے جب   رہنے کو خانۂ دلِ مضطر بنا دیا
پہلے ہی چال آپ کی تھی فتنہ زا حضور   گھونگھرو نے اور فتنۂ محشر بنا دیا
لکھی یہاں تلک صفت اس نونہال کی   خامہ کو ہم نے شاخِ گُل تر بنا دیا

(۴۲)

نظارہ روز و شب ہے مصحفِ رخسارِ قاتل کا   یہی صورت رہی تو بس خدا حافظ مرے دل کا
خزاں میں کیا اداسی چھائی ہے صحنِ گلستاں پر   نہ وہ پھولوں کی رنگینی نہ وہ نغمہ عنادل کا
یہ زینت بندشِ الفاظ کی ہے حسنِ معنیٰ سے   نہ ہو جلوہ جو لیلیٰ کا تو پھر کیا لطف محمل کا

(۱۸۷۱ء)

چھبیس سال عمر کی غزلیں

(۴۳)

کوئی پہنچا نہیں اے یار تیرے قدِ رعنا تک   ہماری فکرِ عالی سرو سے ہو آئی طوبیٰ تک
کبھی تشریف تو لائیں وہ مجھ محوِ تمنا تک   دل مشتاق کیا، ان پہ فدا ہے جانِ شیدا تک
دبستانِ محبت میں ہوا حاصل نہ کچھ مجھ کو   کتابِ عمر آخر ہو گئی حرفِ تمنا تک
گلستاں میں جو بلبل رنگِ گُل پر جان دیتی ہے   نہیں پہنچی نظر اس کی ترے رخسارِ زیبا تک
تری فکرِ کمر سے ہو گیا ہے اِس قدر نازک   کہ مشکل سے پہنچتا ہے تصور نامِ عنقا تک
دلِ صد چاک آتا ہے نظر جو صورتِ شانہ   رسائی اس کی ہے شاید تری زلفِ چلیپا تک
گماں ہے کاروانِ جذبۂ دل کا مجھے اس پر   کنوئیں سے کھینچ لایا تھا جو یوسف کو زلیخا تک
نقاب الٹیں اگر وہ عارضِ پُر نور سے اپنے   شبِ یلدا کو سمجھے روزِ محشر چشمِ اعمیٰ تک
جسے ہے طوقِ گلو گرداب تو زنجیرِ پا موجیں   تری الفت میں انساں کیا کہ دیوانے ہے دریا تک
بنا کر آب آئینہ کیا ہے اس نے پانی کو   نگاہیں بے تکلف جا رہی ہیں قعرِ دریا تک
زمیں پہ شمع روشن ہے، فلک پر ماہِ تاباں ہے   تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک
میں ہوں وہ رشکِ مجنوں جس کی وحشت کو بھی وحشت ہے   وہ ویرانہ ہے میرا جس سے گھبراتا ہے صحرا تک
کیا ہے عاشق اک پردہ نشیں کا مجھ کو قسمت نے   میں وہ بیمار ہوں جو جا نہیں سکتا مسیحا تک
وہ آئے بھی جو بالیں پر تو ایسے وقت میں آئے   کہ فرطِ ضعف سے ہم کر نہیں سکتے اشارا تک
جو اس نے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے   خوشی سے وہ ہوئے بیخود کہ ہم بھولے تمنا تک
نہ نکلے اشکِ حسرت نزع میں اے بیکسی کیوں کر   وہ بیکس ہوں نہیں ہے کوئی مجھ پر رونے والا تک
جو وصفِ صاحبِ معراج ہے مدِ نظر اکبر   مری فکرِ رسا جاتی ہے اب عرشِ معلیٰ تک

(۴۴)

(۱۸۷۲ء)

ستائیس سال عمر کی غزل

چیزے کہ بہ عشق آدمی رقصد و می سوزد   دل ہست کہ در پہلوی رقصد و می سوزد
در شمع چو پروانہ ترے زرخِ خوبت   پروانہ بگردِ او می رقصد و می سوزد
ہر شمع بیادِ او می گرید و می کاہد   ہر شعلہ بہ شوقِ او می رقصد و می سوزد

(۱۸۷۳ء)

اٹھائیس سال عمر کی غزلیں

(۴۵)

کیسی کیسی وہ لگاوٹ کی نظر کرتے ہیں   دھوکے کھاتا ہے ہمارا دلِ ناداں کیا کیا

لے ایک پچاز ملیپ کے گرد ناچ رہا تھا (۱۸۷۲ء)

خوب فرما گئے ہیں حضرتِ آتشؔ اکبرؔ
میرے اللہ نے مجھ پر کیے احسان کیا کیا

(۴۶)

ناقصاں را شود بخشندہ پرتو اہلِ کمال
ماہِ نو را می کند در نورِ کامل آفتاب

بینمش در قطعِ رہ ہر روز روزِ اوّلیں
صورتِ من ہست پویائے چہ منزل آفتاب

ہر سحر لرزاں و ہر شام ہے بخوں می بینمش!
شد مگر از غمزۂ حُسنِ تو بسمل آفتاب

حیرتم نبود بریں اوجِ تو اے لیلائے حُسن
ناقہ ات گردوں اگر سازند و محمل آفتاب

مرکزِ آسا نقطۂ موہومش انکار ند و بس
گرد وارِ حلقۂ بزمِ تو داخل آفتاب

ہست رفتارِ حسیناں باعثِ صد انقلاب
می کند تغییرِ فصل از طے منزل آفتاب

سوزِ عشقِ رُوئے تو دارم بایں کم مائگی!
اخترے ہستم کہ پنہاں کردہ در دل آفتاب

جوش زد چوں پرتو نورِ رُخت اے بحرِ حسن
در اُفق گم گشت مثلِ موجِ ساحل آفتاب

پرتو نُورت نمود اعجاز ہنگامِ شنا
قطرہ قطرہ گشت در دامانِ ساحل آفتاب

مے کشاں مے خوردہ از بحرِ تردد بگذرند
می رساند کشتیِ رنداں بساحل آفتاب

وانہائے سبحہ در دست است شوقِ بے لطیع
بر کفِ انجم دارم و پوشیدہ در دل آفتاب

بر سرش زہرہ اگر تا بد اسیراں ناخوش ست
بگذرد زُود از نواحِ چاہِ بابل آفتاب

بر سپہرِ معنیٔ روشن چو گاہے سیر کرد
ارمغاں آورد اکبرؔ سوئے محفل آفتاب

آفریں اکبرؔ بریں روشن بیانی ہائے تو
شعر می خوانی و می تابد بہ محفل آفتاب

(۴۷)

دلم فسردہ شد و عشق و آرزُو باقی است
نماند در گل پژمردہ رنگ و بُو باقی است

گماں مبر کہ ستم کردی و وفا نہ کنم
بیا بیا کہ ہماں شوق و آرزُو باقی است

فغاں کہ آتشِ غم زیرِ خاک ہم نگذاشت
ہنوز سوزِ دل و آہِ شعلہ خُو باقی است

بہ بحرِ عشق فنا دیم دست و پا نہ زدیم
ہزار منّتِ ہمّت کہ آبرُو باقی است

اجل بیامد و جانم ببرد و دل بگذاشت!
فغاں کہ جانِ عزیزم شُد و عدُو باقی است

فدائے صورتِ زیبا رُخے کہ فانی نیست
نثارِ حُسنِ جبینے کہ حُسنِ اُو باقی است

ز زشتیِ عملم در لحد نمی پُرسند
ہزار شکر کہ یادِ رُخِ نکو باقی است

پس فنا بہ لحد ہم قرار نیست مرا
مگر بہ دل خلشِ خارِ آرزو باقی است

بہ حُسنِ فانیٔ دُنیا مبند دل اکبرؔ
فنا شود رہِ آں کس کہ نام او باقی است

(۴۸)

جاں نثاروں کے سوا کوئی نہ دیکھے رُوئے دوست
چال ہے تیغِ قضا کی جنبشِ ابروئے دوست

دیکھنے آئے تھے ہم حُسنِ رُخِ نیکوئے دوست
آپ سے جاتے رہے آکر میانِ کوئے دوست

اہلِ دل کو ذکرِ قمری[1] سے یہ آتی ہے صدا
باغِ دل میں چاہیئے سرو قد و دلجوئے دوست

رقص کرتی ہے نسیمِ صبح کیوں مستانہ وار
گلشنِ دل سے اڑا لائی ہے شاید بوئے دوست

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقشِ پائے یار سے
غیرتِ دامانِ گلچیں ہو رہا ہے کوئے دوست

وہ گلِ رنگیں ہوں میں پیدا ہے جس سے رنگِ یار
رنگ وہ ہوں جس میں پنہاں ہو گئی ہے بوئے دوست

دشمنوں کا سر ندامت سے ہے جھکنے کے لئے
میری گردن ہے برائے خنجرِ ابروئے دوست

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکسِ روئے دوست

(۴۹)

زائل اے دل یہ مرا دردِ جگر ہو کیوں کر
وصلِ جاناں ہے دوا اس کی مگر ہو کیوں کر

محفلِ عشرتِ اغیار میں رہتے ہیں حضور
حالِ غم دیدۂ ہجراں کی خبر ہو کیوں کر

(۵۰)

جلوۂ شاہدِ معنیٰ کی ہیں مشتاق آنکھیں!
حسنِ صورت مجھے منظورِ نظر ہو کیوں کر!

سیم تن ہیں، انہیں رہتی ہے بہت خواہشِ زر
واں بھلا ہم سے غریبوں کا گذر ہو کیوں کر

حاضری کا جو ملا حکم تو یہ ہوا ارشاد
درِ دولت پہ جو آؤں تو خبر ہو کیوں کر

(۵۱)

غمِ ہجر تو چہ کردہ است بمن ہیچ مپرس
گریہ می آید از رنج و محن ہیچ مپرس

نالۂ من چہ توانی بہ یاراں برساں
اے صبا قصۂ دُوری وطن ہیچ مپرس

بشنو از مرگِ من و فارغ و خرّم بنشیں!
باش مستغنی و از گور و کفن ہیچ مپرس

دقتے ہست بہ تشریحِ کمر ہیچ مگو!
مشکلے ہست ز اسرارِ دہن ہیچ مپرس

آخرِ فصلِ بہار است و دمِ رُخصتِ گل
دیگر از حسرتِ مرغانِ چمن ہیچ مپرس

شوقم آمادہ و دل مائلِ قاتل بہ کمیں
اندریں وقت ز بے صبریٔ من ہیچ مپرس

وقت آنست کہ با شامِ غریباں سازم!
باش واے ہم سفر از صبحِ وطن ہیچ مپرس

حسرتِ چند بہ دل دارم و ایں نکتہ بس است
وز کہ آموختہ ام طرزِ سخن ہیچ مپرس

مگو از لعلِ یمانی و بہ ہیں بخت و دلم
اشکِ من بنگر و از دُرِّ عدن ہیچ مپرس

بیکسی معتکفِ تربتِ او بود بہ دشت
قصۂ اکبرِؔ مہجور بہ وطن ہیچ مپرس

(۵۲)

وہ رشکِ گل نہ ہوا ہم سے ہمکنار افسوس
بہار بر ثمرِ خزاں ہو گئی ہزار افسوس

بہت پسند ترا رنگ ہے مجھے لیکن
بقا نہیں تجھے اے موسمِ بہار افسوس

جنوں کی یاد میں تو یہ بھی بھولے ہم دمِ مرگ
چلے جہان سے آخر گناہ گار افسوس

جو بے قراری نے آنے دیا نہ دل کے قریب
تو میرے حال پہ کرنے لگا قرار افسوس

کسی نے بزم میں سمجھا نہ باعثِ گریہ!
تمام رات رہی شمع اشک بار افسوس

طریقِ عشق میں ہادی و رہنما اکبرؔ!
جو ایک دل بھی ملا ہے وہ بیقرار افسوس

۱۸۷۴ء ـــــــ ۱۸۷۵ء

انتیس اور تیس سال کی عمر کی غزلیں

۱۸۷۴ء مقام آگرہ

(۵۳)

ہجر میں دانتوں کے گریاں جو میں بیتاب ہوا
اشک جو آنکھ سے نکلا، دُرِ نایاب ہوا

سبزۂ خط سے قرارِ دلِ بیتاب ہوا
کشتہ اس بُوٹی سے آخر کو یہ سیماب ہوا

موردِ طعنۂ بیگانہ و احباب ہوا
خوب رُسوا ترے ہاتھوں دلِ بیتاب ہوا

ہو گیا غرق میں یادِ رُخِ نورانی میں!
ہالۂ ماہ مجھے حلقۂ گرداب ہوا

تو ہے وہ برقِ تجلی کہ ترا نقشِ قدم (دق)
رُوکشِ آئینۂ مہرِ جہاں تاب ہوا

تیرے جلوے سے ہوا حُسن ظہورِ ایجاد
نُور تیرا سببِ عالمِ اسباب ہوا

گلِ ہستی کو ترے رنگ نے زینت بخشی
چمنِ خلق ترے فیض سے شاداب ہوا

حسرت اے عقل کہ پائی ترے لشکر نے شکست
مژدہ اے عشق، جنوں آج ظفریاب ہوا

کسی حالت میں اسیری سے رہائی نہ ہوئی (دق)
ڈوب مرنے پہ بھی مائل جو میں بیتاب ہوا

موجیں دریا کی سلاسل ہوئیں پاؤں کے لئے
طوقِ گردن کے لئے حلقۂ گرداب ہوا

چشمِ معنیٰ سے جو کی سیرِ طلسماتِ جہاں
پتّہ پتّہ مجھے اک گلشنِ شاداب ہوا

---

[1] صوفیوں کے ایک طریقۂ ذکر کا نام ہے۔

قطرہ قطرہ میں ہوئی وسعتِ دریا پیدا
ذرہ ذرہ صفتِ مہرِ جہاں تاب ہُوا

اک زمانہ کی ترے آگے جھکی ہے گردن
خمِ ابرو نہ ہُوا کعبہ کی محراب ہُوا

ساقیا بہرِ خُدا جلد پلا مجھ کو شراب
فرقتِ شیشہ و ساغر میں مَیں بیتاب ہوا

نہ رہی دُخترِ رز مجھ پہ کسی طرح حرام
اب ترے عُذر کا مسدُود ہر اک باب ہُوا

اِس طرف قلقلِ مینا ہے اُدھر شورِ طلب
بس سمجھ لے وُہ قبول اور یہ ایجاب ہُوا

درد ہوتا ہے یہ کہہ کر کئے کان آپ نے بند
حال میرا نہ ہُوا قطرۂ سیماب ہُوا

(۵۴)

فکرِ رنگیں سے ہوئی مدحتِ دندانِ صنم
دیکھئے لعل سے پیدا درِ نایاب ہُوا

رہی ہر کام میں ہر وقت مسبب پہ نگاہ
اپنا منظر نہ کبھی عالمِ اسباب ہُوا

یاں کی رنگینیاں ہیں عینِ دلیلِ غفلت
سُرخیِ چشم سے پیدا اثرِ خواب ہُوا

گردشِ بخت سے آنسو ہی نکلتے ہیں مدام
اس میں بھی کیا اثرِ گردشِ دولاب ہُوا

ضیقِ فرصت میں غزل ہو نہ سکی اے اکبر
میں تو شرمندۂ فرمائشِ احباب ہُوا

(۵۵)

ابھی سے خون رُلاتی ہے مجھ کو فکرِ مآل
چمن میں بعد ترے اے بہار کیا ہوگا

انہیں پسند نہیں اور اُس سے ہیں بیزار
الٰہی پھر یہ دلِ بے قرار کیا ہوگا

عزیز و سادہ ہی رہنے دو لوحِ تربت کو
نہیں مٹے تو یہ نقش و نگار کیا ہوگا

(۵۶)

زمانہ ہو گیا بسمل تری سیدھی نگاہوں سے
خدا ناخواستہ ترچھی نظر ہوتی تو کیا ہوتا

محبت ہو نہ ہو ان کو مجھے کیا میں تو عاشق ہوں
نہ ہونے سے ہے اس کے کیا اگر ہوتی تو کیا ہوتا

پسا جاتا ہوں میں سو جان سے اس بے وفائی پر
محبت یار کو مجھ سے اگر ہوتی کیا ہوتا

مری حسرت کی نظروں ہی پہ ظالم اس قدر بگڑا
کہیں دردِ جگر سے چشم تر ہوتی کیا ہوتا

نہ دی کچھ آسماں نے ایک دم بھی وصل کی ساعت
گھڑی بھر چین سے اپنی بسر ہوتی تو کیا ہوتا

قفس اس ناتوانی پہ تنِ بسمل بنا تم سے
جو طاقت بھی کہیں لے بال و پر ہوتی کیا ہوتا

مشاعرہ ۴ مئی ۱۸۷۵ء

(۵۷)

کام آتا ہے جو وصفِ رُوئے دلبر میں چراغ
اَوج پر رہتا ہے ہر محفل میں ہر گھر میں چراغ

یادِ مژگان و رُخِ روشن ہمارے دل میں ہے
یا کسی نے رکھ دیا پہلوئے خنجر میں چراغ

آہ کرتا ہوں تو رکھ لیتے ہیں وُہ رُخ پر نقاب
کہتے ہیں "صاحب ٹھہر" تا کب ہے صرصر میں چراغ

جب سے تحریر ثنائے رُخ میں کام آتا ہے یہ
ہے عوض بتی کے فکرِ تارِ مسطر میں چراغ

پھیل جائے گی جو ظلمت نامۂ اعمال کی
میرا یہ داغِ ندامت ہوگا محشر میں چراغ

لال ڈورے ہیں جو چشمِ مستِ ساقی میں عیاں
ہیں طلسمِ حُسن سے روشن یہ ساغر میں چراغ

داغ ہے ہمارے ہیں داغِ ہجرِ ساقی پر نہیں
میکشو روشن کیا ہے میں نے ساغر میں چراغ

یوں عیاں گل رخاں میں ہے منوّر داغِ دل
جل رہا ہو جس طرح پھولوں کی چادر میں چراغ

دیکھتے ہو تم بہت پروانہ بن جائے نہ یہ
پڑ نہ جائے جادوئے چشمِ فسوں گر میں چراغ

یوں ہے افشاں میں عیاں پیشانیِ روشن تری
ماہ کا جلتا ہو جیسے فوجِ اختر میں چراغ

کر رہا ہے وصفِ آئینہ کا جو وہ شعلہ رُو
ہے یہ گویا مشکِ احسانِ سکندر میں چراغ

روزِ روشن آئینہ کا زلف نے شب کر دیا
عکسِ عارض نے جلایا چشمِ جوہر میں چراغ

یوں ہے دل کی خواہشوں میں داغِ حسرت کا ہجوم
جس طرح سے سینکڑوں جلتے ہوں لشکر میں چراغ

بے قصور ہر شب لیا کرتا ہے پروانوں کی جان
کیا جواب اس کا خدا کو دے گا محشر میں چراغ

دل میں جتنی ہو سکے داغوں کی کثرت خوب ہے
چاہئیں افراط سے اللہ کے گھر میں چراغ

بزمِ ہستی میں نہ دیکھا پرتوِ روئے صنم
اس شبستاں میں نہ تھا میرے مقدر میں چراغ

غم کے شعلے یادِ عارض میں بھڑکتے رہتے ہیں
آج کل ہے دشمنِ جاں بزمِ اکبر میں چراغ

دورِ دُوم

اندازاً تیس سے چالیس سال عمر تک کی غزلیں

(۱)

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بُلبل گُلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گُلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہُوں، آئیں تو احسان ہے اُن کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وُہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(۲)

نہاں ہے شل بوئے گُل جو رنگ اس رُوئے زیبا کا
مری چشمِ تماشا چشمہ ہے خونِ تمنّا کا

سیہ بختی کے پڑتے ہیں جو ہم پر پیچ غربت میں
تو یاد آتا ہے بل کھانا کسی زُلفِ چلیپا کا

ہوا ہے امتحانِ ضبط پر مائل مُحبت کا فر
خدا حافظ دلِ بے صبر و جانِ ناشکیبا کا

بڑھا کر آرزو اتنا گھٹایا عشق نے مجھ کو
کہ کانٹا رہ گیا میں اپنے گلزارِ تمنّا کا

نہ ہو چشمِ تمنّا کس طرح محوِ رُخِ روشن
رُخِ روشن تمہارا نور ہے چشمِ تمنّا کا

مری آنکھوں سے ہے کیفیتِ مستیِ دلی پیدا
لبِ ساغر سے افشا ہو رہا ہے رازِ مینا کا

کمالِ یاس حاصل ہو گیا آخر مجھے اکبر
بہت روز دل سے دل کو شغل تھا عشقِ تمنّا کا

(۳)

غمِ فراق کا صدمہ اُٹھا نہیں سکتا
اب اپنی جان میں اے جان، بسا نہیں سکتا

کسی کو رنگِ محبت دکھا نہیں سکتا
جو دل میں ہے وہ زباں پر میں لا نہیں سکتا

حیائے حُسن انہیں ہے، حجابِ عشق مجھے
غرض وہ آ نہیں سکتے، میں جا نہیں سکتا

یہ کہہ کے اُٹھ گئے ہنگامِ نزع مجھ سے رفیق
یہ راہ وہ ہے کوئی ساتھ جا نہیں سکتا

لگا لے سینے سے یا قتل کر مجھے ظالم
ترے قدم سے میں اب سر اُٹھا نہیں سکتا

تمہیں بلو تو بلو ورنہ اور سے کیا کام
میں اپنے دل کو کہیں اب لگا نہیں سکتا

نظر لگائے ہیں دل پر ہر اک طرف سے حسیں
کسی طرح سے میں پہلو بچا نہیں سکتا

گزر چکا ہے مرا کام ضبط سے اکبر
میں رازِ عشق اب اپنا چھپا نہیں سکتا

(۴)

تم نے بیمارِ محبت کو ابھی کب دیکھا!
جو یہ کہتے ہوئے جاتے ہو کہ دیکھا، دیکھا

طفلِ دل کو مرے کیا جانے لگی کس کی نظر
میں نے کمبخت کو دو دن بھی نہ اچھا دیکھا

لے گیا تھا طرفِ گورِ غریباں دلِ زار (ق)
کیا کہیں تم سے جو کچھ واں کا تماشا دیکھا

وہ جو تھے رونقِ آبادیِ گلزارِ جہاں
سر سے پا تک انہیں خاکِ رہِ صحرا دیکھا

کل تلک محفلِ عشرت میں جو تھے صدر نشیں
قبر میں آج انہیں بے کس و تنہا دیکھا

بسکہ نیرنگیِ عالم پہ اسے حیرت تھی!
آئینہ خاکِ سکندر کو سراپا دیکھا

سرِ جمشید کے کاسے میں بھری تھی حسرت
یاس کو معتکفِ تربتِ دارا دیکھا

---

(۵)

وصلِ جاناں کی دلِ زار کو حسرت ہی رہی —— پر میسّر نہ ہوا
عمر بھر جان پہ فرقت کی مصیبت ہی رہی —— تھا یہ قسمت کا لکھا

تم نے جو بات کہی، میں نے دل وجاں سے وہ کی —— نہ کیا عذر کبھی
تم کو اس پر بھی مگر، مجھ سے شکایت ہی رہی —— بھلا یہ خدمت کا صلا

چشمۂ چشم سے اشکوں کی بھی موجیں نکلیں —— ٹھنڈی سانسیں بھی چلیں
آتشِ غم کی مگر دل میں حرارت ہی رہی —— نہ ہوا فرق ذرا

کھائیں سو مرتبہ قسمیں کہ ہوں عاشق تیرا —— نہیں اَوروں پہ نظر
بدگمانی مگر اس شوخ کی عادت ہی رہی —— صاف مجھ سے نہ ہوا

ایک تم ہو کہ ہزاروں ہی کئے مجھ پہ ستم —— ہل کے غیروں سے بہم
ایک میں ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہی رہی —— کبھی شکوہ نہ کیا

دشمنوں نے تو بہت بات بنائی جاکر —— کہ وہ بگڑیں مجھ پر
حال پہ میرے مگر اُن کی عنایت ہی رہی —— کچھ کسی سے نہ ہوا

ہے تمہاری بھی عجب سخت طبیعت پیدا —— رحم دل میں نہ مزا
منتیں کرتے رہے ہم، تمہیں وحشت ہی رہی —— پاس بیٹھے نہ ذرا

منزلِ گور میں تنہا مجھے سب چھوڑ چلے —— اپنے بیگانے جو تھے
ساتھ دینے کو فقط اس کی عنایت ہی رہی —— اور کوئی نہ رہا

ہم نشیں اُٹھ گئے اس بزم سے اپنے اکبر —— تم بھی لب باندھو کمر
نہ وہ جلسے ہی رہے اب، نہ وہ صحبت ہی رہی —— کیا ہے جینے کا مزا

(۶)

مائل دلِ وحشی ہے کبھی زلفِ دوتا کا
سودا مرے دیوانے کو ہے دامِ بلا کا

انکارِ وصال اُن کے لبوں پر یہ نہیں ہے
پیغام میں سنتا ہوں مسیحا سے قضا کا

(۷)

یار نے کچھ خبر نہ لی، دل نے، جگر نے کیا کیا
نالۂ شب سے کیا ہوا، آہِ سحر نے کیا کیا

دونوں کو پاکے بے خبر کر گئے کام حسن و عشق
دل نے ہمارے کیا کیا، اُن کی نظر نے کیا کیا

صاحبِ تاج و تخت بھی موت سے یاں نہ بچ سکے
جاہ و حشم سے کیا ہوا، کثرتِ زر نے کیا کیا

کُھل گیا سب پہ حالِ دل، ہنستے ہیں دوست برملا
ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

اکبرِ خستہ دل کا حال قابلِ رحم ہو گیا!
اُس سے سلوک کیا کہوں، تیری نظر نے کیا کیا

(۸)

ہجومِ غم سے ان روزوں ہے دل زیر و زبر اپنا
بحقِ احمدِ مرسل الٰہی فضل کر اپنا

نصیحت واعظوں کی اب کرے گی کیا اثر اپنا
زمانہ ہو چکا ہے تُو نہیں رندی میں بسر اپنا

نہ روؤں کس طرح غربت میں، میں دل کھول کر اپنا
حجاب اب ہے یہاں کس کا، نہ شہر اپنا، نہ گھر اپنا

رہ و رسمِ محبت ان حسینوں سے میں کیا رکھوں
جہاں تک دیکھتا ہوں نفع اُن کا ہے ضرر اپنا

رہے آوارہ یوں اک عمر دنیا میں تو کیا حاصل
مزا تب تھا، بنا لیتے کسی کے دل میں گھر اپنا

محلِ غیرت کا ہے، چہرہ پہ لوں گا وارِ قاتل کے
مجھے اس معرکہ میں منہ نہ دکھلائے سپر اپنا

محبت کُھل گئی، اپنے پرائے طعنے دیتے ہیں
عجب عالم ہے غیرت سے اُدھر اُن کا اِدھر اپنا

محبت میں یہ ناصح اور بھی اک قہر ڈھاتے ہیں
کہیں کیا، ناک میں دم ہے اُدھر اُن کا اِدھر اپنا

(۹)

مضامیں بسکہ ہے مدِّ نظر اپنا
گُلِ تر سے لطافت میں فزوں ہے شعرِ تر اپنا

ہوا ہے بے خودی کے کوچہ میں جب سے گذر اپنا
نگاہِ شوق سے میں خود ہوں منظورِ نظر اپنا

اٹھاتا تھا ہزاروں سختیاں دل میں اُسے رکھ کر
مرے سنگِ لحد پر آرزو پٹکے گی سر اپنا

عروجِ ہستیِ فانی پہ کیا سرگرمِ عشرت ہوں
فروغِ چند ساعت ہے یہاں مثلِ شرر اپنا

جگہ دے آمد آمد ہے نویدِ وصلِ جاناں کی
اٹھا لے سینہ سے بستر تو اے دردِ جگر اپنا

نہیں کچھ آج ہی سے میری قسمت میں پریشانی
ازل سے حصّۂ سودائے گیسو میں ہے سر اپنا

لحد کی فکر بھی لازم ہے منعم قصرِ عالی میں
مآلِ کار بھی کچھ سوچ لے اے بے خبر اپنا

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانے ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

غرض کیا ان کو ہے، پاپوش ان کی پاؤں دھوتی ہے
لئے پھرتا ہے کیوں مہرِ فلک یہ طشتِ زر اپنا

نگاہِ شوق پر دستِ ہوس کو کیوں نہ رشک آئے
کہ یہ مجبور ہیں، وہ کام کرتی ہے ادھر اپنا

کہیں دیکھا نہ ہستی و عدم کا اشتراک ایسا
جہاں میں مثل رکھتی ہی نہیں ان کی کمر اپنا

نہایت جلد آ کر باعثِ تسکینِ خاطر ہو
سراپا منتظر سمجھے مجھے اُن کی خبر اپنا

غزل ایسی پڑھو مملو جو ہو عالی مضامیں سے
کہ واب دوسرے کوچے میں اے اکبر گذر اپنا

(۱۰)

حباب آسا اٹھایا بحرِ ہستی میں جو سر اپنا
بنایا بس وہیں موجِ فنا نے ہم سفر اپنا

بسر تیرہ دروں میں ہو کیوں کر اہلِ بینش کی
اندھیرے میں نہیں کچھ کام کر سکتی نظر اپنا

پہنچ جاؤں گا سجدوں سے مقامِ قربِ باری میں
قدم کے بدلے میں اس راہ میں رکھوں گا سر اپنا

خطِ موہوم کو ہے نقطۂ فرضی سے اک نسبت
تمہیں اپنے دہن سے کچھ کرو وصفِ کمر اپنا

تصوّر بھی کبھی مرقد کا آتا تھا نہ دنیا میں
یہ غفلت تھی کہ ہم بھولے ہوئے بیٹھے تھے گھر اپنا

رہِ توحید میں کھٹکا نہیں ہے غیر کا مجھ کو
خودی کا خوف ہے لیکن رہا کرتا ہے ڈر اپنا

نزاکت کے اثر سے شعر میں بھی بندھ نہیں سکتی
بچا جاتا ہے پہلو مجھ سے مضمونِ کمر اپنا

ہماری سرخیِ داغِ جگر سے زرد رو ہوں گے
جمائیں گے وہاں کیا رنگِ الفت اہلِ زر اپنا

تردد کچھ نہیں ایذا دہندوں کو رسائی میں
تمنا بے تکلف دل میں کر لیتی ہے گھر اپنا

نسیمِ عیش ہو یا صرصرِ غم، ہم نہیں ہٹتے
جما ہے پائے استقلال یاں مثلِ شجر اپنا

(۱۱)

جو بینا چشم معنی جلوۂ حسن بشر آیا
تماشا ہو تو انوارِ خالق کا نظر آیا

رہا دم بھر فروغ اس کو، کبھی جو اوج پر آیا
مرے حصّہ میں شاید اخترِ بختِ شرر آیا

تصوّر جلوۂ توحید کا ہے مثلِ آئینہ
کیا شوقِ تماشا جب کبھی میں خود نظر آیا

تصوّر ان کے عارض کا زبس رنگین و نازک تھا
پری بن کر ہمارے شیشۂ دل میں اُتر آیا

ملا ہے ہم کو یہ مضمونِ روشن چشمِ بینا سے
کہ چھوڑی جس نے خود بینی اسے سب کچھ نظر آیا

گیا تھا ہو کے رخصت صورتِ تسکینِ دل مجھ سے
بہ رنگِ ہوش وہاں سے پھر کے اپنا نامہ بر آیا

حسینوں کو ترے ہوتے ہوئے اے بُت میں کیا دیکھوں
مجھے تو حسن تیرا خود تماشائی نظر آیا

ہوا ہے باعثِ ایجادِ عالم حسن یہ کس کا
یہ کس کے دیکھنے کو مجمعِ اہلِ نظر آیا

جگہ بھی بیٹھنے کی اب مجھے ملتی نہیں صاحب
وہی اچھا رہا اس بزم میں جو پیشتر آیا

سوا افسانۂ دل کے کہا بھی کچھ نہیں میں نے
یہ غصّہ آپ کو فرمایئے کس بات پر آیا؟

ہوئے سرسبز لاکھوں نخل اس گلزارِ ہستی میں
نہ لیکن رنگ پر اپنی تمنا کا شجر آیا

(۱۲)

نہ حاصل ہوا صبر و آرام دل کا
نہ نکلا کبھی تم سے کچھ کام دل کا!

محبت کا نشہ رہے کیوں نہ ہر دم
بھرا ہے مئے عشق سے جام دل کا

پھنسایا تو آنکھوں نے دامِ بلا میں
مگر عشق میں ہو گیا نام دل کا

ہوا خوب رسوا یہ عشقِ بتاں میں
خدا ہی ہے اب میرے بدنامِ دل کا

یہ بانکی ادائیں یہ ترچھی نگاہیں!
یہی لے گئیں صبر و آرامِ دل کا

دھواں پہلے اٹھتا تھا آغاز تھا وہ
ہوا خاک اب یہ ہے انجامِ دل کا

جب آغازِ الفت ہی میں جل رہا ہے
تو کیا خاک بتلاؤں انجامِ دل کا

خدا کے لئے پھیر دو مجھ کو صاحب
جو سرکار میں کچھ نہ ہو کامِ دل کا

پسِ مرگ ان پر کھلا حالِ الفت
گئی لے کے روح اپنی پیغامِ دل کا

تڑپتا ہوا یوں نہیں پایا ہمیشہ
کہوں کیا میں آغاز و انجامِ دل کا

دل اس بے وفا کو جو دیتے ہو اکبر
تو کچھ سوچ لو پہلے انجامِ دل کا

(۱۳)

فروغِ کم بضاعت رونقِ عالم نہیں ہوتا
مہِ نو بدر ہو کر نیّرِ اعظم نہیں ہوتا

بتوں کے قول سے شاداں دلِ پرغم نہیں ہوتا
دل ان کا سنگ ہے، پر عہد مستحکم نہیں ہوتا

خدا محفوظ رکھے الفتِ مژگانِ خوباں سے
یہ ذوقِ نشترِ دل مرتے مرتے کم نہیں ہوتا

مقامِ بے خودی میں آرزو کیا عرضِ مطلب کیا
وہاں یہ دل نہیں ہوتا ہے، یہ عالم نہیں ہوتا

صفائے سینہ تک دستِ تصوّر کس طرح پہنچے
وہ سینہ آشنائے دستِ نامحرم نہیں ہوتا

تمہارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرتِ واعظ
اثر لیکن نگاہِ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا

تمنائے وصالِ یار میں ہر وقت روتا ہوں
[illegible] ستیں و دیدۂ پُرنم نہیں ہوتا

شکستہ، سوختہ، مجروح، اس پر یہ تمنا میں
دلِ عاشق سا دنیا میں کوئی بے غم نہیں ہوتا

(۱۴)

اگر دل واقفِ نیرنگیٔ طبعِ صنم ہوتا
زمانہ کی دورنگی کا اسے ہرگز نہ غم ہوتا

یہ پابندِ مصیبت دل کے ہاتھوں ہم تو رہتے ہیں
نہیں تو چین سے کٹتی، نہ دل ہوتا، نہ غم ہوتا

انھیں کی بے وفائی کا یہ ہے آٹھوں پہر صدمہ
وہی ہوتے جو قابو میں، تو پھر کاہے کو غم ہوتا

لب و چشمِ صنم گر دیکھنے پاتے کہیں شاعر
کوئی شیریں سخن ہوتا، کوئی جادو رقم ہوتا

بہت اچھا ہوا آئے نہ وہ میری عیادت کو
جو وہ آتے تو غیر آتے، جو غیر آتے تو غم ہوتا

اگر قبریں نظر آتیں نہ دارا و سکندر کی
مجھے بھی اشتیاقِ دولت و جاہ و حشم ہوتا

لئے جاتا ہے جوشِ شوق ہم کو راہِ الفت میں
نہیں تو ضعف سے دشوار چلنا دو قدم ہوتا

نہ رہنے پائے دیواروں میں روزن شکر ہے ورنہ
تمہیں تو دل لگی ہوتی، غریبوں پر ستم ہوتا

(۱۵)

نہ پروانے سے محفل اور نہ بلبل سے چمن چھوٹا
مجھی سے جلسۂ رنگینِ یارانِ وطن چھوٹا

وہ ترچھی نظروں سے دیکھا کئے اور میں رہا بسمل
نہ بے تابی گئی میری، نہ ان کا بانکپن چھوٹا

(۱۶)

روشن دلِ عارف سے فزوں ہے بدن ان کا
رنگیں ہے طبیعت کی طرح پیرہن ان کا

محروم ہی رہ جاتی ہے آغوشِ تمنّا
شرم آ کے چرا لیتی ہے سارا بدن ان کا

جن لوگوں نے دل میں ترے گھر اپنا کیا ہے
باہر ہے دو عالم سے مری جاں وطن ان کا

ہر بات میں وہ چال کیا کرتے ہیں مجھ سے
الفت نہ نبھے گی جو یہی ہے چلن ان کا

عارض سے غرض ہم کو، نہ عنادل کو ہے گل سے
ہے کوچۂ معشوق ہمارا، چمن ان کا

ہے صاف نگاہوں سے عیاں جوششِ جوانی
آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن ان کا

یہ شرم کے معنی ہیں، حیا کہتے ہیں اس کو
آغوشِ تصوّر میں نہ آیا بدن ان کا

غیروں ہی پہ چلتا ہے جوابِ ناز کا خنجر
کیوں بیچ میں لایا تھا مجھے بانکپن ان کا

غیروں نے کبھی پاک نظر سے نہیں دیکھا
وہ اس کو نہ سمجھیں تو یہ ہے حسنِ ظن ان کا

اس زلف و رخ و لب پہ انھیں کیوں نہ ہو نخوت
تاتار ہے ان کا، حلب ان کا، یمن ان کا

اللہ رے فریبِ نظرِ چشمِ فسوں ساز
بندہ ہے ہر اک شیخ، ہر اک برہمن ان کا

آیا جو نظر حسنِ خداداد کا جلوہ
بت بن گیا منہ دیکھ کے ہر برہمن ان کا

مرقد میں اتارا ہمیں تیوری کو چڑھا کر
ہم مر بھی گئے پر نہ چھٹا بانکپن ان کا

گذری ہوئی باتیں نہ مجھے یاد دلاؤ
اب ذکر ہی جانے دو بس اے جانِ من ان کا

دلچسپ ہے، آفت ہے، قیامت ہے، غضب ہے
بات ان کی، ادا ان کی، قد ان کا، چلن ان کا

(۱۷)

پوشیدہ آنکھوں میں کبھی دل میں نہاں رہا
برسوں خیالِ یار مرا میہماں رہا

فریاد کس کی تھی پسِ دیوار رات بھر
کیا مجھ سے پوچھتے ہو، تو کل شب کہاں رہا

بے جا مرے سفر پہ ہیں یہ بدگمانیاں
پیشِ نظر تمہیں تو رہے، میں جہاں رہا

(۱۸)

مصحفِ رخسارِ یوسف میں ہو جب تفسیرِ خواب
کیا زلیخا کو عزیزِ مصر دے تعبیرِ خواب

اگلی باتیں حسن کی عبرت کے عوض غفلت نہ کر
غافلوں کے واسطے افسانہ ہے تدبیرِ خواب

کوچۂ جاناں سے اٹھتا ہوں تو سو جاتے ہیں پاؤں
ہے طلسمِ تازہ بیڑی کے عوض زنجیرِ خواب

خواب تھیں بیداریاں اس ہستیٔ موہوم کی
گور میں خوابِ فنا سے مل گئی تعبیرِ خواب

برق کا جلوہ نظر آیا ہے مجھ کو خواب میں
قرب ان سے ہوگا، الٹی ہے اگر تعبیرِ خواب

وصل میں شوقِ تماشہ ہجر میں اشکوں کا جوش
عاشقی میں الغرض ممکن نہیں تدبیرِ خواب

قتل کرتا ہے ترا بے ساختہ سونا مجھے
اس ادائے خواب کو کہتا ہوں میں شمشیرِ خواب

اس زمیں میں اور بھی پڑھیے غزل اکبر کوئی
پڑ گئی ہو گر نہ پائے فکر میں زنجیرِ خواب

(۱۹)

ہم جو سمجھے تھے نہ وہ حاصل ہوئی تعبیرِ خواب
خواب میں بھی پھر نظر آئی نہ وہ تصویرِ خواب

عالمِ اسباب بھی اک عالمِ موہوم ہے
جتنی تعبیریں ہیں یاں کی، ہیں یہ سب تعبیرِ خواب

خواب میں دیکھا کہ وہ دامن چھڑا کر چل دیئے
حشر کے دن ہوں گے یا سب ہم گریباں گیرِ خواب

کون ایسا ہے جو ہر شب چین سے سوتا نہیں
اک ہمیں محروم ہیں اے فیضِ عالمگیرِ خواب

حضرتِ یوسف کو لپٹا کر زلیخا نے کہا
آپ کے ملنے سے مجھ کو مل گئی تعبیرِ خواب

خواب میں شاید کہی ہے تم نے اکبر یہ غزل
سارے مضموں ہیں خیالی، ہے یہ سب تقریرِ خواب

(۲۰)

نظر آتی نہیں جب ان میں اثر کی صورت
فائدہ کیا جو ہوئے اشکِ گہر کی صورت

خانۂ دل کو کیا عشقِ بتاں نے برباد
کیا سے کیا ہو گئی اللہ کے گھر کی صورت

حسن کے واسطے لازم ہے تلوّن شاید
دیکھیے روز بدلتی ہے قمر کی صورت

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلّی پائی
دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

(۲۱)

دلِ رنگیں بھی عجب دل ہے مگر قہر ہے یہ
خون ہو جاتا ہے مصروفِ تمنّا ہو کر

مرضِ عشق سے صحت نہیں ہوتی تو نہ ہو
کام ہی کیا ہے، کروں گا جسے اچھا ہو کر

عالم اس کے رخِ زیبا کا بیاں ہو کس سے؟
حسن حیرت میں ہے خود محوِ تماشا ہو کر

(۲۲)

بتوں کی مجھ کو یہ ترچھی نظر نہیں منظور
خرابیٔ دل و جان و جگر نہیں منظور

وہ ٹالتے ہیں عبث آج کل پہ وعدۂ وصل
جواب صاف نہ دے دیں اگر نہیں منظور

یہاں کے آنے میں تکلیف ہوگی ان کو کمال
اسی سے جذبۂ دل کا اثر نہیں منظور

وہ خود رقیبوں سے ملنا جو ترک کرتے ہیں
تو غیر مجھ کو بھی اب ان سے شر نہیں منظور

مرض ہزار بلا خیز ہو پسند ہے وہ
دوائیں لاکھ شفا ہو مگر نہیں منظور!

ہزار بے اثری ہو، رہے گا ضبط مجھے
فغاں ہیں لاکھ اثر ہو مگر نہیں منظور

نہ ہو عروج، نہ ہو لبِ فروغ ہوں، تو رہیں
پہ سرکشی تو بسانِ شرر نہیں منظور

قبول سایۂ دیوارِ یار میں رہنا!
ہما کا سایہ مگر فرق پہ نہیں منظور

ہزار نوکِ سناں سینہ پر گوارا ہے
مگر یہ کاوشِ تیرِ نظر نہیں منظور

اُداس ہوتے ہو کیوں، بیٹھو پھر چلے جانا
تمہارا روکنا کچھ رات بھر نہیں منظور

جو گھر سے نکلا تو ظالم مرے دکھانے کو
اُدھر چلا ہے کہ جانا جدھر نہیں منظور

عدم کو جاتا ہوں، احباب دیکھ لیں آ کر
وہیں رہوں گا اب آنا ادھر نہیں منظور

ازل میں خالقِ برحق سے رُوح کا تھا یہ قول
بغیرِ عشق لباسِ بشر نہیں منظور

وہ دل پسند نہیں جس میں جائے درد نہ ہو
ہوائے غم نہ ہو جس میں وہ سر نہیں منظور

محلِّ امن یہی ہے کہ سب بھلائے رہیں
کسی کے دل میں مجھے اپنا گھر نہیں منظور

خیالِ وصلِ بتاں چھوڑ دو بس اے اکبر
تڑپنا روح کا آٹھوں پہر نہیں منظور

(۲۳)

مندرجہ ذیل غزل ۱۸۷۱ء یعنی پچیس سال کی عمر میں لکھی گئی تھی، مگر کسی وجہ سے دورِ دوم میں درج ہے۔

آ گیا وقتِ اجل اے شوقِ دنیا الوداع
الوداع اے حسرتِ دل اے تمنّا الوداع

الوداع اے ساقیِ مے خانۂ طولِ اَمل!
اے سرورِ بادۂ امیّد افزا الوداع

اے خمِ محرابِ ایوانِ خوشش آئین السّلام
اے شکوہِ رفعتِ قصرِ معلّیٰ الوداع

الوداع اے مسند و فرش و قبا و پیرہن
اے حریر و اطلس و کمخواب و دیبا الوداع

الوداع اے رنگِ وحشت، الوداع اے فرطِ شوق
رخصت اے جوشِ جنوں اے سیرِ صحرا الوداع

الوداع اے جلوۂ نیرنگیِ حسنِ بتاں
اے خیالِ عارض و زلفِ چلیپا الوداع

الوداع اے عالمِ نیرنگیٔ باغِ جہاں
اے نگاہِ دیدۂ محوِ تماشا الوداع

عازمِ ملکِ عدم ہے اکبرِ خونیں جگر
الوداع اے عمر، اے بزمِ احبّا الوداع

(۲۴)

ہوا پھر قیدیِ زلفِ دوتا دل!
بلا میں ہو گیا پھر مُبتلا دل!

نگاہیں، چتونیں، عشوے، کرشمے!
اُدھر اتنے ادھر تنہا مرا دل!

نہ چھوڑا آتشِ اُلفت نے پیچھا
جگر جلنے لگا، جب جل چکا دل!

لگاوٹ غیر سے، ہم سے رُکھائی
انھیں باتوں سے تجھ سے پھر گیا دل

یہ وقتِ نزع ہے، دم بھر تو ٹھہرو
نہ توڑو عاشقِ رنجور کا دل!

بڑے صدمے اٹھائے تم نے اکبر
بتوں کو اب نہ دو بہرِ خدا دل

(۲۵)

عہدِ طفلی سے ہے مذہب میں گرفتاریِ دل
ساتھ ساتھ اپنے بڑھائی ہے یہ بیماریِ دل

نئے انجام مبارک رہیں نوخیزوں کو
میں ہوں اور آرزوئے مرگ و وفاداریِ دل

ذلتِ اسلام میں الجھے ہوئے مدّت گزری
اب کہاں چھوڑتی ہے مجھ کو وفاداریِ دل

میں تو شیدائے رسولِ عربی ہوں اکبر
بخدا ہے بس انھیں کے لئے سرداریِ دل

(۲۶)

حاصلِ عمر سوا موت کے جب کچھ بھی نہیں
چار دن کیلئے یہ عیش و طرب کچھ بھی نہیں!

وجہ کیا تم سے کہوں، اس کی طبیعت ہی تو ہے
دل کو اک جوش ہے روتا ہوں سبب کچھ بھی نہیں

زندگی میں تو رہا کرتے تھے کیا کیا ساماں
قبر میں بعدِ فنا آئے تو اب کچھ بھی نہیں

نہ تو خلوت ہی میسر ہے، نہ کچھ لطف کی بات
کیوں بُلایا ہے مجھے آپ نے جب کچھ بھی نہیں

نہ وہ احباب، نہ وہ لوگ، نہ وہ شمع، نہ بزم
صبح دم وہ اثرِ جلسۂ شب کچھ بھی نہیں

کوئی اکبر سا بھی دیوانہ نظر آیا ہے کم
پہروں روتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں

(۲۷)

سنبھالیں دل کو کہ ہم حالتِ جگر دیکھیں
تمام آگ لگی ہے، کدھر کدھر دیکھیں!

کریں نہ لطف و کرم وہ تو کیا وفا نہ کروں
یہی سمجھ ہے تو اچھا، ستم بھی کر دیکھیں

یہ کہہ کے روح نے دل کو کیا سپرد اُن کے
کہ ہم تو جاتے ہیں، اب آپ اپنا گھر دیکھیں

تڑپ کے جان ابھی دوں کہ ہوں خجل اغیار
خدا کرے کہ مجھے بھی وہ اک نظر دیکھیں

کبھی تو بوسۂ سیبِ ذقن عنایت ہو
نہالِ عیش کو اک دن تو بار ور دیکھیں

(۲۸)

زُہّادِ خشک حُسنِ بتاں سے ہیں بے نصیب
آنکھیں خدا نے دی ہیں مگر دیکھتے نہیں

ہیں جن کے دیکھنے کو سمجھتا ہوں زندگی
اُن کا یہ حال ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں

تاثیرِ انتظار نے یہ حال کر دیا
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر دیکھتے نہیں

بے خوف دل کو کرتے ہو پامال اے بتو
یہ شوخیاں، خدا کا بھی گھر دیکھتے نہیں

ڈرتے ہو تو ڈالنے دو ذرا چشمِ شوق کو
دیکھیں گے کس طرح وہ ادھر دیکھتے نہیں

زخمی تری نظر سے بھی ہو، ضبط بھی کرے
اتنا ہم اپنے دل کا جگر دیکھتے نہیں

میری جو پوچھتے ہو تو دیتا ہوں اُن پہ جان
ان کا یہ حال ہے کہ اِدھر دیکھتے نہیں

ہے انقلاب حُسن کے عالم میں کس قدر
دو دن بھی ایک شکلِ قمر دیکھتے نہیں

اکبر نہ سینک شعلۂ حُسنِ بتاں پہ آنکھ
عاقل جو لوگ ہیں وہ اِدھر دیکھتے نہیں

(۲۹)

رقیبِ تیرہ باطن کو جگہ دے رکھی ہے دل میں
نہیں کچھ اور عیب اس کے سوا اس ماہِ کامل میں

نہ پوچھو وسعتِ اندیشۂ عشاقِ قامت کو
یہ وہ ہیں سو قیامت گم ہے انکے گوشۂ دل میں

بہت عاشق مگر صورت سے مجنوں بھی تو ہیں پیدا
بہت مجنوں مگر جلوہ تو ہو لیلیٰ کا محمل میں

زبانوں کو نہیں کھلنے کی طاقت بزم میں تیری
نگاہوں کو نہیں یارا کہ اٹھیں تیری محفل میں

بہت آسان ہے تشریح منطق کے نتیجوں کی
بہت مشکل ہے لیکن فرق کرنا حق و باطل میں

(۳۰)

سو جان سے محوِ رُخِ جاناں ہیں تو ہم ہیں
اس آئینہ خانہ میں جو حیراں ہیں تو ہم ہیں

گلگشت کریں، پھول چنیں، ان کو ہے کیا غم
آوارۂ صحرائے مغیلاں ہیں تو ہم ہیں

بھڑکی ہوئی ہے آتشِ گل اپنے ہی دم سے
سوزِ جگرِ بلبلِ نالاں ہیں تو ہم ہیں!

شور اپنے ہی جلوے کا ہے یہ دیر و حرم میں
مقصودِ دلِ گبر و مسلماں ہیں تو ہم ہیں

اے برق تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی
اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

دن رات رقیبوں پہ ہے صاحب کی عنایت
بس ایک غمِ ہجر میں نالاں ہیں تو ہم ہیں

(۳۱)

آ چکی بس مرے حصہ میں شبِ وصل اے دل
گردشِ چرخ میں ایسے مرے مقسوم نہیں

بعد مدّت کے جو تقریر بھی کی تم نے تو وہ
جس کے مطلب نہیں، معنی نہیں، مفہوم نہیں

کمرِ یار ہے باریکی سے غائب ہر چند
مگر اتنا تو کہوں گا کہ وہ معدوم نہیں

ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب
موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں

میرا احوال جو یاروں نے کہا کچھ اُن سے
ہنس کے فرمایا کہ ہوگا، مجھے معلوم نہیں

دم نکلتا ہے ہمارا خبر اُن کو نہیں کچھ — جان جاتی ہے ہماری، انھیں معلوم نہیں
سبب کہا میں نے کہ مرے حصہ میں آفت کے کبھی — ہنس کے فرمایا کہ ایسے ترے مقسوم نہیں
خوب کرتا ہوں رقیبوں کی بُرائی ان سے — مذہبِ عشق میں غیبت کہیں مذموم نہیں

(۳۲)

حرم کیا، دیر کیا، دونوں یہ ویراں ہوتے جاتے ہیں — تمہارے معتقد گبر و مسلماں ہوتے جاتے ہیں
الٹ سب سے، نظر نیچی، خرام آہستہ آہستہ — وہ مجھ کو دفن کرکے اب پشیماں ہوتے جاتے ہیں
سوا طفلی سے بھی ہیں بھولی باتیں اب جوانی میں — قیامت ہے کہ دن پر دن وہ ناداں ہوتے جاتے ہیں
کہاں سے لاؤں گا خونِ جگر اُن کے کھلانے کو — ہزاروں طرح کے غم دل کے مہماں ہوتے جاتے ہیں
خرابی خانۂ دلہائے عاشق کی ہے دورِ گردوں میں — جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ویراں ہوتے جاتے ہیں
بیاں میں کیا کروں دل کھول کر شوقِ شہادت کو — ابھی سے آپ تو شمشیرِ عُریاں ہوتے جاتے ہیں
غضب کی یاد میں عیسیٰ رہا ہاں واللہ غم کو بھی — غرض قائل تمہارے ہم تو اے جاں ہوتے جاتے ہیں
اِدھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی — اُدھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

(۳۳)

غم ہے اتنا کہ دلِ زار پہ قابو بھی نہیں — ضبط یہ ہے کہ کہیں آنکھ میں آنسو بھی نہیں
کیا مرے عہد میں بدلی ہے گلستاں کی ہوا — رنگ کیسا کہ کسی پھول میں خوشبو بھی نہیں

(۳۴)

بتلائیں تحصیل کرنا تاثیرِ الفت کی دکھاتے ہیں — حنا کی طرح پس پس کے ہیں تب ہم رنگ لاتے ہیں
فدا سو جان سے ہوتا ہوں پروانوں کی ہمت پہ — جلے جاتے ہیں لیکن شمع سے پہلے ہی جاتے ہیں
کھلایا غم، پلایا خونِ دل، مہماں نوازی کی — ترے احسان مند اے چرخ ہم دنیا سے جاتے ہیں
خودی و بےخودی دونوں میں عکسِ صورتِ جاناں — اُسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں پاتے ہیں
سحر کو در پہ جاتا ہوں تو فرماتے ہیں اندر سے — ابھی سو کر اُٹھے ہیں، ہاتھ منہ دھوتے ہیں آتے ہیں

(۳۵)

چرخ نے برہم کیا جس کو، وہ صحبت خوب تھی — مٹ گئی جو قسمتِ بد سے، وہ رنگت خوب تھی
صحبتِ باہم ہیں تو اب روز رہتا ہے فساد — ہم سے اُن سے دور کی صاحب سلامت خوب تھی
مار ڈالا رنجِ تنہائی نے غربت میں ہمیں — اب خیال آیا کہ یاروں ہی کی صحبت خوب تھی
جان دی شیریں نے اس پر اُس پہ پہلے مر گئی — عشق میں فرہاد و مجنوں کی بھی قسمت خوب تھی

(۳۶)

غم نہیں اس کا جو شہرت ہو گئی — ہو گئی، اب تو محبت ہو گئی
اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز — مل گئے صاحب سلامت ہو گئی
ہائے کیا دلکش ہے اس کی چشمِ مست — آنکھ ملتے ہی محبت ہو گئی
چودھواں سال اُن کو ہے نامِ خدا — عمر آفت تھی، قیامت ہو گئی
ناز سے اس نے جو دیکھا شیخ کو — ان کی دینداری ہی رخصت ہو گئی

(۳۷)

خدا کا گھر بنانا ہے تو نقشہ لے کسی دل کا — یہ دیواروں کی کیا تجویز ہے زاہد، یہ چھت کیسی
یہ کارِ عاشقی ہے، دل جدھر لے جائے جا اکبر — یہ بحثیں اس میں کیا ہیں، مشورہ کیا، مصلحت کیسی

(۳۸)

تمہیں سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی ! — نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی
جہاں دل دُکھا بس نکل آئے آنسو — بگاڑی محبت نے عادت کچھ ایسی
حیا کی نگاہوں نے مارا ہے مجھ کو — نہیں چتونوں کی شرارت کچھ ایسی
گرے میری نظروں سے خوبانِ عالم — پسند آ گئی تیری صورت کچھ ایسی
میں رونے لگا حالِ دل کہتے کہتے — یکایک بھر آئی طبیعت کچھ ایسی
یہ غیروں نے اب ان کو برہم کیا ہے — نہ تھی ورنہ رنجش کی صورت کچھ ایسی
بسر کیوں نہ ہو عشقِ خوباں میں اکبر — خدا ہی نے دی ہے طبیعت کچھ ایسی

(۳۹)

یہ غزل بھی ۱۸۷۱ء یعنی پچیس سال عمر کی ہے مگر دورِ دوم میں درج ہے۔

حسینوں کے گلے سے لگتی ہے زنجیر سونے کی — نظر آتی ہے کیا چمکی ہوئی تقدیر سونے کی
نہ دل آتا ہے قابو میں نہ نیند آتی ہے آنکھوں میں — شبِ فرقت میں کیوں کر بن پڑے تدبیر سونے کی
یہاں بیداریوں سے خونِ دل آنکھوں میں آتا ہے — گلابی کرتی ہے آنکھوں کو واں تاثیر سونے کی
بہت بے چین ہوں، نیند آ رہی ہے، رات جاتی ہے — خدا کے واسطے جلد اب کرو تدبیر سونے کی
یہ زر وہ چیز ہے جو ہر جگہ ہے باعثِ شوکت — سُنی ہے عالمِ بالا میں بھی تعمیر سونے کی
ضرورت کیا ہے رکنے کی مرے دل سے نکلتا رہ — ہوس مجھ کو نہیں اے نالۂ شب گیر سونے کی
چھپر کھٹ یاں جو سونے کی بنائی اس سے کیا حاصل — کرو اے غافلو کچھ قبر میں تدبیر سونے کی

(۴۰)

نظرِ لطف و کرمِ یار کی اب وہ نہ رہی — پہلے اک بات جو تھی پیار کی، اب وہ نہ رہی
ناامیدی سی ہوئی دیکھ کے غیروں کا ہجوم — آرزو تیرے طلب گار کی اب وہ نہ رہی
وہ لگاوٹ تھی فقط دل کے لبھانے کے لئے — مہربانی بتِ عیار کی اب وہ نہ رہی

(۴۱)

یہ دردِ دل بھی نہ تھا، سوزشِ جگر بھی نہ تھی — ہاں آفتوں کی تو اُلفت میں کچھ خبر بھی نہ تھی
زمانہ سازی ہے اب یہ کہ منتظر تھا میں — ہمارے آنے کی تم کو تو کچھ خبر بھی نہ تھی
فلک نے کیوں شبِ فرقت مجھے ہلاک کیا — جمالِ یار نہیں تھا تو کیا سحر بھی نہ تھی
تمہارے دل کی نزاکت پہ اس کو رحم آیا — نہیں تو آہ مری ایسی بے اثر بھی نہ تھی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسمِ حسنِ بتاں — دہن کو سمجھے تھے معدوم، واں کمر بھی نہ تھی
جو آپ ہوتے ہیں منکر تو خیر میں جھوٹا — مرا جگر بھی نہ تھا، آپ کی نظر بھی نہ تھی
لپٹ گئے وہ گلے سے مرے تو حیرت کیا — وہ سنگ دل بھی نہ تھے، آہ بے اثر بھی نہ تھی
نگاہِ قہر سے دیکھا، یہی غنیمت ہے — مجھے تو آپ سے امید اس قدر بھی نہ تھی
شہیدِ جلوۂ مستانہ ہو گیا شبِ وصل — خوشی نصیب میں عاشق کے رات بھر بھی نہ تھی

(۴۲)

تیری نظروں سے ہماری جب نظر ملتی نہ تھی — ہم کو ایسی لذتِ دردِ جگر ملتی نہ تھی
ہر گلی کوچہ میں چرچا میری بیماری کا تھا — کیا کسی سے آپ کو میری خبر ملتی نہ تھی
وہ بھی کیا دن تھے تری شرم و حیا کے لے پری — آئینہ میں چشمِ جوہر سے نظر ملتی نہ تھی

(۴۳)

میں اپنی آہ کئے جاؤں، واں اثر نہ سہی — مجھے تو بے خبری ہے، انہیں خبر نہ سہی
یہ بے حجاب سرِ شام بام پر آنا! — حیا بھی تو کوئی شے ہے، کسی کا ڈر نہ سہی
اثر وہی ہے محبت کا، گو ہے ضبط مجھے — جگر میں درد تو رہتا ہے، چشمِ تر نہ سہی
نکال لینے دے اے چرخ حوصلے دل کے — شباب تک تو رہے عیش، عمر بھر نہ سہی
خدا کے واسطے تشریف لائیں آج ضرور — رہیں وہ دو ہی گھڑی پاس، رات بھر نہ سہی
حسین جتنے ہیں خواہاں ہیں سب ترے لے دل — بس ایک اُن کی توجہ نہیں اگر نہ سہی
یہ سوچ کیا ہے تجھے، رنج کا ہے کون محل؟ — تمام شہر پڑا ہے، اِک اُن کا گھر نہ سہی

(۴۴)

یہ اشعار یعنی چھبیس سال عمر کی غزل ہے۔ مگر دَورِ دوم میں درج ہے۔

نہ خود رہے نہ حکومت رہی مسلماں کی — کہانی ہو گئی وہ سلطنت پرستاں کی
اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر — خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی
خزاں میں بلبل و گل کا نشان تک نہ رہا — ہوا بدل گئی دو روز میں گلستاں کی
جماتی ہے لبِ نازک پہ اُن کے رنگ اپنا — یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سرخیٔ پاں کی
نگاہِ نازِ بتاں سے خدا بچائے ہمیں — یہ وہ نظر ہے کہ رہزن ہے دین و ایماں کی
میں اپنی راست روی کو کبھی نہ چھوڑوں گا — حضور وضع کو سیدھی بنائیں یا بانکی!
طریقِ عشق میں ہے بے خودی کو منصبِ خضر — کہ رہنمائی یہ کرتی ہے کوئے جاناں کی
قریب بت کافر کے آ گیا ہوں میں — نظر نہیں ہے خرابی پہ دین و ایماں کی
عجب ہے مجھ کو وہ کیوں شرم سے نہیں جھکتیں — جو گردنیں متحمّل ہیں بارِ احساں کی
غذا لئے خونِ جگر عاشقوں کو کافی ہے — ہوس نہیں مجھے اے چرخ خوانِ الواں کی
ہمیں نہیں ہیں ہوا خواہ اس چمن میں ترے — صبا بھی اک متوسّل ہے تیرے داماں کی
نہیں ہے سیب کی خواہش پئے علاجِ دماغ — یہ آرزو ہے کہ بو سونگھئے زنخداں کی
عجیب رنگ نظر آیا کوئے قاتل میں! — (ق) کسی کو دل کی ہے پروا نہ فکر ہے جاں کی
کوئی ہے سینہ سپر تیغِ ناز کے آگے — کسی کی روح نشانہ ہے تیرِ مژگاں کی
نہیں ہے ظلمتِ اعمال کا کچھ اندیشہ — کہ روشنی ہے مرے دل میں نورِ ایماں کی
وہ پونچھیں آنسو مرے آ کے اپنے دامن سے — ہے قسمت ایسی کہاں میری چشمِ گریاں کی
وہ چشم ہوں کہ جو ہے محوِ جلوۂ توحید — وہ دل ہوں جس میں تجلّی ہے نورِ عرفاں کی
وہ حال ہوں کہ بیاں جس کا دل دکھاتا ہے — وہ شکل ہوں کہ نشانی ہے دردِ پنہاں کی
وہ ذرّہ ہوں کہ بیاباں ہے گردشِ [illegible] — وہ قطرہ ہوں کہ حقیقت نہ سمجھے طوفاں کی
وہ درد ہوں جو پیامِ اجل ہے دل کے لئے — تپش وہ ہوں کہ جو بجلی ہے خرمنِ جاں کی
سکوت کیوں نہ ہو مُہرِ لبِ سخن اکبر — زمانہ میں نہ رہی قدر اب سخنداں کی

(۴۵)

ہو گیا بدر ہلال، اس کا سبب روشن ہے — روز گھستا تھا ترے در پہ جبیں تھوڑی سی
منزلِ گور میں کیا خاک ملے گا آرام — خو بُری پینے کی وہیں اور زمیں تھوڑی سی
آپ کو غیر کی راحت کا مبارک ہو خیال — خیر تکلیف اٹھا لیں گے ہمیں تھوڑی سی

(۴۶)

طلسم کالبد میں ہے مقیّد روحِ انساں کی — نہیں اربع عناصر، چار دیواری ہے زنداں کی
اسے سودا لئے گیسو ہو گیا جس نے تجھے دیکھا — پریشانی مری تصویر ہے زلفِ پریشاں کی
نہیں کچھ رنج اس ظلمت کدہ میں بے فروغی کا — تجلّی پیشِ چشم اپنے ہے شمعِ نورِ ایماں کی
صبا سے کیوں نہ رو رو کر کہوں میں حالِ دل اپنا — یہی قاصد ہوا کرتی ہے اکثر کوئے جاناں کی
وہ تھا اک وقت جب سیرِ چمن میں پھول چنتے تھے — زمانہ ایک یہ ہے خاک اڑاتے ہیں بیاباں کی
پھر آئی فصلِ گُل پھر جوشِ سودا ہو گیا مجھ کو — اڑائیں دھجیاں دستِ جنوں نے پھر گریباں کی
وہی میں ہوں کہ غیروں کو وہاں آنے نہ دیتا تھا — وہی میں ہوں کہ پہروں منتیں کرتا ہوں درباں کی

(۴۷)

تمام حسرتیں پیری میں ہو گئیں رخصت! — بس ایک رہ گئی مرنے کی آرزو باقی
جو ذبح کرنا ہے یہ کھول دے مرے صیاد — کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی!
ہمارے شہر پہ یا رب یہ کیا پڑی آفت — نہ خوبرو رہے باقی نہ خوشگلو باقی

(۴۸)

پروانہ جل کے خاک ہوا، شمع رو چکی — تاثیرِ حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی
دنیا میں کون خانۂ دل کی کرے گا قدر — آبادی اس کی ایسے خرابے میں ہو چکی
بیگانہ وار رہتی ہے اب کیوں نگاہِ یار — دونوں جہان سے بھی تو یہ مجھ کو کھو چکی
اب جانِ ناتواں بھی طبیعت کی نذر ہے — ایمان و دل تو پہلے ہی الفت میں کھو چکی
تھک تھک گئی زبان دمِ شرحِ دردِ دل — یہ داستاں مگر نہ کبھی دوستو چکی
اکبر عروسِ دہر سے چشمِ وفا نہ رکھ — دارا و جم کی جب نہ ہوئی تیری ہو چکی

(۴۹)

خفا ہو بے سبب مجھ سے، کہو میری خطا کیا ہے — چھوا بھی زلفِ مشکیں کو تو آفت کیا، بلا کیا ہے
قیامت ہے طبیعت آ گئی اس آفتِ جاں پر — جسے اتنا نہیں معلوم الفت کیا، وفا کیا ہے
انہیں بھی جوشِ الفت ہو تو لطف اٹھے محبت کا — ہمیں دن رات اگر تڑپے تو پھر اس میں مزا کیا ہے
مصیبت عینِ راحت ہے اگر ہو عاشقِ صادق — کوئی پروانے سے پوچھے کہ جلنے میں مزا کیا ہے
کوئی دن کا ہوں مہماں، آ گئی ہے جان ہونٹوں پر — وہی خود دیکھ لیں آ کر کہ اب مجھ میں رہا کیا ہے
طبیبوں سے میں کیا پوچھوں علاجِ دردِ دل اپنا — مرض جب زندگی خود ہو تو پھر اس کی دوا کیا ہے
سنبھالا دل کو اکبر ہجر میں روکو طبیعت کو — یہ رونا، یہ تڑپنا، خیر ہے، تم کو ہوا کیا ہے؟

(۵۰)

آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے! — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے
شوقِ پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اُگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
جو زمیں کوچۂ قاتل میں نکلتی ہے نئی — وقف وہ بہرِ مزارِ شہدا ہوتی ہے
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے — جان کیوں کر ہدفِ تیرِ قضا ہوتی ہے
نزع کا وقت برا وقت ہے خالق کی پناہ (ق) — ہے وہ ساعت کہ قیامت سے سوا ہوتی ہے
روح تو ایک طرف ہوتی ہے رخصت تن سے — آرزو ایک طرف دل سے جدا ہوتی ہے
خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل — پر کروں کیا، یونہیں تسکین ذرا ہوتی ہے
روندتے پھرتے ہیں وہ مجمعِ اغیار کے ساتھ — خوب توقیرِ مزارِ شہدا ہوتی ہے
مرغِ بسمل کی طرح لوٹ گیا دل میرا — نگہِ ناز کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے
نالہ کر لینے دیں، للہ نہ چھیڑیں احباب — ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے
جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں — روح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے
ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبر — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

(۵۱)

اثر دکھلانے پہ یہ جذبِ دل جو آتا ہے! — کنوئیں سے حضرت یوسفؑ کو کھینچ لاتا ہے
فلک جو روز نیا داغ اک دکھاتا ہے — ہمارے حوصلۂ دل کو آزماتا ہے
کبھی جو دعویٔ منصور میں شک آتا ہے — خیالِ یار مجھے آئینہ دکھاتا ہے
وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو — وہ حال ہوں کہ جسے سُن کے وجد آتا ہے
جو بے خودی میں مجھے چھوڑ کر وہ جاتے ہیں — تو میرے حال پہ رونے کو ہوش آتا ہے
الٰہی خیر ہو اس بت کے نازِ بے جا کی — دلِ غریب کو میرے بہت ستاتا ہے
زیادہ جان سے کیونکر نہ رکھوں دل کو عزیز — یہ آئینہ تری صورت مجھے دکھاتا ہے
وہ دو ہی ہاتھ ہیں سمجھے کہ آرزو نکلی — دہانِ زخم اسی پر تو مسکراتا ہے
ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمہاری یاد — کبھی تمہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے؟

نہ جانے کا تو نہیں جانتے بہانہ کچھ　　ہزار حیلہ نہ آنے کا تم کو آتا ہے
وہ مے کدہ ہے ہمارا کہ جس میں مستوں سے　　ہزار ساغرِ جم روز ٹوٹ جاتا ہے
خدا پناہ میں رکھے کشاکشِ غم سے　　اسی سے تارِ نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے
مصائبِ شبِ فرقت اٹھا چکا ہوں میں　　عذابِ گور سے واعظ کسے ڈراتا ہے
نہ پوچھیے ستم جوششِ حسرتِ دیدار　　یہ جانِ زار کو آنکھوں میں کھینچ لاتا ہے
دوئی کا دخل نہیں بزمِ وصل میں منظور　　وگرنہ آپ میں آنا تو مجھ کو آتا ہے!
فنا کا خوف کچھ اہلِ حیات ہی کو نہیں　　ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے
مقامِ شکر ہے غافل مصیبتِ دُنیا　　اسی بہانہ سے اللہ یاد آتا ہے
خدا کے واسطے یادِ خدا کرا ے اکبر　　بتوں کے عشق میں جاں اپنی کیوں گنواتا ہے

(۵۲)

کیا پوچھتے ہو مجھ سے، پہلو میں تیرے کیا ہے　　اب تو نہیں ہے کچھ بھی، دل تھا، سو کھو گیا ہے
پایا عجیب عالم قاتل تری گلی میں!　　ہر زخم یاں ہے مرہم، ہر درد یاں دوا ہے
مجھ زار و ناتواں کا رہتا ہے میلِ خاطر　　سختیِ دلِ تمہاری ہم سنگ کہربا ہے
برسوں کا چھوڑتی ہے دم بھر میں ساتھ ظالم　　کہتے ہیں عمر جس کو معشوق بے وفا ہے
گنجینۂ محبت وحشت میں کیا ہو خالی　　داغِ جنوں کا سکہ سرمایۂ وفا ہے
سر سر نے لاکھ چاہا اٹھا نہ اس گلی سے　　اب تک غبار اپنا خاکِ رہ وفا ہے
رنگیں تری ادا نے، دل خوں کیا چمن کا　　جو گل ہے داغِ دل ہے، جو برگ ہے حنا ہے
ہو جس طرف طبیعت، لازم ہے شوق کامل　　ہر بات میں اثر ہے، ہر رنگ میں مزا ہے
ایسا مٹا دیا ہے الفت میں دل کو میں نے　　رنگِ رخِ تمنا گردِ رہِ فنا ہے
کل کی تھی بے خودی میں دم بھر کو سیر دل کی　　کس لطف کی ہوا ہے، کیا باغ خوش فضا ہے
کیا شرحِ آرزو ہو، پروا ہو زبان اپنی　　افسانۂ دو عالم آغازِ مدعا ہے
اظہارِ شوق میں ہے رسوائیِ محبت　　ہے حرفِ آبرو بھی جو حرفِ مدعا ہے
اہلِ عدم نہ پوچھو کچھ ہم سے حالِ دُنیا　　رہ آئے ہم بھی دو دن، اک میہماں سرا ہے
کیوں کر نہ شعرِ اکبر آئے پسند سب کو　　یہ رنگ ہی نیا ہے، گو چہ ہی دوسرا ہے

(۵۳)

بس گئی ہے دل میں وہ زلفِ دوتا کیا کیجیے　　جان آفت میں ہوئی ہے مبتلا کیا کیجیے
نزع میں پوچھا جو اکبر سے کہ کیوں دیتا ہے جان　　آہِ سرد اک بھر کے وہ کہنے لگا، کیا کیجیے

(۵۴)

یہ غزل مندرجہ بالا بحر اور ردیف و قافیہ میں بہت عرصے بعد کہی گئی تھی۔

دم لبوں پر آگیا ہے، اب دوا کا ذکر کیا　　اک بُتِ کافر کی الفت ہے، دُعا کیا کیجیے!
جس کے صدمے سے بمشکل کل بچی تھی میری جان　　پھر وہی درد آج سینہ میں اٹھا، کیا کیجیے

(۵۵)

وہ اٹھے تو بہت گھر سے اپنے، مرے گھر میں مگر کبھی آ نہ سکے
وہ نسیمِ مراد چلے بھی تو کیا کہ جو غنچۂ دل کو کھلا نہ سکے
ترے عشق سے باز بھی آ نہ سکے، ترے ظلم و ستم بھی اٹھا نہ سکے
جو نصیب میں لکھی ہوئی تھی قضا، کسی طور سے جان بچا نہ سکے
شب و روز جو رہتے تھے پیشِ نظر، بڑے لطف سے ہوتی تھی جن میں بسر
یہ خبر نہیں جا کے رہے وہ کدھر کہ ہم ان کا نشان بھی نہ پا سکے!
کبھی جن کے خیال میں ہجر کی شب مجھے نیند نہ آتی تھی، ہائے غضب
وہ جو روئے بھی آ کے مزار پر اب، مجھے خوابِ لحد سے جگا نہ سکے
یہ مرے ہی نہ آنے کا سبب تھا اثر کہ رقیبوں سے دبتے ہو آٹھ پہر
مرے حال پہ چشمِ کرم جو رہے، کوئی آپ سے آنکھ ملا نہ سکے
کیا جذبۂ عشق نے میرے اثر، رہی غیرتِ حُسن پہ ان کی نظر
پسِ پردہ صدا تو سنائی مجھے مگر اپنا جمال دکھا نہ سکے
رہا شہرۂ عشق کا باں مجھے ڈر، انہیں اپنے پرائے کا خوف و خطر
رہیں دل ہی میں حسرتیں دونوں طرف، جو میں جا نہ سکا تو وہ آ نہ سکے
وہی دل کی تڑپ، وہی دردِ جگر، ہوا تو بہ عشق کا کچھ نہ اثر
تری شکل جو آنکھوں میں پھرتی رہی، تری یاد بھی دل سے بھلا نہ سکے
تری بانکی ادا ہے وہ ہوش ربا کہ ہوں خضر و مسیح بھی جس پہ فدا
وہ فریب بھرا ہے نظر میں تری کہ فرشتہ بھی دل کو بچا نہ سکے
ہے خدا کی جناب میں صبح و مسا یہی اکبرِ خستہ جگر کی دُعا
کہ ہمارے سوا بُتِ ہوش ربا کوئی سینہ سے تجھ کو لگا نہ سکے

(۵۶)

تری زلفوں میں دل الجھا ہوا ہے　　بلا کے پیچ میں آیا ہوا ہے
نہ کیونکر بوئے خوں نامے سے آئے　　اُسی جلاد کا لکھا ہوا ہے
چلے دنیا سے جس کی یاد میں ہم　　غضب ہے، وہ ہمیں بھولا ہوا ہے
کہوں کیا حال اگلی عشرتوں کا!　　وہ تھا اک خواب جو بھولا ہوا ہے
جفا ہو یا وفا، ہم سب میں خوش ہیں　　کریں کیا، اب تو دل اٹکا ہوا ہے
کھلی ہے عشق ہی سے حُسن کی قدر　　ہمیں سے آپ کا شہرہ ہوا ہے
بتوں پر رہتی ہے مائل ہمیشہ　　طبیعت کو خدایا کیا ہوا ہے؟
پریشاں رہتے ہو دن رات اکبر　　یہ کس کی زُلف کا سودا ہوا ہے؟

(۵۷)

دل کو غفلت نے کدورت میں چھپا رکھا ہے　　بخل نے زر کو تہِ خاک دبا رکھا ہے
شور کیوں گبر و مسلماں نے مچا رکھا ہے　　دیر میں کچھ بھی نہیں، کعبہ میں کیا رکھا ہے
بے زری میں کوئی معشوق تو پہلو میں کہاں　　داغِ افلاس کو سینے سے لگا رکھا ہے
آپ کو پردہ نشینی ہی جو آئی ہے پسند　　مجھ کو کیوں مفت میں دیوانہ بنا رکھا ہے
جوششِ فصلِ بہاری ہے کہ ہنگامۂ حشر　　بلبلوں نے تو غضب شور مچا رکھا ہے
دیکھیے صبحِ فلک بدلے وہ کیا کیا پہلو　　فتنوں سے اسے یاں آج سُلا رکھا ہے
آپ کے شہرۂ رحمت نے تو ڈھایا ہے غضب　　ایک عالم کو گنہگار بنا رکھا ہے
آرزوِ مرگ کی اکبر نہ کر اللہ سے ڈر　　تجھ سے عاصی کے لئے قبر میں کیا رکھا ہے

(۵۸)

کسی کی قسمت میں زہرِ غم ہے، کسی کو حاصل مئے طرب ہے
وہی بگاڑے، وہی بنائے، اسی کی قدرت کا کھیل سب ہے
نظر جو آئے وہ آفتِ جاں تو دل کو کیوں کر بچائے انساں
ادا ہے بانکی، نگاہ ترچھی، ستم ہے عشوہ، حیا غضب ہے
جلا چکی آتشِ محبت تمام میرے دل و جگر کو
تمہیں نہیں ہے یقین اب تک، یہی تو اے میری جاں غضب ہے

گزر گیا ہے جو عہدِ عشرت نہ کر تو ناداں پھر اس کی حسرت
قیام اسی کا سمجھ غنیمت جو وقت پیشِ نگاہ اب ہے
یہ ان کی جتنی نگاوٹیں ہیں، یہ ظاہری سب بناوٹیں ہیں
یہ جی لُبھانے کی اک ادا ہے، یہ دل کے لینے کا ایک ڈھب ہے
دلاتے ہیں نزع میں جو پیہم خدا کی یاد آ کے یار و ہمدم
بھلا میں بھولوں گا اس کو کیونکر، وہ میرا مالک ہے، میرا رب ہے
یہاں بھی آرام پایئے گا، کہاں اب اس وقت جایئے گا
اندھیرا چھایا ہے، ابر طاری ہے، مینہ برستا ہے، وقتِ شب ہے
دعا ہے اکبرؔ یہ اپنی ہر دم، محمد ہیں نکلے زباں سے پیہم
محمدؐ اپنا رسول برحق، خدا ہے برتر ہمارا رب ہے

(۵۹)

سنتا ہوں کہ تاثیرِ محبت میں بھی کچھ ہے
کیوں کر نہ کہوں، ان کی طبیعت میں بھی کچھ ہے

تسخیرِ بتاں ہوتی ہے گو نقش و دم سے
تاثیر مگر دل کی محبت میں بھی کچھ ہے

بے چین ہوئے سُن کے مرے شوق کا قصہ
صد شکر، مزہ اُن کی طبیعت میں بھی کچھ ہے

جب کہتا ہوں اُن سے کہ مرے دل میں ہے حسرت
کس ناز سے کہتے ہیں کہ حسرت میں بھی کچھ ہے

واعظ میں غضب ہی کا سزاوار نہیں ہوں
حصہ مرا گنجینۂ رحمت میں بھی کچھ ہے

رندوں میں تو ہے لطفِ مے و ساقی و مطرب
واعظ یہ بتا تو تری صحبت میں بھی کچھ ہے؟

وہ گو جیبِ جاناں کے مزے ایک نہ پائے
ہم پہلے سمجھتے تھے کہ جنت میں بھی کچھ ہے

بگڑے ہوئے تیور ہی سے ثابت نہیں رنجش
ان روزوں تو فرق ان کی طبیعت میں بھی کچھ ہے

فرماتے ہیں وہ سن کے مرے رونے کا احوال
یہ بات تو داخل تری عادت میں بھی کچھ ہے

گو رازِ محبت کا چھپانا ہے بہت خوب
لیکن بخدا لطف تو شہرت میں بھی کچھ ہے

افسانۂ حسرت مرا سن کے وہ بولے
ہے سب یہ زبانی کہ طبیعت میں بھی کچھ ہے

خوش وصل سے کوئی، کوئی نقّارہ سے دل شاد
اے گردشِ گردوں مری قسمت میں بھی کچھ ہے؟

بالائے زمیں پاس سکندر کے تھا سب کچھ
اب جا کے ذرا دیکھئے تربت میں بھی کچھ ہے

تم آ کے نہ دو، یاد بھی کیا کرنے نہ دو گے
دخل آپ کو بندے کی طبیعت میں بھی کچھ ہے

(۶۰)

قیدِ احساں سے تری اے فلک آزاد رہے
بے کسی کا ہو بھلا، بے وطنی شاد رہے

مے گلگوں سے چھلکتے مست ہوتے، شاد رہے
ساقیا خانۂ احساں ترا آباد رہے

اجل آتی ہے غمِ ہجر میں اللہ رے نصیب
ملک الموت کو کس طرح یہ ہم یاد رہے

ہے یہ حسرت تری حسرت کے سوا سب ہوں فنا
دونوں عالم نہ رہیں، شہرِ دل آباد رہے

حشر برپا جو ہوا بھول گیا ایک کو ایک
ایسی آفت میں بھلا کون کسے یاد رہے

گوشۂ خاطرِ عالی میں جو پائے نہ جگہ
کہیے پھر جا کے کہاں عاشقِ ناشاد رہے

نزع میں نام لیا قسمیں مذکور آیا
کون سی جا تھی جہاں وہ نہ مجھے یاد رہے

(۶۱)

زخمی کیا سینہ کو، نظر ہے کہ غضب ہے
خوں ہو کے بھی قائم ہے، جگر ہے کہ غضب ہے

وہ کہتے ہیں مے پینے کو تو پی نہیں سکتا
اے شیخ یہ اللہ کا ڈر ہے کہ غضب ہے

گزری ہے شبِ وصل کہ آئی ہے مری موت
وہ ہوتے ہیں رخصت، یہ سحر ہے کہ غضب ہے

لپٹا کے مجھے سینے سے وہ آج یہ بولے
اکبرؔ تری آہوں کا اثر ہے کہ غضب ہے

(۶۲)

دل شکستہ ہوں مگر دل میں خدا کا نُور ہے
یہ وہ ویرانہ ہے روشن جس میں شمعِ طُور ہے

آپ کی پیاری ادا پہ دل نہ دیتا میں کبھی
بس یہی کہیے، قضا سے آدمی مجبور ہے

کون ایسا ہے نہیں ہے موت کی جس کو خبر
پھر جو غفلت ہے تو یہ دنیا کا اک دستور ہے

کُنج ہے بلبل کی زلف الجھی میں عاشق ہو گیا
یہ نہ خوف آیا کہ وہ افعی ہے یہ زنبور ہے

شعر گوئی کی وکالت میں مجھے فرصت کہاں
یہ بھی اکبرؔ خاطرِ احباب گو رکھ پُور ہے

(۶۳)

کہوں کس سے قصۂ درد و غم، کوئی ہم نشیں ہے نہ یار ہے
جو انیس ہے تری یاد ہے، جو شفیق ہے دلِ زار ہے

تُو ہزار کرتا لگاوٹیں، میں کبھی نہ آتا فریب میں
مجھے پہلے اس کی خبر نہ تھی ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے

یہ نوید اوروں کو جا سنا، ہم اسیرِ دام ہیں اے صبا
ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر، ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے

جسے دورِ چرخ میں ہو خوشی تو ضرور ہے اسے رنج بھی
شبِ ہجر میں ہے جو دردِ سر، یہ تو وصل کا یہ خمار ہے

وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو یہ اور آفتیں ڈھا گئے
کہ حواس و ہوش و خرد ہے اب نہ شکیب و صبر و قرار ہے

مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال اکبرِؔ نوحہ گر
تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشقِ زار ہے

(مندرجہ ذیل غزل ۳۵ سال بعد لکھی گئی)

مری چشم کیوں نہ ہو خوں فشاں، نہ رہی وہ بزم نہ وہ سماں
نہ وہ طرزِ گردشِ چرخ ہے، نہ وہ رنگِ لیل و نہار ہے

جہاں کل تھا غلغلۂ طرب، وہاں ہائے آج ہے یہ غضب
کہیں اک مکان ہے گرا ہوا کہیں اک شکستہ مزار ہے

غم و یاس و حسرت و بے کسی کی ہوا کچھ ایسی ہے چل رہی
نہ دلوں میں اب وہ امنگ ہے، نہ طبیعتوں میں ابھار ہے

ہوئے مجھ پہ جو ستمِ فلک، کہوں کس سے اس کو کہاں تلک
نہ مصیبتوں کی ہے کوئی حد، نہ مرے غموں کا شمار ہے

مرا سینہ داغوں سے ہے بھرا، مرے دل کو دیکھئے تو ذرا
یہ شہیدِ عشق کی ہے لحد، پڑا جس پہ پھولوں کا ہار ہے

میں سمجھ گیا وہ ہیں بے وفا مگر ان کی راہ میں ہوں فدا
مجھے خاک میں وہ ملا چکے مگر اب بھی دل میں غبار ہے

(۶۴)

اب تو ہیں نامِ خدا آپ کے انداز نئے
نئے غمزے ہیں، نئے عشوے ہیں اور ناز نئے

ان سے ملنے کا نکل آتا ہے ہر شب اک طور
روز ہو جاتے ہیں سامانِ خدا ساز نئے

کل جو باتیں تھیں وہی ہوں یہ تکلف کیسا
آج کیا ہو گئے ہم اے بتِ طنّاز نئے؟

(۶۵)

یہ آج وجہ توقف ہے کیا اجل کے لیے
طبیب لکھتے ہیں نسخہ مرا جو کل کے لیے

یہ اضطراب، یہ بے چینیاں، یہ بے تابی
مجھے ہمیشہ ہے بجلی کو ایک پل کے لیے

ہوا مقامِ فنا میں، میں اپنا خود عاشق — سمجھ گیا، یہی موقع تھا اس محل کے لیے
جو دل میں دردِ محبت اٹھا تو ہم نے بھی — مزے تڑپنے کے پہلو بدل بدل کے لیے
نہیں ہے منزلِ ہستی میں فکرِ زادِ سفر — کہ آج کے لیے ہے صبر، امید کل کے لیے
خیالِ صورتِ جاناں کا شغل دل کو رہے — عجیب حسن ہے یہ چہرۂ عمل کے لیے
ہُوا ہوں خلق میں، جینے کو جھوٹے وعدوں پہ — زباں اُن کے دہن میں ہے آج کل کے لیے
میں گھر میں غیر کے کیا اُن سے حالِ دل کہتا — زباں ہی نہ کھلی عرضِ بے محل کے لیے

(۶۶)

میں کروں لاکھ ارادہ تو وہ کس کام کا ہے — بس بھروسہ مرے اللہ ترے نام کا ہے
طالبِ وصل ہُوا یہ، تو عجب کیا اس کا — حوصلہ ہی تو مری جاں دلِ ناکام کا ہے

(۶۷)

بار اب پہلو میں رکھنا دلِ ناکام کا ہے — خبر اپنی نہ ہو جس کو، وہ کسی کام کا ہے!
خط عبث لکھتے ہیں، آنا ہے تو آئیں وہ جلد — نزع میں ہوں، یہ محل نامہ و پیغام کا ہے!
شوق سے آنکھیں دکھاؤ مجھے کچھ رنج نہیں — شعبدہ یہ بھی تو اک گردشِ ایام کا ہے
دل کیا نذر جو میں نے تو وہ ہنس کر بولے — آپ رکھ چھوڑیے اس کو مرے کس کام کا ہے
دل مرا ہاتھ میں لے کر وہ یہ فرماتے ہیں — اس کو پامال کروں اور یہ کس کام کا ہے

(۶۸)

لگاوٹ کی ادا سے اُن کا کہنا، پان حاضر ہے
قیامت ہے، ستم ہے، دل فدا ہے، جان حاضر ہے
کہو جو چاہو سن لیں گے مگر مطلب نہ سمجھیں گے
طبیعت تو خدا جانے کہاں ہے، کان حاضر ہے
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں جن کو، اُن کا دو نشاں یارو
اسے میں کیا کروں گا، یہ جو سب سامان حاضر ہے
بٹھا کر غیر کی محفل میں مجھ کو، اُس نے فرمایا
سنو اکبر کی غزلیں دیکھو یہ مستان حاضر ہے

(۶۹)

اک بوسہ دیجیے مرا ایمان لیجیے — گو بت ہیں آپ بہرِ خدا مان لیجیے
دل لے کے کہتے ہیں، تری خاطر سے لے لیا — اُلٹا مجھی پہ رکھتے ہیں احسان، لیجیے!
غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا — مجھ سے کبیدہ ہو کے کہا، پان لیجیے
مرنا قبول ہے مگر الفت نہیں قبول — دل تو نہ دوں گا آپ کو میں، جان لیجیے
حاضر ہوا کروں گا میں اکثر حضور میں — آج اچھی طرح سے مجھے پہچان لیجیے

(۷۰)

اپنی ہستی جو حجابِ رُخِ جاناں نہ رہے
واں رہیں ہم کہ جہاں پھر کوئی ارماں نہ رہے
صورتِ یار جو سَو پردوں میں پنہاں نہ رہے
بحث پھر تم میں یہ اے گبر و مسلماں نہ رہے
سامنا جلوۂ معشوق کا اللہ اللہ!
ہے یہی وقت کہ بس آپ میں انساں نہ رہے
مانگتا ہوں جو دعا صبح کی کہتی ہے اجل
یہ بھی ممکن ہے، رہو تم، شبِ ہجراں نہ رہے
آپ ہی نے تو کیا ہے مجھے دیوانۂ عشق
آپ ہی کہتے ہیں اب آپ تو انساں نہ رہے
میں تو عشقِ بتِ ظالم سے نہ باز آؤں گا
عقل چھٹ جائے، جگر ٹکڑے ہو، ایماں نہ رہے
آئینہ کو ہے یہ حیرت کہ سکندر ہوئے خاک
ہوش پریوں کے اُڑے ہیں کہ سلیماں نہ رہے
چشمِ نرگس سے کوئی حال چمن کا پوچھے
دیکھتے دیکھتے کیا کیا گلِ خنداں نہ رہے
صبح تک ہجرِ صنم میں یہ دعا تھی اپنی
میں رہوں یا نہ رہوں یہ شبِ ہجراں نہ رہے
اُن کا یہ ناز کہ آ جائیں گے، جلدی کیا ہے
اپنا یہ حال کہ دم بھر کے بھی مہماں نہ رہے
منہ نہ موڑو ستمِ جورِ بتاں سے اکبر
بندگی کیسی اگر تابعِ فرماں نہ رہے

(۷۱)

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ — مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

(۷۲)

مصیبت عشق کی تنہا مجھی پہ کیا گزرتی ہے
تمھارے حسنِ عالمگیر پہ اک خلق مرتی ہے
خبر ملتی نہیں کچھ مجھ کو یارانِ گزشتہ کی
خدا جانے کہاں ہیں، کس طرح ہیں، کیا گزرتی ہے
مری آنکھوں میں تو اس کا گزر بھی ہو نہیں سکتا
یہ آنکھیں آپ کی ہیں، نیند جن میں چین کرتی ہے
محبت کا اثر ہے عاشق و معشوق پہ یکساں
جو مجنوں سر پٹکتا ہے تو لیلیٰ آہ کرتی ہے
اثر کچھ ہو چلا ہے سوزشِ الفت کا سینہ میں
الٰہی خیر ہو، دل کانپتا ہے، روح ڈرتی ہے
پریشاں رکھتی ہے دن رات، آ کر بے وفاؤں پہ
طبیعت آدمی کو کس قدر بے چین کرتی ہے

(۷۳)

کیا قہر ہے اجل مرے سر پہ کھڑی رہے
غیروں کی تم کو فکرِ عیادت پڑی رہے
اے شورِ حشر، شہرِ خموشاں کی لے خبر
اب کب تلک اُجاڑ یہ بستی پڑی رہے
جدت ہو فکر میں تو توارد کبھی نہ ہو
مضمون کیوں لڑیں جو طبیعت لڑی رہے

(۷۴)

ہے عشق میں ہر لحظہ ترقی مرے دل کی — ہر داغ بڑھاتا ہے تجلی مرے دل کی
کیا اور سے ممکن ہو تسلی مرے دل کی — جب آپ ہی نے کچھ نہ خبر لی مرے دل کی

رونا ہے جو فرقت میں بھی دیدۂ تر کا
طوفان میں آجائے گی کشتی مرے دل کی

مہمان ہے جس روز سے سینہ میں تری یاد
آباد ہے اُجڑی ہوئی بستی مرے دل کی

آخر کو یہ جلنے بھی لگا شعلۂ غم سے
فکر آپ کو ہوتی نہیں اب بھی مرے دل کی

یا اس کی خبر بھی نہیں لیتے کبھی اب تم
یا فکر تمھیں رہتی تھی کتنی مرے دل کی

نظروں سے تری گر کے ہوا عشق دوبالا
ہوتی ہے تنزل میں ترقی مرے دل کی

دکھلا کے جھلک اور بھی تڑپا گئے اس کو
کی واہ دوا آپ نے اچھی مرے دل کی

جب قولِ وفا ہار چکا میں تو پھر اب کیا
بیٹھے ہوئے ہیں آپ تو بازی مرے دل کی

باطن سے ہوں نظارگیِ جلوۂ جاناں
آئینۂ معنی ہے صفائی مرے دل کی

رنگینی میں، نرمی میں، صفائی میں، ضیا میں
ہے ایک سی خلقت ترے رُخ کی مرے دل کی

نابود ہوئے جل کے خیالاتِ دو عالم
اللہ رے ترے عشق میں گرمی مرے دل کی

سو جان سے کیوں کر نہ ہوں قربانِ تمنا
کرتی ہے بڑی قدر شناسی مرے دل کی

ملتا ہے مزا اُن کو مرے جوششِ جنوں کا
سرخوش انھیں کر دیتی ہے مستی مرے دل کی

یا ہجر تھا یا وصل میں اب ہو گئے بے خود
وہ خوبیِ قسمت تھی، یہ خوبی مرے دل کی

وہ ترچھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں
اس وقت میں ہو خیر الٰہی مرے دل کی

تسکین کے لیے رہتے تھے سینہ پہ جو ہر دم
اب ہے انھیں ہاتھوں سے خرابی مرے دل کی

کیوں مکتبِ غم میں سبقِ عشق نہ پڑھتا
تقدیر میں لکھی تھی خرابی مرے دل کی

کیا پوچھتے ہو عشق نے ڈھائی ہے مصیبت
اب روح بھی دیتی ہے دہائی مرے دل کی

کہنا تو بہت کچھ ہے مگر کیا کہوں اکبر
افسوس کہ سنتا نہیں کوئی مرے دل کی

(۷۵)

بے چین ہے دل سینہ میں مرا، رہ رہ کے تری یاد آتی ہے
وہ چشمِ سیہ جادو کی بھری، آنکھوں میں مرے پھر جاتی ہے

اے حسرتِ وصل، خدا کے لیے بے چین نہ کر اتنا مجھ کو
کیوں زخم بنی ہے دل میں مرے، کیوں رُوح کو یوں تڑپاتی ہے

تم اس کے جُدا ہو جانے کا اکبر نہ کرو کچھ رنج و الم
ہے جان سے پیاری کونسی شے، انساں سے یہی چھُٹ جاتی ہے

(۷۶)

ہوگا کیا، رنجش جو تجھ سے اے پری ہو جائے گی
جس سے دل لگ جائے گا، اک دل لگی ہو جائے گی

ٹال دیتے ہیں یہی کہہ کر مرے مطلب کی بات
آج پر کیا منحصر ہے، پھر کبھی ہو جائے گی

آئے گا آغوش میں میرے جو وہ رشکِ چمن
نکہتِ گُل کی طرح سے بے خودی ہو جائے گی

رُوح کو قالب میں آنے سے بڑا انکار تھا
یہ نہ سمجھی تھی کہ آخر دوستی ہو جائے گی

نزع میں ہوں اب بھی آجائیں وہ دم بھر کے لیے
اور تو کیا اک نگاہِ آخری ہو جائے گی

(۷۷)

جو اُس سروِ قد سے جدائی ہوئی ہے
قیامت مرے سر پہ آئی ہوئی ہے

ذرا دیکھنا پھیر اُنھیں چتونوں سے
یہ پیاری ادا دل کو بھائی ہوئی ہے

نہیں رُوئے رنگیں پہ زُلفوں کا جلوہ
گلستاں پہ بدلی یہ چھائی ہوئی ہے

کسی کا نہیں ہے گزر اس گلی میں
یہ قسمت سے اپنی رسائی ہوئی ہے

مرا سوزِ دل آپ کیا دیکھتے ہیں
یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے

نہ دیکھیں گے وہ اس طرف آنکھ اُٹھا کر
کچھ اور ان کے دل میں سمائی ہوئی ہے

دکھاتے نہ تھے آپ یوں مجھ کو آنکھیں
یہ شوخی کسی کی سکھائی ہوئی ہے

مکدر کیا غبار رقیبوں نے اُن کو
بڑی مشکلوں سے صفائی ہوئی ہے

جو چاہیں کریں بے وفائی وہ اکبر
طبیعت مری اُن پہ آئی ہوئی ہے

دورِ سوم

اندازاً چالیس سے پچاس سال عمر تک کی غزلیں

کہو، کرے گا حفاظت مری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ
تو ذرہ ذرۂ عالم ہے آشنا میرا

مری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

انھیں ہے عقل، جو محتاجِ غیر ہے ہر دم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا

غرور انھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خُدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

(۲)

دلِ مرا جس سے بہلتا، کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس
ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا

گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گُم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

(۳)

عنایت تخلیے میں، بزم میں نا آشنا ہونا
غضب ہیں یہ ادائیں، دم ہی بھر میں کیا سے کیا ہونا

بُتوں کے پہلے بندے تھے مِسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے با خدا ہونا

مرا محتاج ہونا تو مری حالت سے ظاہر ہے
مگر ہاں دیکھنا ہے آپ کا حاجت روا ہونا

جو دقت ہے، وہ یہ ہے دل نہیں ہے میرے کہنے میں
مجھے تسلیم ہے ارشادِ واعظ کا بجا ہونا

خدا بنتا تھا منصور اس لیے مشکل یہ پیش آئی
نہ کھنچتا دار پہ، نیابت اگر کہتا خدا ہونا

بچاتا ہے ہزاروں کفر سے اے واعظِ ناداں
بلائے دامِ گیسوئے بُتاں میں مبتلا ہونا

مجھے جوشِ طبیعت سے ہوا شوقِ گُنہ آخر
عجب کیا ناز سکھلائے اگر اُن کو خفا ہونا

صفاتِ حق تعالیٰ فہمِ منکر میں نہیں آتے
وہ کہتا ہے کہ گویا کچھ نہ ہونا ہے خدا ہونا

خدا اُن سے ملائے تو نہایت ہی خوش آئے گا
نیا عہدِ وفا بندھنا، گزشتہ کا گلا ہونا

طریقِ مغرب کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا

(۴)

دلیل خود بیں سے پوچھتی ہے کہ تم مسلّم مگر خدا کیا
دل اس کے عاشق سے کہہ رہا ہے کہ اس کے جیتے یہ ہوا کیا

نہ کچھ تکلف، نہ کچھ بناوٹ، جو بات تھی دل کی صاف کہہ دی
اگر وہ مانیں تو مہربانی۔ اگر نہ مانیں تو پھر گلا کیا!

کبھی لڑتا ہوں کفر سے میں، کبھی ہوں قربان بھولے پن پہ
خدا کے دیتا ہوں واسطے جب تو پوچھتا ہے وہ بت خدا کیا!

؎ بحذفِ نونِ آخریں۔ بطریقِ سغاذ جیسا کہ زمیں سے زمی ۱۲۔

(۵)

جو تمہارے لبِ جاں بخش کا شیدا ہوگا
اُٹھ بھی جائے گا جہاں سے تو مسیحا ہوگا

وہ تو موسیٰؑ ہُوا جو طالبِ دیدار ہُوا
پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا

قیس کا ذکر مرے شانِ جنوں کے آگے!
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

آرزو ہے مجھے اک شخص سے ملنے کی بہت
نام کیا لُوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

لعلِ لب کا ترے بوسہ تو میں لیتا ہوں مگر
ڈر یہ ہے خونِ جگر ہجر میں پینا ہوگا

(۶)

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا
میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

شانِ محبوبئ صانع کا نشاں رکھا ہے یہ
ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا

دین سے اتنا الگ حدِ فنا سے یوں قریب
اس قدر دلچسپ پھر کیوں رنگِ دنیا کر دیا

موت سے غفلت جوانی میں تو لذت دے گئی
ہاں مگر پیری میں اس نے مجھ کو رسوا کر دیا

کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں
ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا

بے تمہارے دیکھے اب دم بھر بھی چین آتا نہیں
سچ بتاؤ جانِ جاں، تم نے مجھے کیا کر دیا

سب کے سب باہر ہوئے تھے وہم و فکر و ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ، ہم نے پردا کر دیا

ہو طلب کامل تو بس نعمت اسی کا نام ہے
بھوک نے نانِ جویں کو من و سلویٰ کر دیا

یوسفِ معنی کے جلووں کو دکھا کر عشق نے
میری بیداری کو بھی خوابِ زلیخا کر دیا

شاہدِ بزمِ ازل نے اِک نگاہِ ناز سے
عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا

شورِ شیریں کا مزا رکھا سرِ فرہاد میں
قیس کو دیوانۂ اندازِ لیلیٰ کر دیا

گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع
رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پردا کر دیا

ذوقِ نظارہ سے جانوں کو ملایا خاک میں
گردشِ چشمِ بتاں سے حشر برپا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبرؔ اب تم سے کیا کہوں
اس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو مرے کیا کر دیا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترکِ خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

رنگ اڑانا اہلِ یورپ کا تو ہے اکبرؔ محال
مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

(۷)

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

(۸)

ارسطو سے نہ پوچھ اے ہمنشیں خاصیتِ اُلفت
مجھے معلوم ہے سن لے اثر مہلک، مزا اچھا

نقاب اُن کے رُخِ رنگیں سے اٹھا عین محفل میں
کھلایا گل یہ تو نے واہ اے بادِ صبا اچھا

ہٹایا زلف کو اُن کے رُخِ رنگیں سے گلشن میں
کھلایا گل یہ تو نے واہ اے بادِ صبا اچھا

دلا کر جھوٹی امیدیں، دلوں کو خون کرتے ہو
نہ یہ طرزِ ادا اچھی، نہ یہ شوقِ جفا اچھا

نہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا
جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گِلا اچھا

ابھی بیمار ہیں سب کر رہے ہیں قولِ عہد اکبرؔ
اسی کوچے میں پھر پہنچیں گے ہوتے ہی ذرا اچھا

۹

تصوف کے بیاں کو ہوش نے رُوح آشنا پایا
معانی کچھ نہ سمجھا، پر قیامت کا مزا پایا

جوانی چھن گئی، حسرت رہی باقی ستانے کو
عروسِ دہر! ہم نے دل لگا کر تجھ سے کیا پایا

(۱۰)

ہے کام ترا ساقی اک جام پلا دینا
یا وہ کو بھلا دینا یا میں کو مٹا دینا

مستوں کو حقیقت کا اک جلوہ دکھا دینا
موجِ مئے وحدت کو آئینہ بنا دینا

(۱۱)

ہجر میں خونِ جگر آخر کو پینا ہی پڑا
موت بھی آئی نہیں، مجبور جینا ہی پڑا

قلبِ انساں میں کبھی پڑ جاتی ہے اک نیک بات
جب پڑا لیکن تمہارے دل میں کینا ہی پڑا

وضع ان کی دیکھ کر لازم ہوئی قطعِ اُمید
کل ستم کی چل رہی تھی، منہ کو سینا ہی پڑا

تجربے کے بعد نسخے سے گیا آخر گلاب
لخلخے میں تیرے عارض کا پسینا ہی پڑا

دل بھی کانپا، ہونٹ بھی تھرائے، شرمایا بھی خوب
شیخ کو لیکن تری مجلس میں پینا ہی پڑا

الفتِ احمدؐ ہے تکمیلِ ایماں تھی ضرور
راہِ حق جوئی میں اے اکبرؔ مدینہ ہی پڑا

(۱۲)

اُردو میں وزنِ قاآنی کا نمونہ

تصور اس کا جب بندھا تو پھر نظر میں کیا رہا
نہ بحثِ این و آں رہی، نہ شورِ ما سوا رہا

زبانِ خلق پر بس اک فسانۂ فنا رہا
نہ ہم رہے، نہ دل رہا، نہ دل کا مدعا رہا

نئے بنائے سازِ عیش چرخ نے سدا، مگر
فنا کی دُھن پہ مستقل جہانِ بے بقا رہا

(۱۳)

پردا توڑا آپ نے، اُس بت کو آیا کر دیا
خود پری تھی، اب اسے پریوں کا سایہ کر دیا

کر گئے تھے حضرتِ سید عقیدوں کو درست
چرخ نے رسموں کا بھی آخر صفایا کر دیا

کم ہوئی آخر بصارت روشنی میں لیمپ کی
بڑھ گئی جو کچھ بصیرت تو جلایا کر دیا

(۱۴)

ہم کو زیرِ آسماں ہو کر گزرنا ہی پڑا
منزلِ ہستی میں گھٹنے کو ٹھہرنا ہی پڑا

موت کے عشووں کے آگے نازِ منطق کچھ نہ تھا
دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

جانتی تھی قوت اپنی مدتِ عمرِ عروج
بحر میں لیکن حبابوں کو اُبھرنا ہی پڑا

(۱۵)

خوانِ فلک پہ جو ملے شکر سے ساغر کر قبول
غم کی شکایتیں ہیں کیا، آیا ہے پیش کھا بھی جا

ساغرِ مئے ہے سامنے شیخ سے کہہ رہے ہیں وہ
دیکھتا کیا ہے ہر طرف مردِ خدا چڑھا بھی جا

اے دلِ با تمیز و ہوش جرم کا کام یاں نہیں
لطفِ فریبِ حسن اٹھا فقروں میں اُلجھے آ بھی جا

(۱۶)

بنائے کارِ جہاں کو خراب ہی دیکھا
ہمیشہ ہم نے یہاں انقلاب ہی دیکھا

ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانہ میں
کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

(۱۷)

دنیا میں ثابت قدم نکلنا، فدائے عشقِ حبیب ہونا
یہ کامیابی ہے عاشقی کی، یہی تو ہے خوش نصیب ہونا
ادھر وہی طبع کی نزاکت، اُدھر زمانہ کی آنکھ بدلی
بڑی مصیبت شریف کو ہے، امیر ہو کر غریب ہونا
عطا ہوئی ہے اگر بصیرت تو ہے یہ حالت مقامِ حیرت
خدا سے اتنا بعید رہنا، خودی سے اتنا قریب ہونا
رسولِ اکرمؐ کی ہسٹری کو پڑھو تو اوّل سے تا بہ آخر
وہ آپ ثابت کرے گی اپنا عظیم ہونا، عجیب ہونا
جو دل پہ گزری کروں گزارش بغیر پیچیدگی و سازش
فقیہہ ہونے کی ہے نہ خواہش، نہ چاہتا ہوں ادیب ہونا

وہ طلب ہیں ہے بس مقدم، شکستہ دل اور چشمِ پُرنم
نہیں مؤثر کچھ اس میں ہمدم، امیر ہونا غریب ہونا
نظر کر ان کی طرف ادب سے تو پھر دیتے دل کو سب سے   عجب نہیں عاشقانِ رب سے ظہورِ کارِ عجیب ہونا

(۱۸)

جو بِل گیا وہ کھانا، داتا کا نام جپنا   اس کے سوا بتاؤں کیا تم سے کام اپنا
رونا تو ہے اسی کا کوئی نہیں کسی کا   دنیا ہے اور مطلب، مطلب ہے اور اپنا
اے برہمن ہمارا تیرا ہے ایک عالم   ہم خواب دیکھتے ہیں، تو دیکھتا ہے سپنا
یہ دُھوم دھام کیسی، شوقِ نمود کیسا   بسمل کو دل کی صورت آتا نہیں تڑپنا
بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب   کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جلوہ گاہ کا نہ تپنا

(۱۹)

نفس کے تابع ہوئے، ایمان رخصت ہو گیا   وہ زنانے میں گھُسے، مہمان رُخصت ہو گیا
مے انہوں نے پی، اب ان کے پاس کیونکر دل لگے   جانور اک رہ گیا، انسان رُخصت ہو گیا
فرق ظاہر ہو گیا جب سے قلم اور تیغ کا   دل میں انشا کا جو تھا ارمان رُخصت ہو گیا
کہہ دیا تھا میں نے کٹ جائیں جو ناقص شعر ہوں   یہ نتیجہ تھا کہ کُل دیوان رخصت ہو گیا

(۲۰)

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا   دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا
آئے ؏ تجھ کو نظر صانعِ عالم کی جھلک   سامنے کچھ نہ رکھو آئینۂ فطرت کے سوا
تیر سے الفاظ کر سکتے ہیں پیدا دفتر   ورنہ کچھ بھی نہیں اب اللہ کی قدرت کے سوا

(۲۱)

جلوہ نظر آیا نہیں اے یار تمہارا   تڑپا ہی کیا طالبِ دیدار تمہارا
بڑھنے تو ذرا دو اثرِ جذبۂ دل کو   قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمہارا
دم بھر کے لیے آکے اسے شکل دکھاؤ   مہمانِ دمِ چند ہے بیمار تمہارا
ہر دم نظرِ سوق کیا کرتا ہوں تم پر   ہر وقت میں رہتا ہوں گنہگار تمہارا
صدمے شبِ فرقت کے اٹھائے نہیں جاتے   اب موت کا طالب ہے طلب گار تمہارا
عازم ہو تم اے حضرتِ دل کوئے بتاں کے   اللہ ہے یار و مددگار تمہارا
کس ناز سے کہتا ہے شبِ وصل وہ ظالم   برہم نہ کرے گیسوؤں کو پیار تمہارا
اکبر کی تمناؤں سے کہتا ہے یہ گردوں   اس دور سے اُٹھنے کا نہیں بار تمہارا

(۲۲)

بتکدے میں مطمئن رہنا مرا دشوار تھا   بُت تو اچھے تھے، برہمن درپئے آزار تھا
اکبرِ مرحوم کتنا بے خود و سرشار تھا   ہوش ساری عمر اس کی زندگی پر بار تھا
نزع میں آئی تجلی روئے جاناں کی نظر   زہر سمجھے تھے جسے، وہ شربتِ دیدار تھا
دل ہی دل میں ہو لیے مست مئے منصور ہم   شرع میں رہنے کا خطرہ تھا نہ خوفِ دار تھا
خانۂ تن کی خرابی کا میں کرتا رنج کیا   گوہرِ جاں پر فقط اک گرد کا انبار تھا
رنگ گلزارِ جہاں کا قدرداں مجھ سا تھا کون   جو گلِ رنگیں تھا، میرے ہی گلے کا ہار تھا

(۲۳)

فسونِ بُت سے بچا، بندِ بابِ دیر رہا   خدا نے فضل کیا، طفلِ دل بخیر رہا
تعجب آتا ہے ان کے مذاق پر مجھ کو   چمن خزاں میں بھی جن کا محلِ سیر رہا
فسانے رہ گئے اکبر کی بت پرستی کے
نہ بُت رہے، نہ برہمن، رہے نہ دیر رہا

(۲۴)

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات   خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا
رنجِ دنیا سے بہت مضطرب الحال تھا یہ   دل میں تسکین ہوئی مذہب کے اثر سے پیدا

(۲۵)

یہ بُت پنہاں نہیں ہوتے، خدا ظاہر نہیں ہوتا   غنیمت وہ زمانہ ہے کہ میں کافر نہیں ہوتا
ترا ناوک بھی اے صیاد کیا ہی روح پرور ہے   کہ تیرا صیدِ بسمل رہتا ہے، آخر نہیں ہوتا
علومِ دینوی کے بحر میں غوطے لگانے سے   زباں گو صاف ہو جاتی ہے، دل طاہر نہیں ہوتا
تری چشمِ فسوں گر کا اشارہ ہے یہ نرگس سے   فقط نظارہ کرنے سے کوئی ساحر نہیں ہوتا
نہ خلق اس کی خبر لیتی نہ عقل اس کی مدد کرتی   خدا جب تک کسی کا حافظ و ناصر نہیں ہوتا
حضورِ قلب اگر حاصل نہیں تجھ کو، تعجب کیا   خدا جب دل سے غائب ہو تو دل حاضر نہیں ہوتا
یہ حق گوئی ہے اکبر کی کہ ہے جس کا اثر اتنا   فسوں کیسا، مسلماں آدمی ساحر نہیں ہوتا

(۲۶)

یہ سُست ہے تو پھر کیا، وہ تیز ہے تو پھر کیا   نیٹو[۱] جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا
رہنا کسی سے دب کر ہے امن کو ضروری   پھر کوئی فرقہ ہیبت انگیز ہے تو پھر کیا
رنج و خوشی کی سب میں تقسیم ہے مناسب   بابو جو ہے تو پھر کیا، چنگیز ہے تو پھر کیا
ہر رنگ میں ہیں پاتے بندے خدا کے روزی   ہے پینٹر[۲] تو پھر کیا، رنگریز ہے تو پھر کیا
جیسی جسے ضرورت، ویسی ہی اس کی چیزیں   یاں تخت ہے تو پھر کیا، واں میز ہے تو پھر کیا
مخزن سے اگر ہے غافل، ہرگز نہیں ہے عاقل   ہنر جو ہے تو پھر کیا، پرویز ہے تو پھر کیا
مفقود ہیں اب اس کے سننے سمجھنے والے   میرا سخن نصیحت آمیز ہے تو پھر کیا
کیسی ہی سلطنت ہو، سب نوش نہ رہ سکیں گے   گر ترک ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا
منزل وہی ہے جس کو نبیوں نے ہے بتایا   اسٹیم ہے تو پھر کیا، مہمیز ہے تو پھر کیا
گھر کا چراغ دیکھو یعنی کہ دل سنبھالو   کوئی اناڑی دم بھر گلریز ہے تو پھر کیا
اسلام و حق کے حامی ہرگز نہیں ہیں ہم تم   حرص و غرور حسرت انگیز ہے تو پھر کیا
دونوں ہی مر رہے ہیں، دونوں کا حشر ہو گا   نیٹو جو ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا

(۲۷)

مے خانۂ ریفارم[۳] کی چکنی زمین پر   واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا
کیسی نماز، بال[۴] میں ناچو جنابِ شیخ   تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا
یہ پاس اور وہ پاس، نہ موجد نہ اہلِ زد   اخبار میں جو چھپ گئے ارمان نکل گیا

(۲۸)

فطرت میں سلسلہ ہے کمال و زوال کا   گھٹنا ہے بدر کا تو ہے بڑھنا ہلال کا
پرتو جو اس میں ہے ترے حسن و جمال کا   عالم ہے شیفتہ مرے رنگِ خیال کا
نظارہ کر رہا ہوں بُتِ بے مثال کا   شانِ خدا ہے ساتھ شباب و جمال کا
ہم اپنے فقر میں بھی ہیں اک آن بان سے   کملی ہماری رنگ دکھاتی ہے شال کا
اُس مس پہ کون میرے سوا ہو فریفتہ   گاہک میں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا
رکھنا پڑا ہے اُس بُتِ کافر سے میل جول   موقع نہیں ہے بحثِ حرام و حلال کا

---

۱ NATIVE، دیسی باشندہ   ۲ PAINTER
۳ REFORM، اصلاح   ۴ BALL، مجلسِ رقص

الفت میں فرض ہے بُتِ کافر کا اِتباع   موقع نہیں ہے بحثِ حرام و حلال کا
دورِ فلک میں چاند کی قسمت بھی خوب ہے   ہے بس عروج خاتمہ اُس کے زوال کا
اک عکس ناتمام پہ عالم کو وجد ہے   کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا
ماضی تو ختم ہو چکا، مستقبل آئے گا   ممکن نہیں بیان کروں حال، حال کا
بلبل کی شاخِ گل پہ نہ باقی رہے نظر   نشو و نما جو دیکھ لے اس نونہال کا

(۲۹)

طریقِ عشق میں مجھ کو کوئی کامل نہیں ملتا   گئے فرہاد و مجنوں، اب کسی سے دل نہیں ملتا
بھری ہے انجمن لیکن کسی سے دل نہیں ملتا   ہمیں میں آ گیا کچھ نقص یا کامل نہیں ملتا
پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے   اسے کشتی نہیں ملتی، اسے ساحل نہیں ملتا
پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے   کبھی قاضی نہیں ملتے، کبھی قاتل نہیں ملتا
حریفوں پر خزانے ہیں کھلے، یاں ہجرِ گیسو ہے   وہاں پہ بل ہے اور یاں سانپ کا بھی بل نہیں ملتا
یہ حسن و عشق ہی کا کام ہے شبہ کریں کس پر   مزاج ان کا نہیں ملتا، ہمارا دل نہیں ملتا
چھپا ہے سینہ و رخ دلستاں ہاتھوں سے کروٹ میں   مجھے سوتے میں بھی وہ حسن سے غافل نہیں ملتا
حواس و ہوش گم ہیں بحرِ عرفانِ الٰہی میں   یہی دریا ہے جس میں موج کو ساحل نہیں ملتا
کتاب بِل[۱] مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو   میں اسپنسر[۲] سے مستغنی ہوں، مجھ سے مل[۳] نہیں ملتا

(۳۰)

ہستیٔ حق کے معانی جو مرا دل سمجھا   اپنی ہستی کو اک اندیشۂ باطل سمجھا
وہ شناور ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا   وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا
حضرتِ دل کو چڑھا آیا ہے بتخانہ میں   اُن کے انداز سے اُن کو اسی قابل سمجھا
ہوئی دنیا میں مرے جوشِ جنوں کی تکریم   تیرے دیوانے کو عاقل نے بھی کامل سمجھا
کافری سہل نہ تھی، عشقِ بتاں کھیل نہ تھا   بخدا میں تو اسی سے اسے مشکل سمجھا
ان نگاہوں کے اشاروں سے طبیعت تڑپی   ان اشاروں کے معانی کو مرا دل سمجھا
ضعف سے میں جو گھٹا اور بڑھا اس کا ستم   یاں زباں ہل نہ سکی، وہ متحمل سمجھا
اُترا دریا میں پئے غسل جو وہ غیرتِ گل   شورِ امواج کو میں شورِ عنادل سمجھا
کفر و اسلام کی تفریق نہیں فطرت میں   یہ وہ نکتہ ہے جسے میں بھی بہ مشکل سمجھا
شیخ نے چشمِ حقارت سے جو دیکھا مجھ کو   بخدا میں اُسے اللہ سے غافل سمجھا
وہ بھی نافہم ہے جو خضر کا طالب نہ ہوا   وہ بھی نادان ہے جو خضر کو منزل سمجھا
نہ کیا یار نے اکبر کے جنوں کو تسلیم   مل گئی آنکھ تو کچھ سوچ کے عاقل سمجھا

(۳۱)

مہربانی ہے عیادت کو جو آتے ہیں مگر   کس طرح اُن سے ہمارا حال دیکھا جائے گا
دفترِ دنیا اُلٹ جائے گا بالکل یک قلم   ذرّہ ذرّہ سب کا اصلی حال دیکھا جائے گا
آفیشل[۴] اعمال نامہ کی نہ ہوگی کچھ سند   حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا
بچ رہے طاعون سے تو اہلِ غفلت بول اُٹھے   اب تو مہلت ہے پھر اگلے سال دیکھا جائے گا
تذکرۂ صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب   بے اثر ہوگی شرافت، مال دیکھا جائے گا

رکھ قدم ثابت، نہ چھوڑ اکبر صراطِ مستقیم
خیر چل جانے دے ان کی چال، دیکھا جائے گا

(۳۲)

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا   اچھا ہوا مزہ تو محبت کا مل گیا
ایسے ستم کئے کہ مرا قلب ہل گیا   اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا   بلبل کو وجد آ گیا، غنچہ بھی کھل گیا
تعلیمِ مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے   سب مل گیا اُسے جسے اللہ مل گیا
ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے   غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا
کس نے نگاہِ ناز سے دیکھا ہے اس طرف   فریاد کر رہا ہے جگر، ہائے دل گیا
خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز   اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب بھی مل گیا
کھلتا نہیں کہ شیخ سے اکبر نے کیا کہا   آیا تھا جوشِ دل سے مگر مضمحل گیا

(۳۳)

وہ شعلۂ شوق کا سینے میں مشتعل نہ رہا   تری نظر نہ رہی وہ، مرا وہ دل نہ رہا
ملا جو خانۂ تن خاک میں تو ملنے دو   یہ رنج کیا ہے کہ زندانِ آب و گل نہ رہا

(۳۴)

چودھویں منزل میں وہ ماہِ خوش اقبال آ گیا   صبر و تقویٰ پر جو بھاری ہے وہی سال آ گیا
الفتِ گیسو نے آخر دی مرے دل کو شکست   ہائے کیا انمول شیشہ تھا مگر بال آ گیا
عالمِ فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم   فرق یہ ہے تجھ کو عقل آئی، مجھے حال آ گیا
دعویٔ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات   ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا

(۳۵)

وہ مطرب اور وہ ساز، وہ گانا بدل گیا   نیندیں بدل گئیں، وہ فسانہ بدل گیا
رنگِ رُخِ بہار کی زینت ہوئی نئی   گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا
فطرت کے سر اثر میں ہوا ایک انقلاب   پانی فلک پہ، کھیت میں دانا بدل گیا
حدِ شعورِ عافیت کی نئی طرز پر بندھی   وہ چوکیاں بدل گئیں، تھانا بدل گیا

(۳۶)

اس گوہرِ نایاب سے واقف نہیں دنیا   آسان نہیں دل کا مرے دام لگانا
خوب آپ کا ہے صاحب کے خود اک بات کا لانا   اور بات پڑے جب تو مرا نام لگانا

(۳۷)

زلف نے پرتوِ دیں نام کو رہنے نہ دیا   آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا
دو مرادیں جو ملیں، چار تمنائیں کیں   ہم نے خود قلب میں آرام کو رہنے نہ دیا
موت کو بھول گیا دیکھ کے جینے کی بہار   دل نے پیشِ نظر انجام کو رہنے نہ دیا

(۳۸)

نورِ عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا   ہوش میں آنا حجابِ روئے جاناں ہو گیا
بتکدے میں شور ہے اکبر مسلماں ہو گیا   بیوفاؤں سے کوئی کہہ دے کہ ہاں ہاں ہو گیا
انتشارِ اہلِ معنی فیض سے خالی نہیں   بوئے خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہو گیا
باعثِ تسکیں نہ تھا باغِ جہاں کا کوئی رنگ   جس روش پر میں چلا آخر پریشاں ہو گیا
خوابِ راحت بن گیا خوفِ خدا البعد فنا   حشر میں حُسنِ عمل گلزارِ رضواں ہو گیا
ان کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا   نورِ رُخ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا
دونوں کو تشبیہ دی تھی عارضِ محبوب سے   آئینہ حیرت میں آیا، گل پریشاں ہو گیا
تیغ کھینچی اس نے، ممنونِ توجہ ہم ہوئے   حسن وہ افسوں ہے جس سے ظلم احساں ہو گیا
ترکِ دنیا سے ہوئی جمعیتِ خاطر نصیب   حال میرا گو کہ ظاہر میں پریشاں ہو گیا

۱؎ PAY BILL، تنخواہ کا بل   ۲؎ SPENCER
۳؎ MILL، جان سٹوارٹ مل   ۴؎ OFFICIAL، سرکاری

طاقتِ فریاد بھی مجھ میں نہ باقی رہ گئی
ظلم کرنا آپ کو مجھ پر اب آساں ہو گیا

خوانِ الوانِ فلک پر کیا مسرت ہو سکے مجھے
گور کا لقمہ ہوا جو اس کا مہماں ہو گیا

فرقتِ جاناں میں کیسی خوش دلی اے ہمنشیں
انبساطِ طبع، نذرِ رنجِ ہجراں ہو گیا

صورتِ ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آ گیا جب جوش میں، معنی کا طوفاں ہو گیا

جس سے کہتے ہیں وہ کہتا ہے کہ یہ سب وہم ہے
اب ہمارا حال بھی خوابِ پریشاں ہو گیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ دراز
سینہ اک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہو گیا

اور عالم میں ہوں میں اے فاتحہ خواں بعدِ مرگ
میں نہ تھا وہ جسم جو مٹی میں پنہاں ہو گیا

بڑھ گئی سوزش جو تجھ بن گل کھلے گلزار میں
زخمِ دل کے حق میں ہر غنچہ نمکداں ہو گیا

کر دیا اہلِ بصیرت فیضِ ساقی نے مجھے
ساغرِ مے آفتابِ اوجِ عرفاں ہو گیا

اک نظر کا ہے تعلق اس جہاں سے ہوش کر
سب کا سب اک جنبشِ مژگاں میں پنہاں ہو گیا

دیکھنا مشروطِ دیں ہوتا تو ہوتا بت پرست
کچھ نہ دیکھا، اس کی برکت سے مسلماں ہو گیا

(۳۹)

درد نے جا اس میں کی، اک سوزِ پنہاں ہو گیا
للہ الحمد اب مرا دل بھی مسلماں ہو گیا

جلوۂ حسنِ بتاں آشوبِ دوراں ہو گیا
اللہ اللہ آفتِ دینِ مسلماں ہو گیا

اشکِ خوں آلود آنکھوں میں نمایاں ہو گیا
دیکھیے دل بھی شریکِ چشمِ گریاں ہو گیا

رنگِ خوں اب صاف آنکھوں میں نمایاں ہو گیا
دیکھیے دل بھی شریکِ چشمِ گریاں ہو گیا

اس نے پوچھا ہو گیا آسودہ بوسے سے کہ تو
میں نے ناحق کہہ دیا جلدی میں جی ہاں ہو گیا

سر بھی کھا جائے گا ظالم، جان بھی کھا جائے گا
سخت مشکل ہے کہ ناصح میرا مہماں ہو گیا

انقلابِ دہر دیکھو بن گیا آقا غلام
قصر کا مالک جو تھا، اب اس کا درباں ہو گیا

دیکھنے سے شوق پیدا، شوق سے پیدا طلب
آفتِ دل آنکھ تھی، دل آفتِ جاں ہو گیا

قبلِ ہستی ان عوارض سے بری تھا دل مرا
اس سفر میں مبتلائے دین و ایماں ہو گیا

عظمتِ خالق نہ سمجھا، قدرِ دل اس نے نہ کی
جو پئے لذت مطیعِ نفسِ شیطاں ہو گیا

پوچھتے کیا ہو اصولِ مذہبِ رندانِ عشق
یار کا ارشاد ان کا دین و ایماں ہو گیا

میری قسمت تھی کہ ہر تپا بنا بانگِ عسس
بختِ دشمن تھا کہ خوابِ چشمِ درباں ہو گیا

اس توقع پر کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو
ماہِ نو بھی چرخ پر شکلِ گریباں ہو گیا

اس لبِ شیریں کے بوسوں نے کیا شیریں سخن
لی زباں ان کی جو منہ میں، میں زباں داں ہو گیا

کی تمنّا چشمِ بد دور ایسی اپنے رنگ میں
اکبر اب مسند نشینِ بزمِ رنداں ہو گیا

(۴۰)

کر گئی کام نگاہِ مسِ پُرفن کیسا
تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہنچا
دلِ پُرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

اصل سے ہو کے جدا نشو و نما کی امید
مجھ کو حسرت ہے کہ بوڑھوں میں یہ بچپن کیسا

(۴۱)

خدا کے ہوتے بتوں کو پوجوں، نہیں تھا مطلق گمان ایسا
مگر تمھیں دیکھ کر تو واللہ، آ ہی پڑا مجھ کو دھیان ایسا

وہ چھت پہ بے پردہ سو رہے ہیں، فلک قمر سے یہ پوچھتا ہے
بتا تو تیری نظر سے گزرا ہے کوئی خوش رُو جوان ایسا

بھلا ہی دیتی ہو جس کو دنیا، مٹا ہی دیتا ہو جس کو گردوں
عبث ہے انسان چاہتا ہے، کہ جو نام ایسا، نشان ایسا

بھرا ہوا دل جو ذوق سے ہو، خدا کی یاد اس میں شوق سے ہو
وہاں کے جلووں کا پوچھنا کیا، مکین ایسا، مکان ایسا

دل و جگر کو فراقِ بت میں حوالۂ چشمِ تر کروں گا
کبھی کسی نے کیا نہ ہو گا کنارۂ گنگ دان ایسا

(۴۲)

دنیا کے مباحث، یہ مری نظروں میں ہیں کیا
اتنا تو کوئی پہلے بتائے مجھے، میں کیا

تو کہیے اگر وقعتِ عاشق نہیں دل میں
یہ کونسی سیکھی ہے زباں آپ نے، تیں کیا

(۴۳)

زلفِ پیچاں کا تصور مجھے کرنا ہی نہ تھا
ہو گئی مفت طبیعت میں اک الجھن پیدا

شرم کی جا ہے نہ ہو دل میں جو داغوں کی بہار
سینۂ خاک بھی کر لیتا ہے گلشن پیدا

میری ہر بات کا رخ ہے طرفِ عارضِ یار
میرے ہر شعر سے ہیں معنیِ روشن پیدا

دیدہ و دل سے کھٹکتے رہو ہر دم اکبر
دوستوں ہی میں سے ہو جاتے ہیں دشمن پیدا

(۴۴)

کوئی ہے دہر میں خونِ جگر کہیں پیتا
کوئی زمانہ میں ہے شیر و انگبیں پیتا

میں ان کی بزم سے اٹھ آیا قبلِ دورِ شراب
محلِ شرم تھا کہنا کہ میں نہیں پیتا

سرورِ روح ہے حاصل ولائے حیدر سے
میں جام و کوثر و تسنیم ہوں یہیں پیتا

نہ ملتی پینے کو دنیا میں قوتِ پرواز
اگر یہ خون کسی کا براہِ کیں پیتا

ہر ایک قطرے کے بدلے میں دیتا اک دانہ
تری طرح کوئی پانی جو اے زمیں پیتا

جھجکتے کیوں ہو، جو ہوتا ہے اعتراض اکبر
جواب کیوں نہیں دیتے، بہت نہیں پیتا

(۴۵)

شکایت جوشِ الفت سے ہوئی تھی اے حسیں پیدا
تعجب ہے اگر اس سے ہوئی چینِ جبیں پیدا

فریبِ عقلِ ظاہر بیں ہے یہ سب، ورنہ اے اکبر
یہیں فانی، یہیں باقی، یہیں پنہاں، یہیں پیدا

(۴۶)

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ جادو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے، وہاں جادو نہیں چلتا

کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہِ حبِ قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا، وہ بولے، تو نہیں چلتا

کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

لطیف الطبع ساتھی چاہیئے فیاض طینت کا
چمن سے بے ہوا کے کاروانِ بو نہیں چلتا

(۴۷)

ستمِ دورِ گردوں کے سہہ جاؤں گا
جو گزرے گی دل پر، وہ کہہ جاؤں گا

دعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یونہیں مر کے رہ جاؤں گا

(۴۸)

ہمیشہ آپ کے آگے یہ دست بستہ رہا
مگر دل آپ کے قابو میں تھا، شکستہ رہا

ذرا تو پختہ شریفوں کو باغِ دہر میں دیکھ
انہیں کا حال ہر اک سے زیادہ خستہ رہا

(۴۹)

جنابِ شیخ سے جا کر ذرا للہ کہہ دینا
کہ گمراہی تھی مجھ سے رند کو گمراہ کہہ دینا

بہت مشکل ہے بچنا بادۂ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا

مرے خط میں سلام اغیار کو، قاصد یہ کیا معنی
نہایت رنج ہے اس کا مجھے واللہ کہہ دینا

تمہاری مرحبا سے شعر کی ہو جائے گی عزت
نہ نکلے واہ دل سے تو زباں سے واہ کہہ دینا

(۵۰)

اگرچہ تسکینِ طبعِ ملت ہے حُبِ قومی میں آہ کرنا
مفید تر ہے مگر دلوں کو رجوعِ سوئے الٰہ کرنا

وفائے وعدے سے چشم پوشی ہمیشہ شام و پگاہ کرنا
حضور نے کیا ثواب سمجھا ہے منتظر کو تباہ کرنا

یہ کس سے سیکھا ہے تیری آنکھوں نے اس بلا کی نگاہ کرنا
بنائے دیں کو خراب کرنا، دلوں کو اتنا تباہ کرنا

کہیں گے تعمیلِ ذات پر ہو نشان دو یا پتہ بتاؤ
بتوں کے آگے ہے سخت مشکل خدا کو اپنا گواہ کرنا

نئی ادا یہ نہیں فلک کی، سدا سے اس کا یہی ہے شیوہ
کسی کو حد سے سوا بڑھانا، کسی کو بالکل تباہ کرنا

کہا جو میں نے نہ توڑ دل کو، تجھے مناسب ہے دلنوازی
تو ہنس کے بولا کہ سہل ہوگا دلِ شکستہ میں راہ کرنا

جہان صورت کا ذرہ ذرہ جمالِ معنی کا آئینہ ہے
مگر انھیں کو، جو دیکھتے ہیں، جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھیے آکے بزمِ سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو تو کیا بُرا ہے گناہ کرنا

وہ دورِ چرخ آ رہا ہے اکبرؔ کہ اہلِ تقویٰ ہیں زار و مضطر
بزرگ بھی طفلِ دل کو اپنے سکھا رہے ہیں گناہ کرنا

(۵۱)

مجھ کو نہ کبھی اس بتِ دل خواہ نے چاہا
اب میں بھی نہ چاہوں گا جو اللہ نے چاہا

ساتھ اُن کا نہ چھوڑا کسی حالت میں بھی اس نے
شعروں کو مرے خوب ہی اس واہ نے چاہا

(۵۲)

خوشی سے باخبر مٹنے پہ راضی ہو نہیں سکتا
خیالِ دین و عزت امرِ ماضی ہو نہیں سکتا

عمل بیجا اگر ہو، روکنا واجب ہے اکبرؔ کو
امیدوں پر مگر کچھ حکم قاضی ہو نہیں سکتا

(۵۳)

جس روشنی میں لُوٹ ہی کی آپ کو سُوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو اُبھارے
اُس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

(۵۴)

ہے غضب حیلۂ دیرِ فانی کا
پوچھنا کیا ہے اس کے بانی کا

دیدہ ہے محوِ دیرِ فانی کا
دل ہے مشتاق اس کے بانی کا

جان دے دی غمِ حسیناں میں
حق ادا کر دیا جوانی کا

خوب جی بھر کے ہو لیے بدنام
حق ادا کر دیا جوانی کا

کرتے ہیں مجھ سے غیر کا شکوہ
شکر ہے اُن کی مہربانی کا

دل میں سوزش ہے، آنکھ میں آنسو
عشق ہے کھیل آگ پانی کا

غور کر کیا ہے زندگی کی بنا
سوچ کیا حق ہے اس کے بانی کا

نہ مِلا خاک میں عمل اپنے
شوق رکھ فیضِ آسمانی کا

ہوش بھی بار ہے طبیعت پر
کیا کہوں حالِ ناتوانی کا

قتل سے پہلے ہی کلوروفارم[۱]
شکر ہے اُن کی مہربانی کا

شیخ در گور و قوم در کالج
رنگ ہے دورِ آسمانی کا

انجن آیا، نکل گیا زن سے (ق)
سُن لیا نام آگ پانی کا

بات اتنی اور اس پہ یہ طومار
غُل ہے یورپ پہ جانفشانی کا

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

(۵۵)

یوں مری طبع سے ہوتے ہیں معانی پیدا
جیسے ساون کی گھٹاؤں سے ہو پانی پیدا

کیا غضب ہے نگہِ مستِ مسِ بادہ فروش
شیخِ فانی میں ہوا رنگِ جوانی پیدا

یہ جوانی ہے کہ پاتا ہے جنوں جس سے ظہور
یہ نہ سمجھو کہ جنوں سے ہے جوانی پیدا

بیخودی میں تو یہ جھگڑے نہیں رہتے اے ہوش
تو نے کر رکھا ہے اک عالمِ فانی پیدا

کوئی موقع نکل آئے کہ بس آنکھیں مل جائیں
راہیں پھر آپ ہی کر لے گی جوانی پیدا

ہر تعلق مرا سرمایہ ہے اِک ناول کا
میری ہر رات سے ہے ایک کہانی پیدا

جنگ ہے جرم، محبت ہے خلافِ تہذیب
ہو چکا ولولۂ عہدِ جوانی پیدا

کھو گئی ہند کی فردوس نشانی اکبرؔ
کاش ہو جائے کوئی ملٹن[۲] ثانی پیدا

(۵۶)

جو ناصح مرے آگے بکنے لگا
میں کیا کرتا، مُنہ اس کا تکنے لگا

محبت کا تم سے اثر کیا کہوں
نظر مل گئی، دل دھڑکنے لگا

بدن چھُو گیا، آگ سی لگ اُٹھی
نظر مل گئی، دل دھڑکنے لگا

رقیبوں نے پہلو دبایا تو چُپ
میں بیٹھا تو ظالم سرکنے لگا

جو محفل میں اکبرؔ نے کھولی زبان
گلستاں میں بلبل چہکنے لگا

(۵۷)

نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا
ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ دل میں ہے کوئی آنے والا

نسیمِ مستانہ چل رہی ہے، چمن میں پھر رُت بدل رہی ہے
صدا یہ دل سے نکل رہی ہے، وہی ہے یہ گُل کھلانے والا

(۵۸)

خودی گم کر چکا ہوں اب خوشی و غم سے کیا مطلب
تعلق ہوش سے چھوڑا تو اب عالم سے کیا مطلب

قناعت جس کو ہے وہ رزق کا محتاج پر خوش ہے
سمجھ جس کو ہے اس کو بحثِ بیش و کم سے کیا مطلب

جسے مرنا نہ ہو، وہ حشر تک کی فکر میں اُلجھے
بدلتی ہے اگر دنیا تو بدلے، ہم سے کیا مطلب

مری فطرت میں مستی ہے حقیقت بیں ہے دل میرا
مجھے ساقی کی کیا حاجت ہے، جامِ جم سے کیا مطلب

خود اپنی ریش میں اُلجھے ہوئے ہیں حضرتِ واعظ
بھلا ان کو بتوں کے گیسوئے پُرخم سے کیا مطلب

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون[۳] کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

صدائے سرمدی سے مست رہتا ہوں سدا اکبرؔ
مجھے نغموں کی کیا پروا، مجھے سرگم سے کیا مطلب

۱۔ CHLOROFORM، بیہوش کرنے کی دوا ۲۔ MILTON، ایک مشہور انگریزی شاعر
۳۔ DARWIN، مشہور ماہرِ حیاتیات جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان بندر کی ارتقائی صورت ہے۔

●

(۵۹)

خدا کے منکر، نبیؐ سے غافل، کہاں کے پیر اور امام صاحب
انھیں کے در پر جھکی ہے خلقت، سلام صاحب سلام صاحب

کہاں کی پوجا، نماز کیسی، کہاں کی گنگا، کہاں کا زم زم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب

ہزار سمجھاتے ہیں وہ سب کو کہ سب نہیں نام دار ہوتے
کرو خموشی و نیک بختی سے جا کے تم گھر کا کام صاحب

مگر نہیں مانتا ہے کوئی، ہر اک کی یہ التجا ہے ان سے
مجھے بھی تم چھاپ دو کہیں پر، مرا بھی ہو جائے نام صاحب

مری تمہاری نہیں نبھے گی، سدھارتا ہوں میں اب یہاں سے
سلام صاحب، سلام صاحب، سلام صاحب، سلام صاحب

(۶۰)

اے جانِ جہاں حُور نہ اچھی نہ پری خوب
ہے میری نگاہوں میں تری جلوہ گری خوب

تشبیہ میں دوں گا اسے رفتارِ صنم سے
واللہ تری چال ہے اے کبکِ دری خوب

یوں ترچھی نگاہوں سے مجھے قتل بھی کرنا
پھر صاف مکرنا کہ میں ہوں اس سے بری خوب

کھلتا ہے مرا غنچۂ دل آہِ سحر سے
عاشق کے لیے ہے یہ نسیم سحری خوب

منہ کھول کے سویا ہے وہ گل صحنِ چمن میں
لطف آج اٹھائے گی نسیمِ سحری خوب

سچ یہ ہے کہ واعظ مجھے بھاتا ہے نہ اکبرؔ
وہ خبط ہی اچھا، نہ یہ شوریدہ سری خوب

(۶۱)

کہتے ہیں فطرت جسے، یہ ہے نقابِ رُوئے دوست
ہے اسی پردے میں پنہاں آفتابِ رُوئے دوست

پردۂ فطرت خرد افروز و حکمت خیز ہے
ہے جنوں انگیز لیکن آبِ و تابِ رُوئے دوست

دیکھ لی جس نے جھلک اُس کی، وہ پہنچا دار پر
زینتِ منبر ہوا محوِ حجابِ رُوئے دوست

ذوقِ معنی ہو تو اے اکبرؔ نظر آگے بڑھا
عالمِ نیچر تو ہے لوحِ کتابِ رُوئے دوست

(۶۲)

ماہِ نو بھی نہیں چمکا ترے ابرو کی طرح
نکہتِ گل بھی نہ نکلی تری خوشبو کی طرح

کونسی تیغ ہے تیغِ خمِ ابرو کی طرح
کہ اشاروں ہی میں چل جاتی ہے جادو کی طرح

وہ ادا کی کہ قضا آ گئی خود داری کی
وہ نظر کی کہ اثر کر گئی جادو کی طرح

گل میں وہ شوخیِ رنگِ رُخِ محبوب کہاں
سرو میں لوچ کہاں اس قدِ دلجو کی طرح

مجھ کو دم بھر بھی زمانہ میں نہیں چین نصیب
مضطربِ شیشۂ ساعت میں ہوں بالو کی طرح

حسن میں کب ہو قمر کو ترے مانندِ ثبات
کبھی عارض کی طرح ہے، کبھی ابرو کی طرح

نہ یہ جنبش ہے نہ یہ نوک پلک ہے اس میں
قطع میں گو ہے ہلال آپ کے ابرو کی طرح

کم بضاعت کو جو اک ذرہ بھی ہوتا ہے فروغ
خود نمائی کو وہ اُڑ چلتا ہے جگنو کی طرح

دل کا میلان یقینی ہے سخن میں جو ہو وزن
طبعِ سنجیدۂ سامع ہے ترازو کی طرح

کیا کہوں شوقِ شہادت کو میں تجھ سے قاتل
روز افزوں ہے تری قوتِ بازو کی طرح

خالی از لطف نہیں آنکھ چرانا ان کا
فرحت افزائے نظر ہے رمِ آہو کی طرح

گلشنِ عشق میں ہے اشک اگر جوئے رواں
خوشنما آہ بھی ہے سروِ لبِ جو کی طرح

ہر زمیں میں ترا مضمون ہے مطلوب اے دوست
کہیں ہُو ہُو کی طرح ہے، کہیں کو کو کی طرح

نیچی نظروں سے مرے دل کو وہ کرتے ہیں شہید
ظلم پوشیدہ کیا کرتے ہیں جادو کی طرح

فرحت انگیز تو ہے ولولہ انگیز نہیں
نکہتِ گل بھی نہیں ہے تری خوشبو کی طرح

رنگِ گل سے بھی سوا شوخ ہے تو رنگ میں یار
مگر افسوس کہ آوارہ بھی ہے بُو کی طرح

ہمسر اس طرۂ مشکیں کی نہیں کوئی بلا
کوئی فتنہ نہیں اس نرگسِ جادو کی طرح

ٹکڑے میرے دلِ روشن کے جو دیکھے تو کہا
کیا گلے میرے یہ پڑ جائیں گے جگنو کی طرح

جامِ مے غیر کو دو، میں نہ کروں گا شکوہ
رنج کی بات ہے، پی جاؤں گا آنسو کی طرح

سر جھکا فکر میں بیٹھ، اپنی حقیقت کھل جائے
حق نما کون ہے آئینۂ زانو کی طرح

رشک آتا ہے جو تکیہ پہ وہ سر رکھتے ہیں
صاحبِ حس نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

نام کر جاتے ہیں دنیا میں جو خوش قسمت ہیں
کوئی مجنوں کی طرح، کوئی ارسطو کی طرح

واعظا تیری زباں پر ہے مذمت مے کی
یہ سخن تیرا گلوگیر ہو اچھو کی طرح

ہو اشاروں کا اگر اہلِ نظر کے تابع
خلق آنکھوں پہ جگہ دے تجھے ابرو کی طرح

گلشنِ دہر میں اکبرؔ کا کلام رنگین
کھل گیا گل کی طرح، پھیل گیا بُو کی طرح

(۶۳)

اظہارِ مدعا میں کروں گا اسی طرح
وہ پیش آئیں اچھی طرح یا بری طرح

چاہوں گا تخلیہ نہ زیادہ بٹھاؤں گا
تشریف لائیے بھی تو حضرت کسی طرح

(۶۴)

دل ہو وفا پسند، نظر ہو حیا پسند
جس حسن میں یہ وصف ہو، وہ ہے خدا پسند

توڑوں پہ تیرے جھومنے لگتی ہے شاخِ گل
بیحد ہے تیرا ناچ مجھے اے صبا پسند

(۶۵)

پھرتی ہے ارض آفتاب کے گرد
بندہ چکر میں ہے جناب کے گرد

نہیں ملتا ہزار اسے ٹالو
عشق رہتا ہی ہے شباب کے گرد

شعلہ رویوں میں گھومیں سوختہ دل
آنچ لگتی رہے کباب کے گرد

کون مستی مری سنبھالے گا
میں تو جاتا نہیں شراب کے گرد

(۶۶)

وقتِ بہارِ گل دلم از ہوش دور بود
موجِ نسیم دشمنِ شمعِ شعور بود

می گفت دوش قصۂ شوقت زبانِ دل
ہر حرفِ او حکایتِ موسیٰ و طور بود

یک جلوہ کرد و صورتِ پروانہ سوختم
آرے، ہمیں علاجِ دلِ ناصبور بود

خوش بود آں زماں خودی از خود خبر نداشت
ہوشم بخواب بود و دلم در حضور بود

یک ساعتِ حضوری او ایں چنیں گذشت
من محوِ بودم و او ہمہ ناز و غرور بود

بیدل مشو بگفتۂ منکر کہ او ز جہل
وہمش بگفت آنچہ بچشمِ تو نور بود

اکبرؔ بہ پیشِ پیرِ مغاں کرد اعتراف
غوغائے من بہ خلق ہمہ مکر و زور بود

(۶۷)

گذشتند آں قدر یاراں ز حدِ سیدلے اکبرؔ
کہ آں مرحوم اکنوں در شمارِ شیخ می آید

(۶۸)

فسردگی ہوئی پیدا اس انتشار کے بعد
ہزار حیف کہ نائج گرا بُخار کے بعد

کہا جو میں نے کہ دل چاہتا ہے پیار کروں
تو مسکرا کے وہ کہنے لگے کہ پیار کے بعد؟

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسہ پر
خموش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد

گیا شباب تو اب آئینہ میں کیا دیکھوں
وہ لطف ہی نہ رہا باغ میں بہار کے بعد

نہ بھول اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اے اکبرؔ
خدا سکون بھی دے گا اس اضطرار کے بعد

●

(۶۹)

مذاقِ دردسے، دل کو مرے ہے آہ پسند   عجب نہیں اُسے کرلے تری نگاہ پسند
خدا کا شکر، دیا اُس نے مجھ کو بوسۂ لب   کسے نصیب یہ حلوائے بادشاہ پسند
محلِ طعن نہیں ہے ہماری مے خواری   ہنر کے حکم میں ہے عیبِ بادشاہ پسند
یہ بے اصول دلغزش، بُری ہے سالک کو   خدا کے واسطے تم کرلو ایک راہ پسند
نہ حلقِ سر کلہے سودا مجھے، نہ تیرہ تھہ کا   بُتوں سے گو کہ میں کرتا ہوں رسم و راہ پسند
خداپرست بنائے گا کیا وہ لٹریچر   کرے جو طبع کو بے قید اور گناہ پسند
گناہِ سخت بتوں سے ہے مدعا طلبی   غضب یہ ہے کہ مجھے ہے یہی گناہ پسند
فلاسفی کو ہے مرغوبِ طبع اِلّا اللہ   طریقِ سینٹیفک[۱] کو ہے لَا اِلٰہ پسند
رہا رسولؐ کا درجہ، سو وہ تو ہے قانون   کرے حریف اسے ناپسند یا خواہ پسند
اب اس کے آگے ہے جو کچھ، گروہ بندی ہے   ہر اک کو اپنی ہی نسبت ہے واہ واہ پسند

(۷۰)

ملحداں را ہمہ اوصاف و ثناہا خوانند   مومناں را بخراشند بہ دشنامے چند
غیرتِ دیں بفروشند بہ یک غمزۂ کفر   چشم پوشند ز ملت پئے خود کامے چند
رُوحِ خود را چو سپردی بہ غلامیِ حریف   چہ کنی ناز بہ نامے و بہ خدامے چند
پختہ وضعے کہ خدا عقل و تمیزش داد ست   قدمے ہم نہ نہد در رہِ ایں خامے چند
وردِ ایں نغمۂ حافظ کن و خوش باش اکبرؔ   ہاں تو از بادۂ شیراز بزن جامے چند
اے گدایانِ خرابات خدا یارِ شماست   چشمِ انعام مدارید ز انعامے چند

(۷۱)

دلا سے چل ہمیں سوئے محمدؐ   دکھا دے جنّتِ کوئے محمدؐ
شبِ عاشق ہیں گیسوئے محمدؐ   خدا کا نور ہے روئے محمدؐ
چمن قرآں ہے، ہر لفظ اس کا ہے گل   نہاں ہر گل میں ہے بوئے محمدؐ
مشامِ جاں معطّر ہو رہا ہے   زہے سودائے گیسوئے محمدؐ
محمدؐ پھول ہیں، واعظ صبا ہیں   کہ پھیلاتے پھریں بوئے محمدؐ
یہ مژدہ اہلِ عالم کو سنا دو   بھری رحمت سے ہے خوئے محمدؐ
خدا کے گھر سے ہے الحاق اُس کو   یہ دیکھو رفعتِ کوئے محمدؐ
درُود اُس پہ ملائک بھیجتے ہیں   توجہ جس کی ہو سوئے محمدؐ
ہوئی زائل جہاں سے ظلمتِ کفر   پڑا جب پرتوِ روئے محمدؐ
ہوئے دل دوز، تیرِ اُلفتِ حق   کھنچی جب قوسِ ابروئے محمدؐ
منوّر نورِ وحدت سے ہوا دل   نثارِ پرتوِ روئے محمدؐ
خدا کا پیار ہے اُس دل پہ اکبرؔ   کشش جس دل کی ہے سوئے محمدؐ

(۷۲)

آتا ہے وجد مجھ کو ہر دیں کی ادا پر   مسجد میں ناچتا ہوں ناقوس کی صدا پر
اے برہمن کہوں گا بر عکس کو میں فانی   موقوف کچھ نہیں ہے گنگا و نربدا پر
پڑ جائے آتے جاتے شاید نگاہِ سلطاں   جو راہ سے الگ ہے، افسوس اُس گدا پر

(۷۳)

مجھے ہمنشیں ملا کیا، انھیں حالِ دل سُنا کر   وہ کہہ آئے ساری باتیں مرے دشمنوں سے جا کر
مری زندگی ہو کیونکر جو تو بے خبر ہو مجھ سے   نہ ہو شوق اگر وفا کا، تو میں خوش ہوں تو جفا کر
مرا یار مہ جبیں ہے، خوش ادا ہے، نازنیں ہے   مگر اس کا کم یقیں ہے کہ جیوں گا اُس کو پا کر
کرو شوق سے محبت مگر ایک بات سُن لو   کسی اور کام کے پھر نہ رہو گے دل لگا کر
نظر آیا چاند چھپ کا تو جھپک گئے ستارے   شبِ ماہ بھی نہ چمکی جو تُو نکلا جگمگا کر

(۷۴)

موقوف کچھ نہیں ہے فقط مے پرست پر   زاہد کو بھی ہے وجد تری چشمِ مست پر
عزت ملی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو   غازہ مَلا گیا ہے رُخِ فاقہ مست پر
رندانِ پختہ کار کو موسم کی قید کیا   موقوف مے کشی نہیں ماہِ اگست پر
بُلبل کی شاخِ گل کی نمو پر نگاہ ہو   میری نظر ہے تاک ہی کے داربست پر
پھیکا ہے رنگ مے ترے عارض کے سامنے   مستی ہے خود نثار ترے حسنِ مست پر
منظور مدحِ حسن ہے، ہو یا نہ ہو کمر   موقوف شاعری نہیں اس نیست ہست پر
بندِ نقاب باندھتے ہیں مجھ کو دیکھ کر   اہلِ نظر کا صاد ہے اس بندوبست پر
چل پھر نے اُن کی آنکھوں کی مجھ کو لُبھا لیا   کیوں کر نہ پیار آئے غزالوں کی جست پر
اُس با وفا کو حشر کا دن ہو گا روزِ وصل   قائم رہا جو دہر میں عہدِ الست پر
ہے نشۂ غرور میں زاہد خراب تر   پھر کیا میں اعتراض کروں مے پرست پر
اکثر مرے عزیز نئی روشنی میں ہیں   رحمت خدا کی چاہوں گا اب مے پرست پر
بجلی کو ہاتھ آگیا تیری ہنسی کا طرز   غنچوں کو رشک کیوں نہ ہو اس تیز دست پر
گو حافظے کو یاد نہ ہو قصۂ ازل   ہم تو جمے ہوئے ہیں قرارِ الست پر
کرسی نہیں ہے عرش، تو پھر کیا یہ فخر و ناز   کیوں معترض ہو فرشِ زمیں کی نشست پر

(۷۵)

نظران کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر   گرا کیں چُپکے چُپکے بجلیاں دینی عقائد پر
بس اصلِ کارِ دیں تو صرف تسبیح و قناعت ہے   عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زوائد پر

(۷۶)

جس نے اُبھارا خلق کو طاعتِ کردگار پر   نقش اسی کا رہ گیا صفحۂ روزگار پر
شاہ و وزیر کے تو نام دب گئے ہسٹری کے ساتھ   سکّۂ نامِ انبیا، اب بھی ہے ہر دیار پر

(۷۷)

بہت ہی کم پائے اپنے عارف، کمالِ باری نے ہم میں آکر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو، غرض مذہب مجسّم میں آکر
اثر یہ تھا عیسوی نفس کا کہ زندہ ہوتا تھا جسمِ بے جاں
یہاں تو ہم مر رہے ہیں لیکن بتانِ ترسا کے دم میں آکر
جو ضعف پوشیدہ دیں میں تھا، عیاں ہُوا وہ ترے عمل سے
زبانِ واعظ میں تھی جو طاقت، چھپی وہ میرے قلم میں آکر
جو شوقِ مستی ہو دل کے اندر تو آپ سُنیئے کلامِ اکبرؔ
اگر ہو ذوقِ شراب و ساغر تو بیٹھیے بزمِ جم میں آکر

(۷۸)

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر   ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر
ذی علم مصنّف ہو، کہ ہے حامیِ ملّت   ارمان نہیں کوئی اس ارمان سے بہتر
انسان اگر معرفتِ حق سے ہو غافل   کیا شک کہ بہائم ہیں اُس انسان سے بہتر
مخلوقِ الٰہی میں عمل پہ جو نظر کر   انساں سے بدتر ہے، نہ انساں سے بہتر
ہر حال میں ہے دل کے لیے حافظ و ناصر   دولت کوئی ممکن نہیں ایمان سے بہتر
یہ ہے کہ جھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن   سن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بہتر
سُن لے جو توجہ سے بزرگوں کی نصیحت   پھر کانِ جواہر نہیں اس کان سے بہتر

---

[۱] SCIENTIFIC، سائنٹفک

(۷۹)

خدائے عقل کی نعمت عطا کی مہرباں ہو کر   ادائے شکر کر دیوانۂ حسنِ بتاں ہو کر
کھلیں وہ شرمگیں آنکھیں شبِ وصلت نہاں ہو کر   محبت کی نظر نے دی اجازت مجھ کو، ہاں ہو کر
کمال اس دامِ گیسو میں تھا یا کچھ نقص تھا دل میں   پھنسا آخر یہ کیونکر طائرِ عرش آشیاں ہو کر
عطا کر قسمتِ تصنیفِ سعدی یا رب اُس گل کو   پھلے پھولے زمانہ میں گلستاں، بوستاں ہو کر
ترا قد دیکھ کر اے گل میں تجھ کو سرو سمجھا تھا   مگر تو سرو سے بھی بڑھ گیا آخر رواں ہو کر
مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی   کوئی ان سے نہیں کہتا، نہ نکلو یوں عیاں ہو کر
جھکایا ہے جبیں کو آستانِ یار پہ میں نے   سعادت ہے اگر رہ جائے سنگِ آستاں ہو کر
کمال ان کی عنایت ہے نہایت مہربانی ہے   کہیں آئیں محلّے میں، اُنہیں جانا یہاں ہو کر
اگر اللہ دیتا قوتِ گفتار شمعوں کو   تو دادِ ہمتِ پروانہ دیتیں یک زباں ہو کر
ہوائے نفس سے ہو کر الگ الفت میں مر جانا   وہ حالت ہے کہ رہ جاتی ہے زندہ داستاں ہو کر
مجالِ گفتگو کس کو ہے اُن کے حسن کے آگے   زبانیں بند کر دیں اُن بتوں نے بے زباں ہو کر
قریبِ ختم تھی مجلس کہ آ نکلے اِدھر وہ بھی   غرض واعظ کی محنت رہ گئی سب رائیگاں ہو کر
یہ ارشاد آپ کا بالکل بجا ہے حضرتِ واعظ   مگر میں کیا کہوں، کچھ بن نہیں پڑتی جواں ہو کر
نگاہیں مل گئیں تھیں میری اُن کی رات محفل میں   یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر
بہت مشکل ہوا ہے ختم کرنا مجھ کو نامے کا   وفورِ شوق سے رکتا نہیں خامہ رواں ہو کر
پھری قسمت، ہوا کی آپ کی زلفوں کے صدقے میں   پریشاں ہو کے اٹھی تھی، چلی عنبر فشاں ہو کر

(۸۰)

بنو گے خسروِ اقلیمِ دل شیریں زباں ہو کر   جہانگیری کرے گی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر
دلوں کا قرب حاصل کیجیے راحت رساں ہو کر   نفس نے سینہ میں جا پائی ہے آرامِ جاں ہو کر
غریبوں سے لپٹ جاتی ہے دنیا فکرِ ناں ہو کر   امیروں کے مقابل ہوتی ہے حسنِ بتاں ہو کر
پئے ضبطِ محبت عقل مذہب میں ہوئی داخل   بنی وجہِ عناد آخر نصیبِ دشمناں ہو کر
مجالِ گفتگو کس کو فنا کا جب پیام آیا   ہوئی خاموش آخر شمع بھی آتش زباں ہو کر
کسی نے خوب فرمایا اک اسلامی کمیٹی میں   نمازی ہیں ندارد، رہ گئی خالی اذاں ہو کر
کرم تھا دوستوں پر علمِ ایامِ گذشتہ میں   ستم ہے اس زمانہ میں نصیبِ دشمناں ہو کر
جو دانشمند ہیں، وہ یوں دعا دیتے ہیں لڑکوں کو   نہ ہو مکّار پیری میں، نہ ہو عاشق جواں ہو کر
جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں   یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر
پھنسایا جھوٹی باتوں سے مجھے دنیا نے غفلت میں   سُلایا مجھ کو اُس مکّار نے افسانہ خواں ہو کر
تمہیں اوج و تعلّی کا مزہ، مجھ کو تواضع کا   یہاں تو خاکساری ہے، رہو تم آسماں ہو کر
بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے   دل اچھا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بد زباں ہو کر
زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی   خدا کی رحمتوں نے اُس کو ڈھانکا آسماں ہو کر
ضعیفی زور پر آئی، ہوئے بے دست و پا اکبرؔ   کیا بچوں سے بدتر ہم کو پیری نے جواں ہو کر

(۸۱)

روش ہو راست آزادانہ ہو ساتھ اس کے تواضع بھی
چلو تم مثلِ تیر اکبرؔ، جھکو لیکن کماں ہو کر

(۸۲)

خیالِ عزتِ مجنوں نہ چھوڑا اے دامنِ مجنوں   نہیں ہے ہوش اُس کو خود تو اُڑ جا دھجیاں ہو کر
نگینِ بے بہا تھا دل، ضرورت تھی حفاظت کی   ترا نقشِ تصور اس میں بیٹھا پاسباں ہو کر
مری زردیٔ رخ کا ذکر ہے لب ہائے جاناں پر   مزہ دیکھو کہ حلوے میں پڑا ہوں زعفراں ہو کر
بلندیٔ مراتب سے تلوّن ہو گیا پیدا   بدلتے ہیں ہزاروں رنگ، اب وہ آسماں ہو کر
اسی سے آشکارا ہے بلندی تیرے ایواں کی   پڑا ہے آسماں بھی تیرے در پہ آستاں ہو کر
میں پچھتایا تلاشِ پیر کی دے کر صلاح اُن کو   ہوئے وہ اور بھی ظالم مریدِ آسماں ہو کر
بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر   (ق) عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر
بچھا فرشِ زمرد اہتمامِ سبزۂ تر میں   چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر
عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں   ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر
بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے   ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہو کر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا   کسی نے یاسمن ہو کر، کسی نے ارغواں ہو کر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں   صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگِ اذاں ہو کر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو   ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر
زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں   خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر
نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانہ کی   کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہو کر

(۸۳)

بہار آئی ہے اک آئینۂ معنی نشاں ہو کر   چمن میں بوئے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہو کر
خموشی میں جمالِ شاہدِ معنی نظر آیا   عبث الجھے رہے لفظوں میں ہم محوِ بیاں ہو کر
قیامت کیا ہے خلقت کو نہ صبر آنا جدائی پر   یہ فطرت خود بنے گی صور سرگرمِ فغاں ہو کر
جو راہِ معرفت میں کاروانِ دل قدم رکھے   تو ساری کائنات اُڑ جائے گردِ کارواں ہو کر
کیا اچھا جنہوں نے دار پر منصور کو کھینچا   کہ خود منصور کو مشکل تھا جینا راز داں ہو کر
تری فرقت میں ساری عمر جو تکلیف اُٹھاتے ہیں   اجل لے جاں، انہیں کو آتی ہے آرامِ جاں ہو کر
اشارہ زاہدانِ خشک سے ہے دخترِ رز کا   ولی بنیے مریدِ حضرتِ پیرِ مغاں ہو کر
عجب کیا ہے جو دو دن بے ہوشی کے دنیا میں   چلے جب ہو کے رخصت آئے جس دن میہماں ہو کر
الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے مواقع پر   کہ تا افشا نہ کر دے رازِ ہستی رازداں ہو کر
نمایاں ہیں ترے دامن کی بیلیں کہکشاں ہو کر   اس اطلس کی زمیں اے ماہ چمکی آسماں ہو کر
ہوا زردِ الفت گل رو میں زار و ناتواں ہو کر   مرے باغِ جوانی میں بہار آئی خزاں ہو کر
مری نسبت یہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہو کر   قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بڈھا جواں ہو کر
بہارِ عمر جب آخر ہوئی، واپس نہیں آتی   درخت اچھے کہیں پھلتے ہیں نخلے سے جواں ہو کر
زبانیں دیکھتی ہیں آفتِ تقریر کو، چپ ہیں   نگاہیں داستانیں کہہ رہی ہیں بے زباں ہو کر
اُبھارا اس قدر اس عہد میں روشن خیالوں نے   کہ چل نکلی زمیں قائم مقامِ آسماں ہو کر
بنی آدم میں اتنے مہرِ طلعت ہو گئے پیدا   کہ چل نکلی زمیں قائم مقامِ آسماں ہو کر
دکھا کر ابرو و مژگاں نظر ان کی یہ کہتی ہے   کسی سے کیوں جھجکیں ہم صاحبِ تیغ و سناں ہو کر
بٹھا رکھا ہے اس نامہرباں نے منتظر کر کے   خدا سے ہے مجھے امید اٹھا لے مہرباں ہو کر
لطیف الطبع، تیز و تند، رنگین و نشاط افزا   تمہیں سی ہو گئی ہے دخترِ رز بھی جواں ہو کر

(۸۴)

کیا افسردہ نافہموں نے مجھ کو ہمنشیں ہو کر   طبیعت رک گئی افسوس معنی آفریں ہو کر
ہجومِ یاس نے مطلق جگہ باقی نہیں رکھی   تمنّا پھر گئی آخر درِ دل سے حزیں ہو کر

(۸۵)

ہر لحظہ دیکھتا ہوں زمانہ کی شان اور   گویا زمین اور ہے، اور آسمان اور
دل اُس بتِ فرنگ سے ملنے کی شکل کیا   میرا طریق اور ہے، اس کی ہے شان اور
کیوں کر زباں ملانے کی حسرت بیاں کروں   اُس کی زبان اور ہے میری زبان اور

(۸۶)

میلِ نظر ہے زلفِ مس کج کلاہ پر
سودا چڑھا رہا ہوں میں تارِ نگاہ پر
اچھا ہُوا صفت ابرِ برقِ حسن و عشق
اُن کو ہنسی جو آ گئی عاشق کی آہ پر

(۸۷)

یا شہیدِ جلوۂ ساقی ہو یا مے خانہ چھوڑ
ہوش کی پروا نہ کر یا شیشہ و پیمانہ چھوڑ
دین بچنے کا نہیں ان صورتوں کے سامنے
یا پہن زنّار اکبر یا درِ بُت خانہ چھوڑ

(۸۸)

جب مانتے ہو تم کہ خدا بھی ہے کوئی چیز
پھر کیوں نہیں کہتے کہ دُعا بھی ہے کوئی چیز
واعظ نے کہا خوفِ خدا بھی ہے کوئی چیز
اس بُت نے کہا میری ادا بھی ہے کوئی چیز
کہتا ہے معالج کہ دوا کا بس اثر دیکھ
فریاد زباں پہ ہے کہ مزا بھی ہے کوئی چیز
پنہاں ہیں خموشی و تصوّر میں کمالات
لیکن اثرِ لفظ و صدا بھی ہے کوئی چیز
کھلتے ہوئے غنچے نظر آتے ہیں ہزاروں
معلوم ہُوا عقدہ کُشا بھی ہے کوئی چیز
بے ساختہ آتی ہے مصیبت میں یہ لب پر
فطرت ہی کی جانب سے دعا بھی ہے کوئی چیز
معنی کو ضرورت نہیں الفاظ کی اکبر
سب جانتے ہیں حسنِ صدا بھی ہے کوئی چیز

(۸۹)

کم سن ہو ابھی، تجربہ دنیا کا نہیں ہے
تم خود ہی سمجھ لو گے خدا بھی ہے کوئی چیز
تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر
انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز
ہم مصلحتِ وقت کے منکر نہیں اکبر
لیکن یہ سمجھ لو کہ وفا بھی ہے کوئی چیز
میں نے کہا کیوں لاش پہ آفت کی سے مرتا، ق،
ہوٹل کی طرف جا کہ غذا بھی ہے کوئی چیز
کہتے نے کہا ہو یہ جہالت کہ تعصب
لیکن مرے نزدیک وفا بھی ہے کوئی چیز

(۹۰)

طبع کرتی ہے ترے عشق کی تائید ہنوز
ان جفاؤں پہ بھی ٹوٹی نہیں امید ہنوز
قصۂ شوق کو چھیڑا ہے ازل سے دل نے
خاتمے پہ مگر آئی نہیں تمہید ہنوز
نہ خوشی ہوتی ہے دل کو، نہ طبیعت کو اُبھار
پھر بھی سالانہ کئے جاتے ہیں ہم عید ہنوز
اور کچھ اس کے سوا کر نہیں سکتے ناصح
بس چلی جاتی ہے تعلیم کی تاکید ہنوز
کس قدر حارج تھے سید کے وہ اعزازِ نظام
علما دے رہے ہیں قوم کو تہدید ہنوز
دل تو مدت سے ہے خاکِ درِ پیر اکبر
ہاں زباں پر ہے مگر کفر کی تردید ہنوز

(۹۱)

غمِ جاناں سے ہیں کرنے کا نہیں جانِ عزیز
ہے سوا جان سے بھی مجھ کو یہ مہمانِ عزیز

(۹۲)

نگاہ اُس بُتِ بے دیں کی ہے شراب فروش
عجب نہیں مجھے مستی کرے شباب فروش
کہا جو اُس نے کہ اب میں پھروں گا بے پردہ
منہ اُس کا دیکھ کے بس رہ گئے نقاب فروش

(۹۳)

اہلِ مذہب میں زیادہ تر ہے بس لفظی نزاع
ایک ہی مالک جہاں کا ہے تو پھر کیسی نزاع
ایک ہے پریوں کا قائل، ایک کو انکار ہے
سب نزاعوں میں جو ہے تو بس یہی ہی نزاع
علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم
صلح رہتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع

(۹۴)

شیخ مائل ہوئے ہیں ساغر و مینا کی طرف
برکتیں نشہ کی لائیں گی کلیسا کی طرف
میں پھنسانے لگا کیوں دامِ بلا میں دل کو
خود کھنچا جاتا ہے اس زلفِ چلیپا کی طرف
دوستوں نے انہیں حضرت کو خضر سمجھا ہے
اُن کی چالیں تو لئے جاتی ہیں اعدا کی طرف

جوش گریہ ہے یہ کیوں موسمِ پیری میں مجھے
لوگ جاڑوں میں تو کم جاتے ہیں دریا کی طرف

(۹۵)

گنتی میں زیادہ نہیں، ہے قول مرا ایک
بے خوف میں کہتا ہوں اسے، یعنی خدا ایک
تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک
تھی تین پہ سوئی، مری ہیبت سے بجا ایک
کہتے ہو مسلمان ہیں اللہ کے طالب
دس پانچ نہیں، مجھ کو دکھا دو تو بھلا ایک
اللہ کی جانب متوجہ رہیں احباب
صف ہو گئی شکستہ، جو کہیں رُخ نہ رہا ایک
یا رب رہے جمعیتِ مسلم یونہی قائم
رُخ ایک، رسول ایک، کتاب ایک، خدا ایک

(۹۶)

پہنچی نگاہِ عقلِ رسا دُور دُور تک
لیکن نہ جا سکی کبھی اوجِ حضور تک
جامِ مئے الست سے ایسی تھی بے خودی
ہستی کا اپنی حس نہ ہوا نفخِ صور تک

(۹۷)

کھینچی ہے ہم پہ اس سفاک کی تیغِ ستم اب تک
یہ کیا سچ ہے کہ ان زخموں پہ بھی زندہ ہیں اب تک

(۹۸)

ملت کو جو دیکھو تو نہیں حامیِ دیں ایک
قوت کو جو پوچھو، کہیں دو دل بھی نہیں ایک
دل تم نے لیا، دین لیا، مال نہ چھوڑا
باقی ہے مرے پاس فقط جانِ حزیں ایک
ہر ایک کو دو دم نے کیا تیغِ ستم سے
اب رہ گئے ہو عرصۂ ہستی میں تمہیں ایک

(۹۹)

کیا جانیے سید تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک
منطق بھی تو اک چیز ہے اے قبلہ و کعبہ
دے سکتی ہے کام آپ کی واللہ کہاں تک
افلاک تو اس عہد میں ثابت ہوئے معدوم
اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک
کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک
مرنا بھی ضروری ہے، خدا بھی ہے کوئی چیز
اے حرص کے بندو! ہوسِ جاہ کہاں تک
تحسین کے لائق ترا ہر شعر ہے اکبر
احباب کریں بزم میں اب واہ کہاں تک

(۱۰۰)

مل گیا شرع سے شراب کا رنگ
خوب بدلا غرض جناب کا رنگ
چل دیئے شیخ صبح سے پہلے
اُڑ چلا تھا ذرا خضاب کا رنگ
پائی ہے تم نے چاند سی صورت
آسمانی ہے نقاب کا رنگ
صبح کو آپ ہیں گلاب کا پھول
دوپہر کو ہے آفتاب کا رنگ
لاکھ جانیں نثار ہیں اُس پر
دیدنی ہے ترے شباب کا رنگ
ٹکٹکی بندھ گئی ہے بوڑھوں کی
دیدنی ہے ترے شباب کا رنگ
جوش آتا ہے، ہوش آتا ہے
دیدنی ہے ترے شباب کا رنگ
رندِ عالی مقام ہے اکبر
بُو ہے تقوٰی کی، اور شراب کا رنگ

(۱۰۱)

عزیزانِ وطن سوچیں، سوال سرد سے کیا حاصل
یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل
نہ سحرِ چشمِ جاناں ہے، نہ لطفِ غمزۂ ساقی
تو پھر صحنِ چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل
نہ ہو ادراک خالق کا، نہ اُبھرے شوق طاعت کا
تو ایسے ذہن سے اکبر اور ایسے حس سے کیا حاصل

(۱۰۲)

گو چکا چوند کا عالم ہے نئی روشنی میں
ہے مگر پیشِ نظر عرش کا تارا اسلام

رغبتِ کفر سے اللہ بچائے سب کو
نورِ افگن رہے ہر سینہ میں پیارا اسلام

اُن کی خواہش مری نسبت ہو جو کچھ وہ جانیں
میں تو کرتا ہوں دعا، لائیں نصاریٰ اسلام

اُن کے مضبوط جہازوں کی مددگار رہے آگ
مری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام

خوفِ حق، الفتِ احمدؐ کو نہ چھوڑے اکبر
منحصر ہے انہیں دو لفظوں پہ سارا اسلام

(۱۰۳)

قرار نہیں ذرا بھی مجھے، یہ کیسی حسب کہو تو صنم
اُٹھو بھی بس اب کرو نہ غضب، گزر گئی شب خدا کی قسم

فراق کی شب ہوگی سحر، اجل سے کہو کہ آئے ادھر
عذاب میں ہوں نجات ملے، کہاں تلک اب سہوں میں ستم

خوشی بھی ہوئی الم بھی ہوا، مزے بھی ملے ستم بھی سہے
نکل چکی دل کی ساری ہوس نظر میں ہے اب سوادِ عدم

(۱۰۴)

ہوئے ہیں مست مئے عاشقی کے جام سے ہم
خوشا نصیب چھٹے عاقلی کے دام سے ہم

نہیں کوئی شبِ تارِ فراق میں دل سوز
خموش شمع ہے خود جل رہے ہیں شام سے ہم

زمانہ جس کو مٹائے، بھلائے خلق جسے
عبث ہے خوش ہوں جو ایسے نشان و نام سے ہم

خوشی بہت ہے جہاں میں، ہمارے گھر نہ سہی
ملول کیوں رہیں دنیا کے انتظام سے ہم

خوشامدی کو مبارک ہو رات دن چکر
یہاں تو رکھتے ہیں بس کام اپنے کام سے ہم

اخیر عمر میں آیا ہمیں خیالِ مآل
بہت دنوں میں ہوئے واقف اپنے کام سے ہم

گناہ کیا جو کہیں ہم بھی السلام علیک
کہ لطف اٹھاتے ہیں اس بت کی رام رام سے ہم

ہمیں ہے یاد وہ عہدِ الست اے غافل
سہل سکیں گے نہ دنیا کی دھوم دھام سے ہم

چلا ہے فلسفہ لے کر ہمیں سوئے ظلمات
بہت ہی تنگ ہیں اس اسپِ بے لگام سے ہم

خیالِ یار میں اُلجھا ہوا ہے تارِ نفس
کبھی نہ ہوں گے رہا عاشقی کے دام سے ہم

جبیں کے عشق سے آخر بچی نہ جان اپنی
تمام ہو گئے اس ماہِ ناتمام سے ہم

اگر وہ کہتے ہیں اصلی تو ہم کہیں گے یہی
ضرور کیا ہے، کریں بحث جا کے آم سے ہم

ملا نہ امن شبستانِ دہر میں دم بھر
چراغِ صبح رہے اس جہاں میں شام سے ہم

اب اور چاہیے ٹٹو کے واسطے کیا بات
یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام سے ہم

نگاہِ پیرِ مغاں کہتی ہے عندیوں سے
رہِ سلوک میں واقف ہیں ہر مقام سے ہم

فلک کے دور میں ہارے ہیں بازیِ اقبال
اگرچہ شاہ تھے، بدتر ہیں اب غلام سے ہم

ہماری کوہ نوردی نہیں ہے بے معنی
کہ اُنس رکھتے ہیں اک کبکِ خوشخرام سے ہم

ہمیں خراب کرے گا خیالِ ابروئے یار
مفر نہ پائیں گے اس تیغِ بے نیام سے ہم

سنا ہے حلّتِ بادہ کا ہو گیا فتویٰ
خدا نے فضل کیا، بچ گئے حرام سے ہم

لیے ہے ہاتھ میں نامہ، کھڑا ہے چپ قاصد
پتہ ہے گھر کا، نہ واقف ہیں ان کے نام سے ہم

اشارہ کرتی ہے ساقی کو چشمِ مست اکبر
کہ دو جہاں کو بھلاتے ہیں جام سے ہم

چھڑی اٹھائی خموشی سے چل دیے اکبر
سفر میں رکھتے نہیں کام تام جھام سے ہم

(۱۰۵)

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

مری بیتابیاں بھی جزو ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں

وہی پریاں ہیں اب بھی راجہ اندر کے اکھاڑے میں
مگر شہزادۂ گلفام پر شیدا نہیں ہوتیں

یہاں کی عورتوں کو علم کی پروا نہیں بے شک
مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پروا نہیں ہوتیں

تعلق دل کا کیا باقی میں رکھوں بزمِ دنیا سے
وہ دلکش صورتیں اب انجمن آرا نہیں ہوتیں

ہوا ہوں اس قدر افسردہ رنگِ باغِ ہستی سے
ہوائیں فصلِ گل کی بھی نشاط افزا نہیں ہوتیں

قضا کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

(۱۰۶)

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

اُن کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں
دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں

ہوں اسیرِ طلسمِ بحرِ فنا
نقش بر آب ہی میں مرتا ہوں

بحرِ ہستی میں ہوں مثالِ حباب
مٹ ہی جاتا ہوں جب اُبھرتا ہوں

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں، بات کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

لَنْ تَرَانِیْ نہیں ہے مانعِ عشق
میں ترے نام ہی پہ مرتا ہوں

آپ کیا پوچھتے ہیں میرا مزاج
شکر اللہ کا ہے، مرتا ہوں

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

(۱۰۷)

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

غافلوں کے لطف کو کافی ہے دنیاوی خوشی
عاقلوں کو بے غمِ عقبیٰ مزا ملتا نہیں

کشتیٔ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

عاقلوں کو کیا سناؤں داستانِ عشقِ یار
سونے والے ملتے ہیں درد آشنا ملتا نہیں

زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
اُن کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں

صرفِ ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

(۱۰۸)

جس پہ دل آیا ہے وہ شیریں ادا ملتا نہیں
زندگی ہے تلخ، جینے کا مزا ملتا نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ بدنامی سے بچنا چاہیے
کہہ دو، بے اس کے جوانی کا مزا ملتا نہیں

اہلِ ظاہر جس قدر چاہیں کریں بحث و جدال
میں یہ سمجھا ہوں، خودی میں تو خدا ملتا نہیں

چل بسے وہ دن کہ یاروں سے بھری تھی انجمن
ہائے افسوس آج صورت آشنا ملتا نہیں

منزلِ عشق و توکل منزلِ اعزاز ہے
شاہ سب بستے ہیں یاں، کوئی گدا ملتا نہیں

بارِ تکلیفوں کا مجھ پر بارِ احساں سے ہے سہل
شکر کی جا ہے اگر حاجت روا ملتا نہیں

چاندنی راتیں بہار اپنی دکھاتی ہیں تو کیا
بے ترے مجھ کو تو لطف اے مہ لقا ملتا نہیں

معنیٔ دل کا کرے اظہار اکبر کس طرح
لفظ موزوں بہرِ کشفِ مدعا ملتا نہیں

(۱۰۹)

کس قدر بے فیض ان روزوں ہوائے دہر ہے
بوئے گل کو دامنِ بادِ صبا ملتا نہیں

فیضِ باطن سے مدد لے عشق کا ہو جا مرید
اہلِ ظاہر کے ملائے تو خدا ملتا نہیں

ڈھونڈتے ہیں لوگ اس دنیا میں اطمینانِ دل
کچھ بھی لیکن داغِ حسرت کے سوا ملتا نہیں

نیشنل[1] وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم
آفیشل[2] عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

دل کی ہمدردی سے کچھ تسکین ہوتی تھی مگر
اب تو اس مظلوم کا بھی کچھ پتا ملتا نہیں

بیکسی میری نہ پوچھ اے جادۂ راہِ طلب
کارواں کیسا کہ کوئی نقشِ پا ملتا نہیں

اس کو اربابِ طریقت میں کروں میں کیا شمار
آپ کی زلفوں سے جس کا سلسلہ ملتا نہیں

---

[1] قومی، NATIONAL   [2] سرکاری، OFFICIAL

جب کہا میں نے، مرا دل مجھ کو واپس کیجئے
ناز و شوخی سے وہ بولے کھو گیا، ملتا نہیں

جب کہیں ملتا ہے، کہتا ہے نہ ملنے کا گلہ
اور جو ملنے جاتا ہوں، مردِ خدا ملتا نہیں

یوں کہو، مل آؤں اُن سے لیکن اکبرؔ سچ یہ ہے
دل نہیں ملتا تو ملنے کا مزا ملتا نہیں

(۱۱۰)

پھر اور کون ہوگا جو آئے ہمارے کام
ہو گئے شریکِ حال ہمارے نہ جب تمہیں

دنیا کے انتظام پہ اکبرؔ نہ ہو ملول
انصاف یہ نہیں ہے کہ پا جاؤ سب تمہیں

(۱۱۱)

یہ فقط نہیں ہے کافی کہ مرا مزاج پوچھیں
مرے دردِ دل کو سمجھیں مری احتیاج پوچھیں

تھا زمانہ کل موافق، مجھے پوچھتا تھا ہر اک
ہیں تو ان کو دوست سمجھوں کہ جو مجھ کو آج پوچھیں

جنہیں تیری لو لگی ہے، وہ جہاں سے بے خبر ہیں
نہ وہ مال و جاہ ڈھونڈیں، نہ وہ تخت و تاج پوچھیں

جو مرض ہے ہم کو لاحق، وہی شرطِ زندگی ہے
جو نہ چاہیں اپنا جینا تو کوئی علاج پوچھیں

تو خود اُن کو لکھ عریضہ، نہ کر انتظار اکبرؔ
انہیں کیا غرض ہے ایسی کہ ترا مزاج پوچھیں

(۱۱۲)

موسمِ گل میں صبا کو جو ہوئی ناچ کی دُھن
لحنِ بلبل سے بھی پیدا ہوئی کھماج کی دُھن

یہ کلاک اچھے سروں میں تو بجا کرتی ہے
مفت پیدا ہوئی ہے آپ کو کیوں واچ کی دُھن

نغمہ سنجی سے بھی آتی تھی خواتین کو شرم
سازِ مغرب سے مگر ہو گئی اب ناچ کی دھن

(۱۱۳)

کبھی دل کی ترنگ کا رنگ یہ ہے کہ میں سارے جہاں کو پیار کروں
کبھی طبع میں موج سماتی ہے یہ کہ خود اپنی خودی سے بھی عار کروں

مجھے پیاری اگرچہ ہے جانِ حزیں، مگر ان سے سوا یہ عزیز نہیں
وہ گھڑی بھی جو آئے کہ پاؤں اُنہیں اور اُنہیں پہ میں اس کو نثار کروں

کبھی غنچہ ہے یہ، کبھی شعلہ ہے یہ، کبھی آئینہ ہے، کبھی قطرۂ خوں
یہ ہے صفحۂ دہر پہ دل کا جو رنگ اسے کون سی مد میں شمار کروں

(۱۱۴)

فتنہ نہیں، فساد نہیں، شور و شر نہیں
یا زن نہیں، زمین نہیں، اور زر نہیں

مانا کہ ہر طرح سے میں بے اختیار ہوں
پر یہ بتاؤ کہ تم کو خدا کا بھی ڈر نہیں

(۱۱۵)

دل زیست سے بیزار ہے، معلوم نہیں کیوں
سینے میں نفس بار ہے، معلوم نہیں کیوں

اقرارِ وفا یار نے ہر اک سے کیا ہے
مجھ سے ہی بس انکار ہے، معلوم نہیں کیوں

ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم
دہلی میں یہ دربار ہے، معلوم نہیں کیوں

جس سے دلِ رنجور کو پہنچی ہے اذیت
پھر اس کا طلبگار ہے، معلوم نہیں کیوں

اے دل ترا نطق رہ دل آویز ہے لیکن
پہلو میں ترے خار ہے، معلوم نہیں کیوں

افلاس میں مستی تو مجھے خوش نہیں آتی
ساقی کو یہ اصرار ہے، معلوم نہیں کیوں

انداز تو عشاق کے پائے نہیں جاتے
اکبرؔ جگر افگار ہے، معلوم نہیں کیوں

جینے پہ تو جاں اہلِ جہاں دیتے ہیں اکبرؔ
پھر یہ تجھے دشوار ہے، معلوم نہیں کیوں

(۱۱۶)

بھولے پن سے پوچھتے ہیں تیری خاطر کیا کریں
اس محل پر رازِ دل ہم اُن پہ ظاہر کیا کریں

ہیں کلکٹر نزع میں، عملے کھڑے ہیں دم بخود
جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں

ان کی آنکھوں کی خطا کیا، خود ہیں ہم الفت میں مست
آپ ہم ایمان چھوڑیں تو یہ کافر کیا کریں

منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، سر قدم پر رکھ دیا
پھر بھی ہے تیوری چڑھی ہم پر اب آخر کیا کریں

(۱۱۷)

بحثیں فضول تھیں، یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

ہے ملک اُدھر تو قحط زدہ، اُس طرف یہ وعظ
لٹتے وہ کھا کے پیٹ بھرے پان سیر میں

ہیں غش میں شیخ دیکھ کے حسنِ مسِ فرنگ
بچ بھی گئے تو ہوش انہیں آئے گا دیر میں

چھوٹا اگر میں گردشِ تسبیح سے تو کیا
اب پڑ گیا ہوں آپ کی باتوں کے پھیر میں

(۱۱۸)

صبا نے دفترِ گل کے بہت ورق اُلٹے
مگر وہ بوئے معانی روئے یار کہاں

میں خاک میں بھی اگر مل گیا تو کیا اُمید
وہ آستانہ کہاں اور مرا غبار کہاں

خیال ایسا نہ فرمائیے مری نسبت
بھلا حضور کہاں اور یہ خاکسار کہاں!

(۱۱۹)

ہجر کی رات یوں ہوں میں حسرتِ قدِ یار میں
جیسے لحد میں ہو کوئی حشر کے انتظار میں

دل ہے طولِ فرقتِ قامت و روئے یار میں
بھاڑ میں جائیں سرو و گل، آگ لگے بہار میں

سوزِ نہاں ہے فرقتِ شمعِ جمالِ یار میں
آگ سی ہے لگی ہوئی رشتۂ جانِ زار میں

کیا میں خوشی سے ہوں، بسا کوچۂ زلفِ یار میں
کوئی بلا میں کیوں پھنسے دل ہو جو اختیار میں

ہونے دے انقلابِ چرخ، کوہِ الم کوئے اُٹھا
وزن مگر سبک نہ ہو دیدۂ اعتبار میں

پایا ہوائے دہر کو دشمنِ انبساطِ دل
کھلتے ہیں کب گلِ مراد گلشنِ روزگار میں

کر دیا ایسا زار و خشک منزلِ عشق نے مجھے
خار چبھے گا مجھ میں کیا، میں ہی چبھا ہوں خار میں

آئی نسیم باغ میں، میرے یہاں نہ آئے تم
لالہ و گل بہت کھلے، دل نہ کھلا بہار میں

مستیِ عشق کا مزا عہدِ شباب ہی میں ہے
بادہ کشی کا لطف اگر ہے تو فقط بہار میں

مہر و کرم نے آپ کے ذرہ نوازیاں یہ کیں
بات تو ورنہ کچھ نہ تھی بندۂ خاکسار میں

تم تو بھلا کے وعدے کو شام سے پڑ کے سو رہے
جاگا کیا میں صبح تک حسرت و انتظار میں

سینے سے تیرے متصل شاید اسے قرار ہو
گوندھ دے میرے دل کو بھی اپنے گلے کے ہار میں

رنگِ جہاں کے ساتھ کاش میری بھی ہو تو یوں بسر
جیسے گل و نسیم کی نبھ گئی چاہ پیار میں

وقعتِ ریشِ شیخ کو دیکھ کے یہ ہُوا یقیں
خرمنِ خس بھی شرط ہے گلشنِ اعتبار میں

کھلنے پہ آئی ہے کلی، بلبلوں کو ہے بے کلی
حسن تو ہے ابھار پر، عشق ہے انتظار میں

ذکر مرا ہے کو بکو، پھیلی ہے بات چار سو
آتی ہے کچھ جنوں کی بو، بیٹھا ہوں کوئے یار میں

سینے میں کیوں خلش ہے یہ، جان میں کیوں تپش ہے یہ
عقل کی سرزنش ہے یہ دل کو رکھا اختیار میں

الفتِ زلف قہر ہے، حق میں ہمارے زہر ہے
بحرِ بلا کی لہر ہے، روح ہے انتشار میں

بھونرے ہیں مستِ بوئے گل، تیتریاں ہیں سوئے گل
سب کو ہے جستجوئے گل موسمِ خوشگوار میں

سنبلِ تر پہ خوب ہے جلوۂ شبنمِ لطیف
زلفِ پری کے تار ہیں گوہرِ آبدار میں

(۱۲۰)

دورِ شراب لالہ فام کیوں نہ ہو لالہ زار میں
کچھ تو مزا ہو زیست کا، کچھ تو کھلیں بہار میں

بادِ صبا کا ناچ ہو، نغمہ سرا ہوں بلبلیں
شاخوں کی گود میں ہوں گل، وہ ہوں مرے کنار میں

ہو اثرِ سرورِ مے کیف میں ہو ہر ایک شے
دل میں ہو زمزموں کی لے، بول بجیں ستار میں

آنکھ کی ناتوانیاں، حسن کی لن ترانیاں
پھر بھی ہیں جاں فشانیاں، کوچۂ انتظار میں

عشق میں نفع ہے ضرور، اشک گریں تو ہیں گہر
یاں تو ہیں پارۂ جگر لعل کے اعتبار میں

عشق ہو کس طرح نہاں، لب پہ ہے غم کی داستاں
کہتے ہیں اب نہیں زباں، دل نہیں اختیار میں

(۱۲۱)

بے بہرہ ہیں نور سے وہ آنکھیں جو تیرے لیے غمناک نہیں
سرمہ وہ بصرافروز نہیں جس میں ترے در کی خاک نہیں

بیگانہ سرور سے ہے وہ دل جو تیرے لیے غمناک نہیں
سرمہ وہ بصرافروز نہیں جس میں تیرے در کی خاک نہیں

(۱۲۲)

اُس رخ پہ نظر کا شوق جو ہو، آنکھوں کو تُو اپنی اشک سے دھو
بے اس کے طہارت دل کی نہیں، بے اس کے نگاہیں پاک نہیں

رشتہ تو بتوں سے الفت کا قائم ہی ہے دل میں قدرت سے
زنار پہننی باقی ہے، اس میں بھی مجھے کچھ باک نہیں

ہے مستیِ عشق نصیب مجھے مشغول میں رہتا ہوں دل سے
حاجت نہیں مے کی میرے لیے، انگور کی مجھ کو تاک نہیں

صورت کی ہے اُن میں جلوہ گری، معنی سے ہے بالکل بےخبری
ہیں کام تو اُن کے صاف بہت، نیت کے مگر یہ پاک نہیں

پلٹیں یہ نگاہیں لاکھ طرح، خود اپنی مشاہد ہو نہ سکیں
کیا اصل و حقیقت ہے میری، ادراک کو یہ ادراک نہیں

ان مدعیوں کا طرزِ عمل اکبر یہ شہادت دیتا ہے
پڑھنے کو کتابیں پڑھ لی ہیں سمجھے یہ مگر کچھ خاک نہیں

(۱۲۳)

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

حضرتِ ہوش ہیں گو دل کے وفادار رفیق
آپ کی یاد جو آتی ہے تو چل دیتے ہیں

(۱۲۴)

پیش کر دینا شکایت کا تو کچھ مشکل نہیں
لیکن ان کو رنج ہوگا، مجھ کو کچھ حاصل نہیں

عاشقوں کی زیست پر کیونکر نہ رشک آئے مجھے
زندگی کے بھی مزے، پھر موت سے غافل نہیں

کیا طریقِ طالبِ دنیا کی جانب رُخ کروں
دل کو ہو جس میں سکوں، ایسی کوئی منزل نہیں

قوم میں گو علم پھونکے بھی ہوائے زندگی
جان کیا پیدا ہو جب دو شخص بھی یک دل نہیں

(۱۲۵)

تختہ کے قابض وہی، وہ سیم اُن کے ہاتھ میں
ملک اُن کا، رزق کی تقسیم اُن کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آ گیا تارِ امید و بیم اُن کے ہاتھ میں

ہم کو سائے پر جنوں، وہ دھوپ میں مصروف کار
بس یہ ہے اپنی نظر اور سیم اُن کے ہاتھ میں

صبر باقی ہے، نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب کی ہے تذلیل اور تعظیم اُن کے ہاتھ میں

شیخ کی جانب کوئی جاتا نہیں، مکتے ہیں سب
ہے فقط اب کوثر و تسنیم اُن کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ میں، تعلیم اُن کے ہاتھ میں

خوب تر ہم سے ہیں ان کے دل میں اخلاقی اصول
گو نہیں ہے دینِ ابراہیم اُن کے ہاتھ میں

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوش نما دو جیم اُن کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم اُن کے ہاتھ میں

(۱۲۶)

دلیلیں فلسفہ کی نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں
تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہمسن کر نہیں سکتیں

طلب کر دین سے لے محوِ تکبیر جوششِ بامعنی
صدائیں مرغ کی کارِ مؤذن کر نہیں سکتیں

جہاں کی زینتیں راحت رساں ہیں چشمِ عاقل کو
مگر حق جُو کے مضطر دل کو ساکن کر نہیں سکتیں

(۱۲۷)

کچھ نہ پوچھو اے ہمنشیں، میرا نشیمن تھا کہاں
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے، وہ گلشن تھا کہاں

سامنے وہ تھے تو کہتا حالتِ دل کس طرح
ہوش میں اُس وقت میں اے مشفقِ من تھا کہاں

دل جوانی میں ہماری جان کا خواہاں ہوا
آج تک سینے میں پوشیدہ یہ دشمن تھا کہاں

کر لیا ہم نے ازل میں شوق سے عہدِ الست
پیشِ چشم اس وقت یہ دیر و برہمن تھا کہاں

دہر میں خارِ تعلق سے اُلجھتا کس طرح
کر چکا تھا میں جنوں کو نذر، دامن تھا کہاں

(۱۲۸)

سچ ہے کسی کی شان یہ اے نازنیں نہیں
تو ہر جگہ ہے جلوہ گر اور پھر کہیں نہیں

میں نے دفورِ شوق میں شاید سنا نہ ہو
یا شاید آپ ہی نے نہ کی ہو نہیں، نہیں

ان تیوروں کا میں تو ہوں کشتہ شبِ وصال
دل میں ہزار شوق، زباں پہ نہیں، نہیں

دستِ جنوں سے قطع ہُوا پیرہن مرا
دامن نہیں ہے، جیب نہیں، آستیں نہیں

کیا زورِ طبع ہو کہ نہیں کوئی معترض
کیا نکتہ سنجیاں ہوں، کوئی نکتہ چیں نہیں

میں تم سے کیا بتاؤں کہ اس وقت ہوں کہاں
جب تم ہو پیشِ چشم تو پھر میں کہیں نہیں

میری نگاہِ شوق کا اللہ رے اثر
معشوق بھول جاتے ہیں اپنی نہیں، نہیں

جب سے گناہ چھوڑ دیے سب کھسک گئے
اب کوئی میرا دوست نہیں، ہمنشیں نہیں

ہے جس کو شوق اپنی خودی کی نمود کا
سچ پوچھیے تو اس کو خدا پہ یقیں نہیں

طالب خدا کی راہ میں سر رکھے مثلِ ماہ
نورِ جبیں کہاں ہو جو داغِ جبیں نہیں

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب
گویا وہ آسمان نہیں، وہ زمیں نہیں

(۱۲۹)

یہ تماشے ہیں یہیں، زیرِ زمیں تو کچھ نہیں
زندگی جب تک ہے سب کچھ ہے نہیں تو کچھ نہیں

وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا ہی میں ہے سب کچھ حضور
میں یہ کہتا ہوں کہ اے حضرت یہیں تو کچھ نہیں

کارِ دنیا شوق سے کرتے رہو اے دوستو
لیکن اس کے ساتھ بگڑا کارِ دیں تو کچھ نہیں

اُن کا گھر اور اُن کی باتیں دیکھ کر کہنا پڑا
قصرِ عالی شان ہے لیکن مکیں تو کچھ نہیں

(۱۳۰)

ہوائے نفس کا طوفاں ہے بحرِ زندگانی میں
خدا محفوظ رکھے کشتیِ دل کو جوانی میں

نہیں جمتا کسی کا نقش اس دنیائے فانی میں
حباب آسا مٹا، اُبھرا جو بحرِ زندگانی میں

حباب آسا رہی وقعت، جو اُبھرا زندگانی میں
عبث ہے خودنمائی کی ہوا اس بحرِ فانی میں

سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں
بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں

تری پاکیزہ صورت کر رہی ہے حسنِ ظن پیدا
مگر آنکھوں کی مستی ڈالتی ہے بدگمانی میں

اجل کی نیند آ جاتی ہے آخر سننے والے کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں

نسیمِ صبحگاہی نکہتِ گل سے ہے بے پروا
مگر گیسو ترے مصروف ہیں عنبرفشانی میں

حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گزرا
تماشا تھا، ہوا نے اک گرہ دے دی تھی پانی میں

ذرا پوچھو اے ہمنشیں وہ قصۂ عیش و طرب ہم سے
کسے اب یاد ہے، اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

کمر کا کیا ہوں عاشق کھل گئی زلفِ دراز اُن کی
کمر خود پڑ گئی ہے اک بلائے آسمانی میں

اسی صورت میں دلکش خوبیِ الفاظ ہوتی ہے
کہ حسنِ پاک پیدا کر دے جلوہ معانی میں

زبانِ حال سے پروانۂ بسمل یہ کہتا ہے
حضوری ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی میں

فلک نے مضمحل کر کے ہمیں خس کر دیا آخر
بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں
ادائے شکر کر کے احتراز اولیٰ ہے اے اکبرؔ
ہزاروں آفتیں شامل ہیں اُن کی مہربانی میں

(۱۳۱)

پریشاں ہوش کو کرتے ہیں ٹکڑے دل کے کرتے ہیں
مگر عاقل بھی ہیں، کرتے ہیں جو کچھ مل کے کرتے ہیں
حریفوں سے لگاوٹ کرتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں
یونہیں بربادیاں آتی ہیں، یونہیں گھر بگڑتے ہیں
خوشامد کرتے ہیں غیروں کی اور آپس میں لڑتے ہیں
یونہیں بربادیاں آتی ہیں، یونہیں گھر بگڑتے ہیں
بزرگوں سے عداوت، دوستی بادہ فروشوں سے
اور اس پہ مدعی تہذیب کے بن کر اکڑتے ہیں
اُلجھا زلفِ مغرب میں دکھاتا ہے وہ اک دنیا
مگر دینی مقاصد میں ہزاروں پیچ پڑتے ہیں
تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھ کو آتا ہے
یہ اس پر کیوں اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کے گڑتے ہیں
ہمارا جوش میں آنا دکھا ہی دے گا رنگ اپنا
ابھی اس میکدے میں ہم پڑے گوشہ میں سڑتے ہیں
تحیر آپ کی غزلوں پر آتا ہے مجھے اکبرؔ
بتوں پر آپ مرتے ہیں کہ شیطانوں سے لڑتے ہیں

(۱۳۲)

ضرورت جب نہیں پھر طبع کا کیوں رخ بدلتے ہیں
چمن ہوتے ہوئے بے فائدہ کانٹوں میں چلتے ہیں
عوض قرآں کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرتِ آدم، وہاں بندر اچھلتے ہیں
ہمارا داغِ دل کرتا ہے روشن بزمِ معنی کو
تو کیا شکوہ اگر ہم مغربی غمزوں سے جلتے ہیں

(۱۳۳)

واعظ ہمیں یہ واعظ کا دفتر سنائے کیوں
ہم پوچھتے ہیں عالمِ ہستی میں آئے کیوں
موسیقی و شراب و جوانی و حسن و ناز
بچتا ہے کون، اور خدا بھی بچائے کیوں

(۱۳۴)

حاصل انہیں کیا، ایک ہے جو افسانۂ حسرت کہتے ہیں
عاقل تو وہی ہیں اے اکبرؔ، جو سنتے ہیں اور چپ رہتے ہیں
ہے شاق جدائی آپ کی اب، دن رات پریشاں رہتے ہیں
ہم آپ کو بے حد چاہتے ہیں، دل سے ہیں فدا، سچ کہتے ہیں
ہے پاس شریعت بھی ہم کو، ہیں عشق کی لہریں بھی دل میں
پابند ہیں ساحلِ مذہب کے، دریا کی طرح سے بہتے ہیں
اکبرؔ کی برائی اچھائی تو پوچھو سمجھنے والوں سے
نظم اُن کی سُنی ہے البتہ، ہاں شعر تو اچھے کہتے ہیں

(۱۳۵)

وزن اب اُن کا معیّن نہیں ہو سکتا کچھ
برف کی طرح مسلمان گھلے جاتے ہیں
داغ اب اُن کی نظر میں ہیں شرافت کے نشاں
نئی تہذیب کی موجوں سے دُھلے جاتے ہیں
علم نے، رسم نے، مذہب نے جو کی تھی بندش
ٹوٹی جاتی ہے وہ، سب بند کھلے جاتے ہیں
شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں
پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

(۱۳۶)

تمہیں جو دیکھ لے پھر کیا وہ محوِ حورِ جنت ہو
قیامت گو کہ برحق ہے مگر تم بھی قیامت ہو
مئے گلگوں کی جانب دل بہت کھنچتا ہے اے اکبرؔ
مگر مشکل یہی ہے، شیخ جی سُن لیں تو آفت ہو

(۱۳۷)

جس کو سارا قصۂ عہدِ جوانی یاد ہو
کیا عجب ہے، عہدِ پیری میں جو وہ ناشاد ہو

(۱۳۸)

شوخ ایسا ہے کہ اُس بت کو اگر کافر کہو
ہنس کے کہتا ہے کہ پیارا لفظ ہے یہ پھر کہو

جو کہو چھا جائے ان آنکھوں میں مستی کی طرح
فتنۂ دوراں کہو، ساقی کہو، ساحر کہو
قیمتِ دل سن کے کہتے ہو کہ سودا ہے تجھے
خیر سودا ہی سہی، تم بھی تو کچھ آخر کہو

(۱۳۹)

خوش دلی، عشق میں دستور یہی ہے کہ نہ ہو
ہاں اور اُن کو بھی تو منظور یہی ہے کہ نہ ہو
مرضِ عشق بھی کیا چیز ہے جس سے صحت
آرزوئے دلِ رنجور یہی ہے کہ نہ ہو

(۱۴۰)

جلایا دل کو، تڑپایا جگر کو
خدا رکھے سلامت اس نظر کو
دلِ سوزاں کی گرمی بڑھتی ہے اور
خدا کے واسطے پہلو سے سرکو
جوانی مار ہی رکھتی ہے اکبرؔ
سنبھالو دل کو، یارو کو نظر کو

(۱۴۱)

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغِ تیز سے ڈرتے رہو
ہو مصیبت تو نہیں کچھ خوف سیلِ اشک سے
عیش ہو تو نفسِ طوفاں خیز سے ڈرتے رہو
دیدِ نرگس سے چمن میں لطف اٹھاؤ بے خطر
لیکن اس چشمِ جنوں انگیز سے ڈرتے رہو

(۱۴۲)

تا بہ سینہ گردنیں جھکنے لگیں تسلیم کو
دردِ دل اٹھا خیالِ یار کی تعظیم کو
گردنِ محرابِ مسجد خم ہوئی تسلیم کو
اٹھی آوازِ اذاں اسلام کی تعظیم کو
طفلِ دل نے مکتبِ ادراک میں رکھا جو پاؤں
عشق پیدا کر دیا اللہ نے تعلیم کو

(۱۴۳)

فہم و ادراک میں ہو، عقل میں ہو، جان میں ہو
حق تو یہ ہے کہ تمہیں جلوہ گرِ انسان میں ہو
ہاتھ ہو کام میں اور دل ترے ارمان میں ہو
ہے یہی طرزِ عمل خوب جو امکان میں ہو
میں تو سو جان سے مرتا ہوں مری جاں تم پر
تم مری جان بچاؤ اگر امکان میں ہو
چاند پیارا ہے تو کیا اس سے سوا پیارا ہے
صحن میں بیٹھوں میں کیوں یار جو دالان میں ہو
پیاری صورت پہ تو انسان کو آتا ہی ہے پیار
دل کو روکیں کوئی صاحب اگر امکان میں ہو
حسن جس چیز میں ہو، دیکھ کے خوش کر دل کو
بند کرے مگر آنکھیں اگر انسان میں ہو
جھوٹ سے نفرتِ کلی ہو، طمع سے پرہیز
ہو نہ کچھ اور، پر اتنا تو مسلمان میں ہو
دل جہاں ہوگا وہاں عشق بھی ہوگا پیدا
خواہ افریقہ میں ہو خواہ پرستان میں ہو
ہے غلامی ہی جو قسمت میں تو ہو لطف کے ساتھ
کہہ دو ہندی سے کہ آبادِ پرستان میں ہو
آپ کی آنکھ میں کس نے یہ بھرا ہے جادو
اس کا ایما ہے کہ لغزش مرے ایمان میں ہو
کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اٹھو کوشش کرو، بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو
ٹھیک ہو دل کی جو نسبت تو اثر دیں نالے
سُر میں آواز ہو اکبرؔ تو مزا تان میں ہو

(۱۴۴)

ممکن نہیں کہ عشق ہو اور دلِ حزیں نہ ہو
میرا ہی حال دیکھ لے جس کو یقیں نہ ہو

(۱۴۵)

گرمِ نظارہ ہر اک سمت سرِ راہ نہ ہو
رہزنِ عقل کوئی صورتِ دل خواہ نہ ہو
شارحِ معنیٔ حسنِ بتِ دل خواہ نہ ہو
فہمیں قاصر نہ ہوں، خلقت کہیں گمراہ نہ ہو
یار کے دل میں اثر ہو، یہ ہے مقصودِ کلام
اس کی پروا نہیں، محفل میں اگر واہ نہ ہو
یہ چمک اس کی ہے اے جان، تمہارے دم سے
تم جو پہلو میں نہ ہو، لطفِ شبِ ماہ نہ ہو
قلقلِ شیشہ کو سنیے تو ذرا حضرتِ شیخ
دیکھیے تو کہیں اس قل میں ہُو اللہ نہ ہو
جانتا ہوں میں شبِ وصل کی کوتاہی کو
یہ دعا ہے کہ مری عمر سے کوتاہ نہ ہو

یہ ادائیں، یہ لگاوٹ، یہ بلا کی چیتون   میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہ ہو
اک زمانہ ہے مرے قصۂ غم سے واقف   اس کا باعث جو ہے، شاید وہی آگاہ نہ ہو
بے رُخی اس بُتِ کمسن کی نہیں باعثِ یاس   نظرِ شوق سے شاید ابھی آگاہ نہ ہو
کیوں گلابی کے عوض پہنا ہے جوڑا کاہی   طعنہ زن گُل پہ مری جان کہیں کاہ نہ ہو
شیخ کہتا ہے برائی بُتِ خوش رُو کی کرو   دل دھڑکتا ہے کہ ناخوش کہیں اللہ نہ ہو
چشمِ کافر کا اشارہ ہے کہ ایماں کیسا   چہرہ ہنستا ہے کہ دیکھو کوئی گمراہ نہ ہو
اک ترحّم کی نظر یار نے کی ہے آخر   دل سے نکلے تو کہاں تک اثرِ آہ نہ ہو
اپنے ہاتھوں سے جو دو تخلیے میں جامِ شراب (ق)   شیخ صاحب کو ذرا عُذر بھی واللہ نہ ہو
اور سوا اس کے وہ اک شخص ہیں معقول پسند   غالباً جاڑوں میں یوں بھی انھیں اِکراہ نہ ہو
جوششِ گریۂ پیہم کا ہے باعث رُخِ یار   جزر و مد ہو نہ سمندر میں، اگر ماہ نہ ہو
ہو نمود اور حسینوں کی، چلے جائیں جو آپ   رونق آجائے کواکب میں اگر ماہ نہ ہو
میں سمجھتا ہوں کہ حوریں جو نہ ہوں جنّت میں   تو عزازیل پھر انسان کا بدخواہ نہ ہو
دوست کا دوست نہ ہو جو، وہ مرا دشمن ہے   نہ ملے مجھ سے وہ، اس کا جو بھی خواہ نہ ہو
سالکِ راہِ محبت کو خِرَد سے کیا کام   وہ تو جاہے گا کہ خود ہوش بھی ہمراہ نہ ہو
خرچ کیسا، ہیں فقط جمع کے شائق احباب   میں تو خوش ہوں، اگر افزائشِ تنخواہ نہ ہو
گُل پہ بُلبل بھی فدا، بادِ صبا بھی صدقے   صورت اچھی ہو تو پھر کون ہوا خواہ نہ ہو
نرگسِ مست تری، قاتلِ عالم نکلی   کہیں صیّادِ اجل کی یہ کمیں گاہ نہ ہو
منّتوں کی اُدھر افراط، اِدھر کھٹکوں کی   ڈھونڈھتا ہوں وہ شہر کہ جس میں کوئی درگاہ نہ ہو
زُلفِ ابجد کی کہیں نفی نہ کر دے ہندی   لام کی جا کہیں لا، اے مرے اللہ نہ ہو
مردِ آزاد ہوں مجھ سے یہ تکلّف کیسا   بس مرے ساتھ یہ واللہ و باللہ نہ ہو
دسترس صید پہ حاصل تجھے ہو، خواہ نہ ہو   شیر ہی بن کے نکل، صورتِ روباہ نہ ہو
ذوقِ آرام بجا، شوقِ تعلّی بے جا   طلبِ رزق ہو لیکن ہوسِ جاہ نہ ہو
دل کو بے عشقِ حقیقی نہیں ہوتی حرکت   وہیں چلتی ہے یہ کشتی کہ جہاں تھاہ نہ ہو
خیر خواہ آج زمانہ میں کہاں ملتے ہیں   ہے یہی لاکھ غنیمت، کوئی بدخواہ نہ ہو
محوِ تمکیں رہے، نفرت ہو سبک وضعی سے   صورتِ کوہ ہو، انساں صفتِ کاہ نہ ہو
شرک ہے، اپنی خودی کا اگر آتا ہے خیال   کفر ہے، جان سے پیارا اگر اللہ نہ ہو
پا قدم منزلِ یوسف میں ذرا رکھ لے طالب   یا نہ کر شرط کہ واں گُرگ نہ ہو، چاہ نہ ہو
بند کر بیٹھا ہو آنکھیں جو تمہاری دُھن میں   کیا عجب شورِ قیامت سے بھی آگاہ نہ ہو
ہے اگر منزلِ راحت کی تلاش اے اکبرؔ   وہ جگہ ڈھونڈھ، تمنّا کی جہاں راہ نہ ہو
تم اگر چاہو برائی نہ کسی کی اکبرؔ   پھر تمہارا بھی جہاں میں کوئی بدخواہ نہ ہو

(۱۴۶)

شکر ہے راہِ ترقی میں اگر بڑھتے ہو   یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو
شیخ صاحب کا تعصب ہے جو فرماتے ہیں   اُونٹ موجود ہے پھر ریل پہ کیوں چڑھتے ہو
یہ سوال اُن کا ہے البتہ بہت بامعنی   کہ سمجھ بوجھ کے قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو
دین کو سیکھ کے، دنیا کے کرشمے دیکھو   مذہبی درس الف بے ہو علیگڑھ سے تو ہو

(۱۴۷)

بہت رہتی ہے حیراں دیکھ کر گو تیری قدرت کو   ادا کرتی نہیں چشمِ تماشا حقِ حیرت کو
بہت خوش ہے کہ قدِ لعبتِ چیں کے مطابق ہے   ہمارے طفلِ دل نے کھیل سمجھا ہے قیامت کو

(۱۴۸)

سب ہو چلے ہیں اُس بتِ کافر ادا کے ساتھ   رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ
جادو کیا یہ کس بُتِ کافر نگاہ نے   اسلام میں وفا نہ رہی اتّقا کے ساتھ
خوابِ اجل ہی نیند کے بدلے اب آئے گا   دیوانہ کر دیا مجھے اک شب سُلا کے ساتھ
واعظ کے اعتراض سے تنگ آ گیا ہوں   اس کو بھی دیکھ لو کبھی تم اک ادا کے ساتھ
اکبرؔ دعا کا ذوق ہو کیونکر نصیبِ دل   اُٹھے نہ دردِ دل بھی جو دستِ دعا کے ساتھ

(۱۴۹)

کرتے ہو تم خوشامدِ دنیا بڑھا کے ہاتھ   اللہ کی طرف نہیں اُٹھتے دُعا کے ہاتھ

(۱۵۰)

اچھی نہیں شے کوئی محبت سے زیادہ   وہ بھی ہے بُری، ہو جو ضرورت سے زیادہ
اے حسن کے مائل، یہ نصیحت مری سُن لے   سیرت پہ نظر چاہیے صورت سے زیادہ
سیّد سے علی گڈھ میں یہ جا کر کوئی کہہ دے   ہے تجھ کو طلب قوم کی قسمت سے زیادہ
مجھ رند سے اس درجہ نہ ہو محترز اے شیخ   تو پاک نہیں ہے مری نیت سے زیادہ
اِک بوسہ پہ وہ ٹال گئے، ہم بھی رہے چپ   سمجھے کہ کسے ملتا ہے قسمت سے زیادہ

(۱۵۱)

عشقِ بُتاں میں اکبرؔ ناداں، تیری یہ حالت، توبہ توبہ!
ایسے مسلمِ فخرِ حرم کی دیر میں ذلّت توبہ، توبہ!
دیوانوں سے شعر نہ سُنیے، سب کا خلاصہ مجھ سے سُنیے
آپ کی صورت سبحان اللہ، میری نیّت توبہ، توبہ
مذہب چھوڑو، ملّت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ!
سڑک کے کھنچتی ہے دستِ نجس سے، بوئے بدبھی آتی ہے اس سے
ایسی چیز سے بھائی صاحب آپ کو رغبت توبہ توبہ!

(۱۵۲)

خرمنِ گُل کو خزاں لے جائے گی اک بار باندھ   آشیانہ یاں نہ تو اے عندلیبِ زار باندھ
شعر میں اکبرؔ یہی مضمون تو ہر بار باندھ   اے مسلماں سبحہ لے، اے برہمن زنّار باندھ
سر میں سودا آخرت کا ہو، یہی مقصود ہے   مغربی ٹوپی پہن یا مشرقی دستار باندھ
خلق تجھ سے بے خبر ہے، بے خبر خالق کو تو   تار برقی گر نہیں ہے، آنسوؤں کا تار باندھ

(۱۵۳)

بیکار شب کو یوں سرِ بستر پڑا نہ رہ   اکبرؔ جو تجھ کو نیند نہ آئے تو شعر کہہ

(۱۵۴)

بچنا فضول گوئی سے ہے مقصدِ سکوت   معقول بات ذہن میں آئے تو چپ نہ رہ
نامِ خدا بڑھے ہیں کہیں آپ بدر سے   چودہ شبیں وہاں ہیں تو یاں سال چار دہ
یہ عمر، یہ جمال، یہ جادو بھری نگہ   پھر اس پہ واعظوں کا یہ کہنا کہ باز رہ

(۱۵۵)

ٹکّو یہ جس طرح سے ہو تازی کا ساز بوجھ   یوں بالبرانِ ہند پہ ہے اب نماز بوجھ
کپتان اپنی موج میں ہے، ہم ہیں ڈوبتے   واللہ قوم پر ہے یہ قومی جہاز بوجھ
منصور سر کٹا کے سبکدوش ہو گیا   تھا سخت اس کے دل پہ انا الحق کا راز بوجھ
اکبرؔ کے واسطے بھی وہی شرط پاس کی   ہر ایک پر نہ لا دیجیے بے امتیاز بوجھ

(۱۵۶)

جو کر دے حُسن کو مشتاق و بیتاب   غضب ہے وہ ادائے عاشقانہ
سُنا خونِ جگر کھاتا ہے اکبرؔ   مبارک یہ غذائے عاشقانہ

(۱۵۷)

آئینہ رکھ دے، بہارِ غفلت افزا ہو چکی   دل سنوارا اپنا، جوانی تو خود آرا ہو چکی
خانۂ تن کی خرابی پر بھی لازم ہے نظر   زینت و آرائشِ قصرِ معلّٰی ہو چکی
بے خودی کی دیکھ لذت کر کے ترکِ آرزو   ہو چکی حدِ ہوس، مشقِ تمنا ہو چکی
حُسنِ مُطلق کے تصور سے بھی پی لے دو ایک جام   روئے زیبا ہو چکا، زُلفِ چلیپا ہو چکی
چل بسے یارانِ ہمدم، اُٹھ گئے پیارے عزیز   آخرت کی اب کر اکبرؔ فکر، دنیا ہو چکی

(۱۵۸)

نکہتِ گل سے شمیمِ زُلف یاد آ ہی گئی   آج تو مجھ کو نسیمِ صبح تڑپا ہی گئی
بادۂ عرفاں کی مستی رُوح کو بھا ہی گئی   عقل سر میں رہ گئی، دل میں کچھ اور آ ہی گئی
اس جفا پر بھی طبیعت اُس پہ بس آ ہی گئی   اک ادا ظالم نے ایسی کی کہ وہ بھا ہی گئی
عاشقوں میں رسمِ عیش و نیوی رائج نہیں   قیس کب دولھا بنا، لیلےٰ کہاں بیاہی گئی
اک لطافت قلب میں تھی عقل و حکمت کے سوا   رہ گئے سب وہ مگر پرتو ترا پا ہی گئی
مختلف شکلوں میں آ کر ہو گئی آخر ہوا   ارکی بھیجی مری امید پر چھا ہی گئی
عشوہ ہائے دشمنِ ایماں کا اک طوفان تھا   دیکھ کر بُت کو مگر یادِ خدا آ ہی گئی
خوش نصیبی زالِ دنیا کی تعجب خیز ہے   چاہنے جانے کے نہ تھی لائق، مگر چاہی گئی
مستیٔ مے سے نظر اُن کی تھی تیغِ بے نیام   نشۂ عشق و جنوں سے پھر بھی شرما ہی گئی
سیکھ لو بدلی سے تم طرزِ عمل اے عالمو   جو سمندر سے لیا تھا، ہم پہ برسا ہی گئی
اپنے تمکین و تحمل پر بہت نازاں تھا میں   اک بُتِ کافر کی چشمِ مست تڑپا ہی گئی

(۱۵۹)

رقص کرتی ہے صبا، نغمہ سرا ہے بُلبل   شاہدِ گل کے لیے ناچ بھی ہے، گانا بھی
ہر لگاوٹ کی وہ دھج ہے کہ تڑپ جاتا ہے دل   کسی استاد سے تم سیکھے ہو شرمانا بھی

(۱۶۰)

کچھ طرزِ ستم بھی ہے، کچھ اندازِ وفا بھی   کُھلتا نہیں حال ان کی طبیعت کا ذرا بھی
عشوہ بھی ہے، شوخی بھی، تبسم بھی، حیا بھی   ظالم میں اور اک بات ہے ان سب کے سوا بھی
ایمان بھی تھا، علم بھی تھا، عقلِ رسا بھی   وہ لے گئے دل اور کوئی بولا نہ ذرا بھی
الفت ہی میں کرتے ہیں شکایت بھی، گلا بھی   اب اس کو بھلا دو کچھ اگر میں نے کہا بھی
سچ بات کا انکار میں کیونکر کروں اے بُت   بیشک مجھے آتی ہے کبھی یادِ خدا بھی
سالک کو دمِ تیغ ہے قطعِ رہِ توحید   دو ہو گیا اک آن میں، چُوکا جو ذرا بھی
کچھ قدر نہ کی عہدِ جوانی کی صد افسوس   ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی، گیا بھی
تصدیق ہوئی دیکھ کے وہ قامتِ زیبا   سنتا تھا کہ فتنے ہیں قیامت کے سوا بھی
دیکھیں کسے حاصل ہو وصالِ بُتِ جاناں   لینے کو ہے موجود مرا دل بھی، حنا بھی
ڈاڑھی پہ بھی واعظ کے ہے ملوس یہی اُن کے   چالاک مرے ہاتھوں کی صورت ہے حنا بھی
باقی نہ رہا خون بھی اب میرے جگر میں   افسوس، ہوا چاہتی ہے ترکِ غذا بھی
کیونکر کہوں رنگینیٔ باطن سے ہے عزت   پامال نظر آتی ہے مجھ کو تو حنا بھی
چپ رہتا ہوں تو کہتے ہیں الفت نہیں تجھ کو   کرتا ہوں خوشامد تو یہ فرماتے ہیں، جا بھی
سنتے ہیں کہ اکبرؔ نے کیا عشقِ بُتاں ترک   اس بات سے تو خوش نہ ہوا ہوگا خدا بھی

(۱۶۱)

نظرِ لطف سے بس اک ہمیں محروم رہے   اور کیا عرض کریں، آپ کو معلوم رہے

(۱۶۲)

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی   کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی
عیادت کو آئے، شفا ہو گئی   علالت ہماری دوا ہو گئی
وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اُٹھے   چلے تو قیامت بپا ہو گئی
پڑھی یادِ رُخ میں جو میں نے نماز   عجب حُسن کے ساتھ ادا ہو گئی
تماشائے مقتل کو آئے جو وہ   تڑپنے کی لذت سوا ہو گئی
محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے   طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی
لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں   اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی
میں ممنون ہوں وعدۂ یار کا   تسلی تو خیر اک ذرا ہو گئی
بُتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے   مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی
اُنہیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں   ہُوا خوب، اُنہیں پر فدا ہو گئی

(۱۶۳)

مری روح تن سے جدا ہو گئی   کسی نے نہ جانا کہ کیا ہو گئی
بہت دُخترِ رز تھی رنگیں مزاج   نظر ملتے ہی آشنا ہو گئی
مریضِ محبت ترا مر گیا   خدا کی طرف سے دوا ہو گئی
نہیں تھی تو نام کمر کیوں ہُوا   جو پیدا ہوئی تھی تو کیا ہو گئی
نہ تھا منزلِ عافیت کا پتہ   قناعت مری رہنما ہو گئی
ملا میں بھی اک رات دنیا سے خوب   مرے گھر بھی یہ بیسوا ہو گئی
ستایا بہت حاسدوں نے مجھے   تری مہربانی جفا ہو گئی
گھٹی گو کہ رندی سے وقعت مری   طبیعت مگر بے ریا ہو گئی
گوارا نہ تھا ذکرِ خونِ جگر   مگر اب تو میری غذا ہو گئی
بُتوں کو محبت نہ ہوتی مری   خدا کا کرم ہو گیا، ہو گئی
اشارہ کیا بیٹھنے کا مجھے   عنایت کی آج انتہا ہو گئی
رہِ معرفت میں جو رکھا قدم   خودی بھی بس اک نقشِ پا ہو گئی
کتابِ حقیقت کرے کون ختم   کہ ہر اک خبر مبتدا ہو گئی
وہ ساری امیدیں ملیں خاک میں   جو بدلی اٹھی تھی ہوا ہو گئی
فلک سے مٹا دل کا سارا اُبھار   جو بدلی اٹھی تھی ہوا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق ٹوٹے جو دانت   غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی
پھنسی جسمِ خاکی میں رُوحِ لطیف   اسیرِ کمندِ ہوا ہو گئی
دوا کیا کہ وقتِ دعا بھی نہیں   تری حالت اکبرؔ یہ کیا ہو گئی

(۱۶۴)

عاشق جو آستانۂ مشکل کُشا کی ہے   تابش مری جبین پہ نورِ خدا کی ہے
حُبِ علیؓ سے ہو گئی دل کی شگفتگی   کلیوں کو احتیاج نسیم و صبا کی ہے
روبہ مزاجیاں سگِ دنیا کی دیکھ لیں   حسرت بس اب زیارتِ شیرِ خدا کی ہے
صورت شگفتہ ہر گلِ رنگیں قبا کی ہے دق، مستانہ چال باغ میں بادِ صبا کی ہے
آزاری نہیں ہے کہ پیدا ہو اشک و آہ   دنیا میں دھوم خوبیٔ آب و ہوا کی ہے
پھولوں سے لگا کے ہے بادِ صبا کی لے   دمساز تان بُلبلِ شیریں نوا کی ہے

سبزہ لہک رہا ہے بصد انبساطِ طبع
سنبل میں تاب یار کی زلفِ دوتا کی ہے

مرغانِ باغ وجد میں ہیں فرطِ شوق سے
ڈوبی ہوئی مزے میں طبیعت ہوا کی ہے

آراستہ ہے ایک طرف بزمِ مومنین
کثرت لبوں پہ حمد و درود و دعا کی ہے

پوچھا جو اس سماں کا سبب بول اٹھے ملک
پیدائش آج حضرتِ مشکل کشا کی ہے

(۱۶۵)

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی
درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی

آئے کھوئے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا
میں بھی آیا ترے گھر، میری بلا بھی آئی

وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی
بُت کو دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی

ہو گئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں تیکھی
نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

ڈس لیا افعیِ شامِ شبِ فرقت نے مجھے
پھر نہ جاگوں گا اگر نیند ذرا بھی آئی

(۱۶۶)

فارسی اٹھ گئی، اُردو کی وہ عزت نہ رہی
ہے زباں مُنہ میں مگر اُس کی وہ قوت نہ رہی

بند کر اپنی زباں، ترکِ سخن کر اکبر
اب تری بات کی دنیا کو ضرورت نہ رہی

(۱۶۷)

روز افزوں ہو محبت، وہ ملاقات اچھی
شوق ملنے کا بڑھاتی رہے، وہ بات اچھی

وہ عمل کیا جو دلبری کو گھٹائے اے دوست
قوتِ دل کو بڑھاتی رہے، وہ بات اچھی

موقعِ بحث نہیں، صاحبِ اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بُری، آپ کی ہر بات اچھی

شبِ برات اچھی ہے لے جان نہ اچھی شبِ قدر
آپ حصّے میں مرے آئیں، وہی رات اچھی

ہم بغل شاہدِ دلجو ہو تو جاڑا اچھا
ہم نشیں ساقیِ مہوش ہو تو برسات اچھی

مائلِ ضبط بھی ہوں شائقِ فریاد بھی ہوں
جو پسند آپ کو آ جائے وہی بات اچھی

فتنہ اُن آنکھوں سے اٹھا تو مچی واہ کی دھوم
سچ یہ ہے، صاحبِ اقبال کی ہر بات اچھی

ہو نمود اپنی تو اندھیر کی پروا کس کو
کوئی تاروں سے جو پوچھے تو کہیں رات اچھی

آپ کے جور و ستم بھی ہیں دل آویز مجھے
چشمِ عاشق میں ہے معشوق کی ہر بات اچھی

بارِ خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد بُرا
دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

(۱۶۸)

آپ کا خیر طلب لائقِ عزت نہ سہی
رسم ہی کیجیے للہ، محبت نہ سہی

ہو رہو خاکِ درِ پیرِ مغاں اے اکبر
زندگی لُطف سے کٹ جائے گی عزت نہ سہی

کر دیا کُنجِ قناعت میں بسر اکبر نے
عزتِ دل تو سلامت رہی، دولت نہ سہی

(۱۶۹)

شگفتہ پائے طبیعت جس سے تری، رکھ شغل اپنا دن رات وہی
جو دل میں سمائے، من بھائے، ہے تیرے لیے حق بات وہی
کیا روتا ہے اگلے وقتوں کو، تہ کر دے تو اپنے نوحوں کو
بھٹکاتے ہیں جو، اُن سے ہو الگ، پھر دن میں وہی اور رات وہی
دھرتی نے جو بدلا رنگ تو کیا، تو اپنی نظر اوپر کو اٹھا
داتا کے کرم میں کیا ہے کمی، بادل ہے وہی، برسات وہی

(۱۷۰)

میری ناکامیابی کی کوئی حد ہو نہیں سکتی
صداقت چل نہیں سکتی، خوشامد ہو نہیں سکتی

مری ہستی ہے خود شاہد وجودِ ذاتِ باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

نہیں ہاتھ آتی دولت نام رٹنے سے بزرگوں کے
ہجا سے جد کے ترکیبِ زبرجد ہو نہیں سکتی

نہایت خوشنما پتھر پڑے ہیں عقل پر اُن کی
جنھیں تسکین بے لعل و زمرد ہو نہیں سکتی

ترنم سازِ ہستی کا تجھے کیا لطف دے غافل
تری رگ روح آشنائے صوتِ سرمد ہو نہیں سکتی

بہار آئی ہے اے واعظ، ابھی معذور رکھ مجھ کو
عمل توبہ پہ فصلِ گُل کی آمد ہو نہیں سکتی

بُری تعلیم سے پیدا ہوں گو رائیں غلط لیکن
طبیعت فطرتاً ہے نیک تو بد ہو نہیں سکتی

مکیں کو دیکھ کر اکبر میں جھکتا ہوں کسی در پر
نظر اپنی مریدِ طاق و گنبد ہو نہیں سکتی

مسلمانوں کو فیض اس بزم سے ممکن نہیں اکبر
کہ جس میں عزتِ نامِ محمد ہو نہیں سکتی

(۱۷۱)

شکریہ ہے تم نے مرے درد کی کچھ داد تو دی
نہ دوا کی، نہ سہی، رخصتِ فریاد تو دی

کیا ہوا شمعِ حرم تو نے بجھا دی اے دوست
دیر کے شعلہ رخانوں نے مجھے داد تو دی

(۱۷۲)

بہرِ رفتار میں جب کرتا ہوں تدبیر نئی
ڈال دیتا ہے فلک پاؤں میں زنجیر نئی

تو خوشامد کا ہے محو اور میں قناعت کا مرید
میری اکسیر پرانی، تری اکسیر نئی

پالیسی تیرے ہے، میرے لیے صبر و رضا
میری اکسیر پرانی، تری اکسیر نئی

کھوئے دیتے ہو جو تم مذہب و ملت کیلئے یار
کیا سمجھتے ہو کہ مل جائے گی تقدیر نئی؟

(۱۷۳)

اُلفت سے تری قطعِ نظر ہو نہیں سکتی
یہ بات تو اچھی ہے، مگر ہو نہیں سکتی

افسوس کہ دل شوقِ حضوری میں ہے بیتاب
دربان یہ کہتا ہے، خبر ہو نہیں سکتی

اغیار کی، کی آمد و شد آپ نے جاری
راحت مجھے اب آپ کے گھر ہو نہیں سکتی

(۱۷۴)

ختم کیا صبا نے رقص، گُل پہ نثار ہو چکی
جوشِ نشاط ہو چکا، صورتِ ہزار ہو چکی

نیک و بدِ زمانہ کو دیکھ کے گُل نے راہ لی
لُطفِ نسیم ہو چکا، کاوشِ خار ہو چکی

رنگِ بنفشہ مٹ گیا، سنبلِ تر نہیں رہا
صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی

مستیِ لالہ اب کہاں، اس کا پیالہ اب کہاں
دورِ طرب گزر گیا، آمدِ یار ہو چکی

رُت وہ جو تھی، بدل گئی، آئی بس اور نکل گئی
تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی

اب تک اُسی روش پہ ہے اکبرِ مستِ بے خبر
کہہ دے کوئی عزیزِ من فصلِ بہار ہو چکی

(۱۷۵)

بہت رہا ہے کبھی لُطفِ یار ہم پر بھی
گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

عروسِ دہر کو آیا تھا پیار ہم پر بھی
یہ بیسوا تھی کسی شب نثار ہم پر بھی

بٹھا چکا ہے زمانہ ہمیں بھی مسند پر
ہُوا کئے ہیں جواہر نثار ہم پر بھی

عدو کو بھی جو بنایا ہے تم نے محرمِ راز
تو فخر کیا، جو ہُوا اعتبار ہم پر بھی

خطا کسی کی ہو، لیکن کھلی جو اُن کی زباں
تو ہو ہی جاتے ہیں دو ایک وار ہم پر بھی

ہم ایسے رند مگر یہ زمانہ ہے وہ غضب
کہ ڈال ہی دیا دنیا کا بار ہم پر بھی

ہمیں بھی آتشِ اُلفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار ہم پر بھی

(۱۷۶)

اُن کی نگاہ دشمنِ اسلام ہی رہی
شرم و حیا کے ساتھ بھی بدنام ہی رہی

یاروں نے سو طرح کے مشاغل کئے بہم
لیکن مجھے تو فکرِ مے و جام ہی رہی

(۱۷۷)

تسکینِ دل اس بزم میں واللہ نہ پائی
چاہا تھا نکل جائیں، مگر راہ نہ پائی

معنی سے معرّا نظر آیا مجھے ہر نقش   آنکھوں نے کوئی صورتِ دل خواہ نہ پائی
غوّاص رہی بحرِ حقیقت کی ہمیشہ   فکرِ حکما نے بھی مگر تھاہ نہ پائی
دیکھی نہ کوئی بات سوا نام کے اس میں   کچھ لذّتِ شان و حشم و جاہ نہ پائی
بارِ دلِ پُر غم میں کمی ہوتی کچھ اس سے   فرہاد کی طاقت بھی مگر آہ نہ پائی
ملّت کا ادب اُٹھ گیا جس قوم کے دل سے   اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

(۱۷۸)

کُفر کی رغبت بھی ہے دل میں، بتوں کی چاہ بھی   کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذاللہ بھی
اپنے نقدی سے کوئی صاحب دل خوش کریں   سُن چکا ہوں مرحبا بھی، آفریں بھی، واہ بھی
واہ کیا جلوہ ہے پیشِ چشم ادراکِ بشر   شبہ بھی، ہاں بھی، نہیں بھی، وہم بھی، اللہ بھی

(۱۷۹)

حالت تو یہ پہنچی ہے کہ دیکھی نہیں جاتی   اور دل سے محبت ہے کہ اب بھی نہیں جاتی
کیا کام چلے، اُن کی توجہ نہیں اکبر   اب کیجیے خوشامدکی، تو وہ کی نہیں جاتی

(۱۸۰)

نئی تہذیب ہے ساقی نے ایسی گرم جوشی کی   کہ آخر مسلموں میں رُوح پھونکی بادہ نوشی کی
تمھاری پالیسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب   ہماری پالیسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی
چھپانے کے عوض چھپوا رہے ہیں خود وہ عیب اپنے   نصیحت کیا کروں میں قوم کو اب عیب پوشی کی
پہننے کو تو کپڑے ہی نہ تھے، کیا بزم میں جاتے   خوشی گھر بیٹھے کر لی ہم نے جشنِ تاجپوشی کی
شکستِ رنگِ مذہب کا اثر دیکھیں نئے مرشد   مسلمانوں میں کثرت ہو رہی ہے بادہ نوشی کی
رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں   حماقت، حاکموں سے ہے توقع گرم جوشی کی
ہمارے قافیے تو ہوگئے سب ختم اے اکبرؔ   لقب اپنا جو دے دیں مہربانی ہے یہ جوشی کی

(۱۸۱)

حُسن ہے بے وفا بھی، فانی بھی   کاش سمجھے اسے جوانی بھی
بڑھتا جاتا ہے حُسنِ قوم مگر   ساتھ ہی اس کے ناتوانی بھی
سب پہ حاوی ہیں لُعبتانِ فرنگ   چپ ہیں بیگم بھی، بُت ہیں رانی بھی

(۱۸۲)

دلِ مبتلائے غفلت تو ہے محوِ دیرفانی   جو خدا کی یاد آئے تو اُسی کی مہربانی
جو گزر گیا خودی سے تو وہ مل گیا اُسی سے   نہ ہوائے رَبِّ اَرِنِی نہ صدائے لَن تَرَانِی
میں زباں پہ لاؤں کیونکر وہ حدیثِ حسنِ مطلق   کہ نہ بارِ لفظ اُٹھائے گی نزاکتِ معانی
یہ سمجھ گیا وہی ہے مرے پردۂ نفس میں   مجھے اب تو سانس لینا ہی ہے لطفِ زندگانی

(۱۸۳)

شیخ کی بات بگڑنے سے بھی مطلق نہ بنی   بادہ خواری پہ بھی اس شوخ سے گاڑھی نہ چھنی
گم ہوئے ہوش، جو دیکھا بُتِ ترسا کا جمال   اس قدر کبر، یہ عشوے، یہ دھج، اللہ غنی!
آپ کے ہو نہیں سکتے ہیں یہ عزلی ریزے   دل نہ ٹھہرے تو نکل جائیے ہیرے کی کنی
پاؤں کانپا ہی کیے خوف سے اُن کے در پہ   چُست پتلون پہننے پہ بھی پنڈلی نہ تنی
دل ہی دیتا تھا یہ، وہ دین بھی کرتے تھے طلب   یہی باعث تھا کہ اکبرؔ کی بتوں سے نہ بنی

(۱۸۴)

آئی ہوگی کسی کو ہجر میں موت   مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی
عاقبت میں بشر سے ہے یہ سوا   جانور کو ہنسی نہیں آتی
حال وہ پوچھتے ہیں، میں ہوں خموش   کیا کہوں شاعری نہیں آتی
ہم نشیں بک کے اپنا سر نہ پھرا   رنج میں ہوں، ہنسی نہیں آتی
عشق کو دل میں دے جگہ اکبرؔ   علم سے شاعری نہیں آتی

(۱۸۵)

دشتِ غربت ہے، علالت بھی ہے تنہائی بھی   اور ان سب پہ فزوں بادیہ پیمائی بھی
خوابِ راحت ہے کہاں، نیند بھی آتی نہیں اب   بس اُچٹ جانے کو آئی جو کبھی آئی بھی
یاد ہے مجھ کو وہ بے فکری و آغازِ شباب (ن)، سخن آرائی بھی تھی، انجمن آرائی بھی
صحنِ گلزار بھی تھا، ساقیِ گلفام بھی تھا   مے گلرنگ بھی تھی، لے بھی تھی اور نائی بھی
نگہِ شوق و تمنا کی وہ دلکش تھی کمند   جس سے ہو جاتے تھے رام آہوئے صحرائی بھی
ہم صنم خانۂ جہاں کرتے تھے اپنا فاتم   پھر کھڑے ہوتے تھے واں حُور کے شیدائی بھی
اب وہ عمر، نہ وہ لوگ، نہ وہ لیل و نہار   بجھ گئی طبع، کبھی جوش پہ گر آئی بھی
اب تو شیشے بھی مجھے دیو نظر آتے ہیں   اُس زمانہ میں پری زاد تھی رُسوائی بھی
میں تو آنکھوں میں جگہ دینے کو حاضر تھا اُسے   نیند ظالم سے یہ پوچھو کہ کبھی آئی بھی
اب تلک گوندھے سے اُمیدِ رہائی نہیں کچھ   لیجیے ہو گئی ختم آج تو جولائی بھی
کام کی بات جو کہنی ہو وہ کہہ لو اکبرؔ   دم میں چھن جائے گی یہ طاقتِ گویائی بھی

(۱۸۶)

عشق و مذہب میں دو رنگی ہو گئی   دین و دل میں خانہ جنگی ہو گئی
سختیِ ایام کا دیکھو اثر   گلبدن کی جا یہ سنگی ہو گئی
دُخترِ رز شیشہ سے نکلی بے حجاب   سامنے رندوں کے ننگی ہو گئی
علمِ یورپ کا ہُوا میداں وسیع   رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی

(۱۸۷)

کر دیا نزع نے واقف کہ یہ ہستی کیا تھی   ہوش آیا تو کھُلا حال کہ مستی کیا تھی
رنگِ حافظ پہ بہک جاتے ہیں اربابِ مجاز   یہ سمجھتے نہیں وہ بادہ پرستی کیا تھی
فرقتِ یار میں بدلی کا مزہ کچھ نہ ملا   میری نظروں میں تو رو دی تھی، برستی کیا تھی
میں تو بُت خانہ میں گاہک نہ ہُوا عزّت کا   دین کے بدلے میں ملتی تھی تو سستی کیا تھی

(۱۸۸)

اولوالعزمی جسے سمجھے تھے ہم وہ خودکشی نکلی   گمانِ ہوشیاری جس پہ تھا، وہ بے ہُشی نکلی
غضب یہ ہے کہ فریاد و فغاں بھی کر نہیں سکتے   جو دیکھی فال تو بس اس میں پندِ خامشی نکلی

(۱۸۹)

وقتِ پیری آ گیا اکبرؔ، جوانی ہو چکی   سانس لینا رہ گیا اب، زندگانی ہو چکی
ہجر میں دل کی سزا اے میرے جانی ہو چکی   ملیے اب بہرِ خدا، نامہربانی ہو چکی
ایڑیوں تک پہنچی زلف اُن کی تو مجھ کو کیا اُمید   راحتِ جاں یہ بلائے آسمانی ہو چکی
وقتِ لطف و مہر ہے اے جان، عشوے چھوڑ دے   کیجیے دلداریاں اب، دل ستانی ہو چکی
ضُعف ایسا ہے تو قصدِ کوئے جاناں کیا کروں   ہمّتِ عالی تو نذرِ ناتوانی ہو چکی
رنگِ گلزارِ جہاں ہے ہائے کتنا بے ثبات   دو ہی دن میں لالہ و گل کی جوانی ہو چکی
ایک عالم منتظر ہے بس اُلٹیے اب نقاب   کیجیے برپا قیامت، لَنْ تَرَانِی ہو چکی
عاشقیِ شاہدِ کالج ہے بربادیِ عُمر   پاس تک پہنچے نہیں ہم اور جوانی ہو چکی
حضرتِ دل ہو گئے اس عہد میں جُزوِ شکم   کیجیے عرضی نویسی، شعر خوانی ہو چکی

(۱۹۰)

رفیقِ حرص و مکّاری دلیری ہو نہیں سکتی   جو ہیں روباہ طینت، اُن میں شیری ہو نہیں سکتی

کسی کے ساتھ دنیا نے وفا کی ہی نہیں اب تک   تو میں کیوں چور ہوں اس کا جو میری ہو نہیں سکتی
کھوں جھومر کے ہوتے کیوں شب تاریک اُن کی زلفوں کو   جب اتنے چاند ہوں تو رات اندھیری ہو نہیں سکتی
خدا ہی جانے کتنے قالبوں میں مشترک ہوگی   یہ خاک جسم بھی دنیا میں تیری ہو نہیں سکتی
محبت اپنی ہی پریوں سے دکھیں حضرت اندر   مس مغرور لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی
فزوں ہے دلکشی مشرق کی مغرب کی لطافت سے   حریفِ بلبلِ گلشن کنیری[1] ہو نہیں سکتی
خدا کا ہے جو کچھ ہے آپ ہم دو دن کے مہماں ہیں   خردمندوں میں باہم میری تیری ہو نہیں سکتی
غزل میں حالتِ دل نظم کر سکتا ہوں اے اکبرؔ   مگر اُن سے کہوں، اتنی دلیری ہو نہیں سکتی

(۱۹۱)

تپشِ دل مجھے ہوتی ہے کہیں اس سے سوا   بیٹھے تو رہیے، ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

(۱۹۲)

پسند آئی ہے عزلت میں ہوں اب اور گھر کا گوشہ ہے   خدا کی یاد منزل ہے قناعت اپنا توشہ ہے
طبیعت اوج پر ہے رزقِ نا محتاج سے ملتا   ہمیں اک خوشۂ گندم یہاں، پر دیں کا خوشہ ہے

(۱۹۳)

مندرجہ ذیل غزل رسالہ "پیامِ یار" کی دی ہوئی طرح پر لکھی گئی تھی

اپنا رنگ ان سے ملانا چاہیے   آج کل پینا پلانا چاہیے
خوب وہ دکھلا رہے ہیں سبز باغ   ہم کو بھی کچھ گل کھلانا چاہیے
چال ہیں تلوار ہے دل کی گھڑی   توپ سے اس کو ملانا چاہیے
قولِ بابو ہے کہ جب بل پیش ہو   پیشِ حاکم بلبلانا چاہیے
کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے   ہاتھ اس مس سے ملانا چاہیے

(۱۹۴)

دو عالم کی بنا کیا جانے کیا ہے   نشانِ ماسوا کیسا جانے کیا ہے
مری نظروں میں ہے اللہ ہی اللہ   دلیلِ ماسوا کیا جانے کیا ہے
حقیقت پوچھ گُل کی بلبلوں سے   بھلا اس کو صبا کیا جانے کیا ہے
ہوا ہوں ان کا عاشق، ہے یہ اک جرم   مگر اس کی سزا کیا جانے کیا ہے
مرے مقصودِ دل تو بس تمھیں ہو   تمھارا مدعا کیا جانے کیا ہے
لگاوٹ بھی ہے، ساتھ اس کے جفا بھی   تمھارا مدعا کیا جانے کیا ہے
نہ اکبرؔ سا کوئی ناداں، نہ ذی ہوش   ہر اک شے کو کہا کیا جانے کیا ہے

(۱۹۵)

ہم ان کی خوشی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے   لیکن وہ جفاؤں کے سوا کچھ نہیں کرتے
وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے، ہم کہتے ہیں جی ہاں   بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرتے
بت خانے سے کچھ فیض نہ ہوگا تمھیں اکبرؔ   تم یاں بھی بجز یادِ خدا کچھ نہیں کرتے

(۱۹۶)

نہ بہتے اشک تو تاثیر میں سوا ہوتے   صدف میں رہتے یہ موتی تو بے بہا ہوتے
جنونِ عشق میں ہم کاش مبتلا ہوتے   خدا نے عقل جو دی تھی تو با خدا ہوتے
لیا نہ تخلیہ میں ان کا بوسہ، چوک ہوئی   بلا سے مجھ پہ وہ ہوتے اگر خفا ہوتے
ستم کا حس ہے کہنے سب ہیں تیرے محوِ جمال   کبھی سنا نہیں میں نے ترا گلا ہوتے
نہ ہوتی گر یہ حسینانِ چیں کی پابندی   تو ان کی چال سے فتنے بہت بپا ہوتے
سمجھ گئے کہ یہ اپنے حواس ہی میں نہیں   ہماری بات پہ اب وہ نہیں خفا ہوتے
یہ خاکسار بھی کچھ عرض حال کر لیتا   حضور اگر متوجہ ادھر ذرا ہوتے
یہ جس نے آنکھ ہمیں دی ہے، ہے وہ قابلِ دید   پھر اس کو چھوڑ کے کیا محوِ ماسوا ہوتے
مجھ ایسے رند سے رکھتے ضرور ہی الفت   جنابِ شیخ اگر عاشقِ خدا ہوتے
دلوں کو الفتِ دنیا نے سخت ہی رکھا   ہوائے نفس میں غنچے شگفتہ کیا ہوتے
گناہ گاروں نے دیکھا جمالِ رحمت کو   کہاں نصیب یہ ہوتا جو بے خطا ہوتے
ہے زاہدوں کو جو وحشت جمالِ انساں سے   تو کاش دخترِ رز ہی کے آشنا ہوتے
وہ ظلم تم میں ہے، میرے سوا کوئی بندہ   تلاش سے بھی نہ پاتے جو تم خدا ہوتے
جنابِ حضرتِ ناصح کا واہ کیا کہنا   جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے
مذاقِ عشق نہیں شیخ میں، یہ ہے افسوس   یہ چاشنی بھی جو ہوتی تو کیا سے کیا ہوتے
یہ اُن کی بے خبری ظلم سے بھی ہے افزوں   اب آرزو ہے کہ وہ مائلِ جفا ہوتے
کبھی یہ میں نے نہ چاہا کہ ہوں وہ دوست مرے   اُمید کیا تھی کہ ہوتے تو بے ریا ہوتے
وضو سے ہو گئی جائز نماز یاروں کو   جوازِ عشق بھی ہوتا جو دل صفا ہوتے
تمھارے حُسن کے بھی تذکرے ہیں شہروں میں   مرے سخن کے بھی چرچے ہیں جا بجا ہوتے
محلِ شکر ہیں اکبرؔ یہ دُر فشاں نظمیں   ہر اک زباں کو یہ موتی نہیں عطا ہوتے

(۱۹۷)

ضروری کام نیچر[1] کا جو ہے، کرنا ہی پڑتا ہے
نہیں جی چاہتا مطلق، مگر مرنا ہی پڑتا ہے
خدا کو ماننا ہی پڑتا ہے، دنیا کو جب برتو
خیالِ مرگ سے انسان کو ڈرنا ہی پڑتا ہے

(۱۹۸)

آپ کے قصرِ دل آویز کا کہنا کیا ہے   مگر اکبرؔ کو غرض کیا، اُسے رہنا کیا ہے
سانس لینے کو ذرا ٹھہرا ہوں میں دنیا میں   کیسا سامانِ اقامت! مجھے رہنا کیا ہے
کہہ چکا اس قدر اور پھر وہی الجھن دل کی   کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجھے کہنا کیا ہے
مُسکرا کر وہ لگے کہنے کہ ذلت، ذلت!   جب یہ پوچھا کہ سوا رنج کے سہنا کیا ہے

(۱۹۹)

امید و بیم کے جھگڑوں سے آگاہی نہیں رکھتے
سبب یہ ہے کہ ہم کوئی تمنا ہی نہیں رکھتے
تجھے اے چرخ کیا مشکل ہے ہم کو مطمئن رکھنا
فقیرِ بے نوا ہیں، شوکتِ شاہی نہیں رکھتے

(۲۰۰)

لب آشنائے دعا ہوں نہ ماسوا کے لیے   پکارئیے جو خدا کو تو بس خدا کے لیے
مقام شوق میں اے دل وہ رنگ پیدا کر   نظر زبان بنے عرضِ مدعا کے لیے
سوائے مرگ نہیں کچھ علاجِ دردِ فراق   اجل کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم دوا کے لیے
جو ہو سکے تو انھیں لاؤ بس میں اچھا ہوں   یہ اہتمام عبث ہے مری دوا کے لیے
جو آرزوئے اجل ہو تو دل کسی سے لگا   بہانہ چاہیئے آخر کوئی قضا کے لیے
شبِ فراق میں آیا خیالِ زلفِ سیاہ   یہ اور طرہ ہوا گیسوئے بلا کے لیے

---

[1] CANARY، زرد رنگ کا گانے والا پرندہ۔

[1] NATURE، فطرت

حسین ہونا ہی کافی ہے ظلم کرنے کو تلاشِ عُذر یہ کیوں ہے تمھیں جفا کے لیے
بتوں کے واسطے جاتا ہوں میں تو جانبِ دَیر سدھاریں شیخ ہی جی کعبہ کو خدا کے لیے

(۲۰۱)

جہاں جہاں صفت اس فخرِ انبیاء کے لیے کہ عالم اس کے لیے اور وہ خدا کے لیے
طریقِ عشق میں دل خضر بن کے پچھتایا سمجھ گیا کہ مصیبت ہے رہنما کے لیے
زبان و چشمِ بُتاں کا نہ پوچھیے عالم وہ شوخیوں کے لیے ہے، یہ بے حیا کے لیے
خراب دل کو جو اُس نے کیا تو خوب کیا بنا بھی تھا یہ اسی چشمِ فتنہ زا کے لیے

(۲۰۲)

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اُڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے
از راہِ تعلق کوئی جوڑا کرے رشتہ
انگریز تو نیٹو کے چچا ہو نہیں سکتے
نیٹو نہیں ہو سکتے جو گورے تو ہے کیا غم
گورے بھی تو بندے سے خدا ہو نہیں سکتے
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم ان سے کبھی عہدہ برا ہو نہیں سکتے

(۲۰۳)

دو ہی دن میں رُخِ گل زرد ہوا جاتا ہے
چمنِ دہر سے دل سرد ہُوا جاتا ہے
علم و تقویٰ پہ بڑا ناز تھا مجھ کو لیکن
آپ کے سامنے سب گرد ہُوا جاتا ہے
ہو رہی ہے مری فریاد کی الٹی تاثیر
وہ تو کچھ اور بھی بے درد ہوا جاتا ہے

(۲۰۴)

یہ بُت جو دلکش ہیں آج اتنے، یہ روح پر کل عذاب ہوں گے
نہیں سمجھتے جو حضرتِ دل، تو آپ اک دن خراب ہوں گے
ہمارے حالات کی حقیقت کسی پہ بھی منکشف نہ ہوگی
جو کوئی سوچے گا، وہم ہوں گے جو کوئی دیکھے گا، خواب ہوں گے
ڈِنر[ـہ] کا مجھ کو نہیں ہے چسکا، وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا
شراب ہوگی، کباب ہوں گے، حضورِ عالی جناب ہوں گے
بگاڑ میں بھی بنے رہیں گے، جو مستند طرز پہ ہیں قائم
جو بے اصولی کے ہیں مقلّد، وہ ہو کے ابتر خراب ہوں گے

(۲۰۵)

خواہش ذر میں نئی تہذیب کے پیرو بنے وہ نہ ہاتھ آیا مگر گنج معائب ہو گئے
بوسے ہی تک ہم تو پہنچے تھے رہِ تہذیب میں کھائی وہ منہ کی کہ اب اس سے بھی تائب ہو گئے

(۲۰۶)

ہاں ہاں عدو بھی آپ کا طالب ضرور ہے لیکن حضور فرقِ مراتب ضرور ہے
بنتے ہو میری جان تو آ بیٹھو گود میں تم جانتے ہو رُوح کو قالب ضرور ہے

(۲۰۷)

دل کا ہے قصور، آپ کا طالب تو یہی ہے میری نہ ہو تعزیر، مناسب تو یہی ہے

(۲۰۸)

راتوں کو بُتوں سے وہ لگاوٹ بھی چلی جائے
اور صبح کو وہ نعرۂ یارب بھی نہ چھُوٹے
کرتا ہے حقارت کی نظر پیرِ مغاں بھی
افسوس اگر اُن سے شراب اب بھی نہ چھُوٹے
قلعی بھی ریاکار کی کھُلتی رہے اکبر
طعنوں سے مگر طرزِ مہذب بھی نہ چھُوٹے

(۲۰۹)

معنی کو بھُلا دیتی ہے، صورت ہے تو یہ ہے نیچر بھی سبق سیکھ لے، زینت ہے تو یہ ہے
کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مسِ رعنا ٹیچر[ـہ] نے کہا، علم کی آفت ہے تو یہ ہے
یہ بات تو اچھی ہے کہ اُلفت ہو مسوں سے حُور اُن کو سمجھتے ہیں، قیامت ہے تو یہ ہے
پیچیدہ مسائل کے لیے جاتے ہیں انگلینڈ زُلفوں میں اُلجھ آتے ہیں، شامت ہے تو یہ ہے
پبلک میں ذرا ہاتھ مِلا لیجیے مجھ سے صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

(۲۱۰)

عبث ہر طاقت و دولت پہ تجھ کو رشک و حسرت ہے
نہ ہر طاقت میں نیکی ہے، نہ ہر دولت میں راحت ہے
تعجب ہے مجھے ان شاعروں کے شور و غوغا پر
کوئی پوچھے کہ تم کو کیا جو کوئی خوبصورت ہے
مجھے بے چین کرتا ہے نظارہ سُنبل و گُل کا
اِدھر ہے پیچ گیسو کا، اُدھر عارض کی رنگت ہے
فنا کا دور جاری ہے مگر مرتے ہیں جینے پر
طلسمِ زندگانی بھی عجب اک رازِ فطرت ہے

(۲۱۱)

کون ایسا ہے جو یوں مجھ پہ عنایت رکھے صد و سی سال خدا تم کو سلامت رکھے
سچ تو یہ ہے کہ سلیقہ بھی ہے ہر کام میں شرط بُت کو چاہے تو برہمن کی طبیعت رکھے
نہ شریعت، نہ طریقت، نہ محبت، نہ حیا جس پہ جو چاہے وہ اس عہد میں تہمت رکھے
آدمی کے لیے دنیا میں مصائب ہیں بہت خوش نصیبی ہے جو وہ صبر کی عادت رکھے
کیا بتاؤں تمھیں اچھائی کی پہچان اکبر بس وہی خوب ہے جو تم سے محبت رکھے

(۲۱۲)

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر مجنوں کا نام ہو گیا، قسمت کی بات ہے
دل جس کے ہاتھ میں ہو، نہ ہو اُس پہ دسترس بے شک یہ اہلِ دل پہ مصیبت کی بات ہے
پروانہ رینگتا رہے اور شمع جل بجھے اس سے زیادہ کون سی ذلت کی بات ہے
مطلق نہیں محلِ عجب موت دہر میں مجھ کو تو یہ حیات ہی حیرت کی بات ہے
ترچھی نظر سے آپ مجھے دیکھتے ہیں کیوں دل کو یہ چھیڑنا ہی شرارت کی بات ہے
راضی تو ہو گئے ہیں وہ تاثیرِ عشق سے موقع نکالنا، سو یہ حکمت کی بات ہے

ـہ DINNER

ـہ TEACHER

(۲۱۳)

تخلیہ بھی ہے، ہوا سرد ہے اور رات بھی ہے
پھر بھی انکار مری جاں، یہ کوئی بات بھی ہے!
لطفِ ساقی ہو تو یہ وقت ہے مے نوشی کا
رحمتِ حق ہے، گھٹا چھائی ہے، برسات بھی ہے

(۲۱۴)

وہ بے خبر ہے غلغلۂ کائنات سے
جس کی کہ لو لگی ہے فقط تیری ذات سے

(۲۱۵)

سُن چکے آپ کہ پیش آئے تھے حالات ایسے
یہی باعث تھا کہ بے چین تھے ہم رات ایسے
میری غیبت کوئی کرتا تھا تو مجھ سے نہ کہو
تذکرے خوب نہیں وقتِ ملاقات ایسے
اُن کو واپس کیا یہ کہہ کے کہ تائب ہوئے وہ
ہوتے جاتے ہیں ملازم مرے بدذات ایسے
دشمنِ دیں سے تمھیں ہو گی کچھ امیدِ فلاح
ہم تو سُنتے نہیں اقوالِ خرافات ایسے
اے دل اس ابرو و مژگانِ نظر سے دب جا
صلح لازم ہے، جو ہوں جنگ کے آلات ایسے
بحث سے پھیر کے طاعت پہ کریں دل کو رجوع
پیر وہ ہیں کہ جو ہوں اہلِ کرامات ایسے
واہ اکبرؔ یہ نکالا ہے عجب طرزِ سخن
حُسنِ بندش تو یہ اور اس پہ خیالات ایسے

(۲۱۶)

کے ملت سے جو، دیکھے گی دُنیا ان کو عبرت سے
گرے پتے ہیں یہ بس سبز ہیں اپنی رطوبت سے
قیامت کر رہی ہیں لُعبتانِ مغربی اکبرؔ
تھیٹر کو بڑھایا ہے انھیں حوروں نے جنّت سے
مرا جس پارسی لیڈی پہ دل آیا ہے اے اکبرؔ
جو سچ پوچھو تو حُسن بمبئی ہے اُس کی صورت سے

(۲۱۷)

نفع ہوتا ہے فقط خارجی اصلاح سے واقف آپ ابھی نہیں عشق کے مزاج سے
دل ملیں تو کیا ملیں اہلِ قوم کے ہم ایک آیا کعبہ سے، ایک آیا لاج[۱] سے

(۲۱۸)

اکبرؔ کچھ آ رہے ہو نظر بند بند سے آخر ضرر ہوا تمھیں ناصح کی پند سے

۲۱۹

سرائے دہر تو ہے رہزنِ اجل کا مقام یہاں بھی کیا کوئی دل آن[۲] کر ٹھہرتا ہے

(۲۲۰)

دل کو مرے تم ایک نظر دیکھ تو دیکھتے ہوتے نہ خریدار، مگر دیکھ تو لیتے

(۲۲۱)

رہ گئے اہلِ خرد دہر کے چکّر میں پھنسے وہی اچھے جو تری زلفِ معنبر میں پھنسے

(۲۲۲)

دل کو مرے فروغ تمھاری نظر سے ہے بجلی بنا ہوا یہ اسی کے اثر سے ہے

(۲۲۳)

ہر طرف بننے بگڑنے کا یہاں اک دور ہے
چشمِ عبرت کے لیے دنیا محلِ غور ہے
لالہ و گُل اک طرف، طاعون کا غُل اک طرف
ہے جنوں یاروں کو لیکن رنگ ہی کچھ اور ہے

(۲۲۴)

بستاں، بخور بنوش، بزن، کارِ دہر ہے دل اس میں اہلِ دل جو لگائیں تو قہر ہے
بس ذکر ہی میں بادۂ گلگوں کے ہے مزہ چکھنا نہ ہم نشین اسے، واللہ زہر ہے

(۲۲۵)

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجیے آپ اپنی عزّتِ دربار رہنے دیجیے
دل ہی دل میں باہمی اقرار رہنے دیجیے بس خدا ہی کو گواہ اے یار رہنے دیجیے
اتّقا کا آج کل اظہار رہنے دیجیے جیجیے قبلہ، یہ استغفار رہنے دیجیے
خوب فرمایا کہ اپنا پیار رہنے دیجیے آپ ہی یہ عشوہ و انکار رہنے دیجیے
دیکھیے گا لُطف کیا، کیا گُل کھلیں کے شوق سے مجھ کو آپ اپنے گلے کا ہار رہنے دیجیے
چاندنی برسات کی نکھری ہے، چلتی ہے نسیم آج تو لِللہ یہ انکار رہنے دیجیے
چشمِ مخمور آپ کی نظروں میں خود موجِ شراب بس مجھے بے مے پیے سرشار رہنے دیجیے
کیجیے اپنی نگاہِ فتنہ افزا کا علاج مدّعا کو قابلِ اظہار رہنے دیجیے
لن ترانی خود شرابِ معرفت ہے اے کلیم آرزوئے شربتِ دیدار رہنے دیجیے
چھوڑنے کا میں نہیں اب آپ کو اے جانِ جاں ہے اگر مجھ پر خدا کی مار رہنے دیجیے
کیجیے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں یہ غرورِ جُبّہ و دستار رہنے دیجیے
ظالمانہ مشوروں میں، میں نہیں ہوں گا شریک غیر ہی کو محرمِ اسرار رہنے دیجیے
کھُل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ خیر چندہ لیجیے، طومار رہنے دیجیے
کیجیے رشوت ستانی سے ذرا پرہیز آپ خیر خواہی کا یہ سب اظہار رہنے دیجیے
مل کے باہم کیجیے اغیار سے بحث و جدال بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجیے
ٹیمز[۳] میں ممکن نہیں نظارۂ موجِ فرات ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجیے
ہمکنار اس بحرِ خوبی سے نہ ہوں گے اکبرؔ آپ ایسے منصوبے سمندر پار رہنے دیجیے

(۲۲۶)

سو رنگ تصور میں ہم اے جان در آئے ہر رنگ میں تم آفتِ ایماں نظر آئے
اے خضر مری راہ تو بس راہِ جنوں ہے منزل کو غرض ہو تو خود اس راہ پر آئے
دل جس طرف آیا ہے، وہ معلوم ہے مجھ کو ناصح سے تو پوچھو کہ حضرت کدھر آئے
یہ حُسن بتوں کا، یہ جنوں خیز نگاہیں پتھر کا بھی دل ہو تو ادھر لوٹ کر آئے

---

۱ LODGE ۲ اب متروک ہے ۱۲

۳ THMMES ، انگلستان کا مشہور دریا

بے رونقیٔ انجمنِ عشق نہ چاہی — خالی جو ملی کوئی جگہ آہ بھر آئے
عکس آپ کا تھا طالبِ گوہر پئے تزئین — پڑتے ہی مری آنکھ میں آنسو بھی بھر آئے

(٢٢٧)

طلب ہے حق کی تو مل آ کے ہم سے مستوں سے — نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے

(٢٢٨)

خطا معاف مروں گا میں حُور ہی کے لیے — حسیں بھی خوب ہیں، لیکن حضور ہی کے لیے
کوئی گناہ ہو مدِ نظر، معاذ اللہ! — شراب پیتا ہوں میں بس سرور ہی کے لیے
خلافِ شرع کوئی قصد ہو، معاذ اللہ! — شراب پیتا ہوں میں بس سرور ہی کے لیے

(٢٢٩)

بانکی وہی ادا بھی ہے، ترچھی وہی نظر بھی ہے
جان پہ میری بن گئی، آپ کو کچھ خبر بھی ہے
ظلم کی اک ادا بھی ہے، لُطف کی اک نظر بھی ہے
حُسن کا اقتضا بھی ہے، عشق کا کچھ اثر بھی ہے
دل پہ مرے ہیں ان کے دانت، میں ہوں لبِ اُن کے چوستا
دولتِ وصلِ یار میں لعل بھی ہے گُہر بھی ہے
شرط لگائی آپ نے میری امید کم ہوئی
وعدہ پہ کیا خوشی کروں، اس میں جب اک مگر بھی ہے

(٢٣٠)

دنیا میں بے خبر ہے جو پروردگار سے — شاید ہے زندہ اپنے ہی وہ اختیار سے
اے صانعِ ازل تری قدرت کے میں نثار — کیا صُورتیں بنائی ہیں مشتِ غُبار سے

(٢٣١)

تری باتوں سے گو دل میں ملال اے یار آتا ہے
مگر جب دیکھتا ہوں تیری صورت پیار آتا ہے
جو چلتا ہے دلِ سوزاں کا انجن راہِ اُلفت میں
خبر دینے کو فوراً آنسوؤں کا تار آتا ہے
جو راہِ عشق میں دل پر مصیبت کوئی پڑتی ہے
خبر دینے کو فوراً آنسوؤں کا تار آتا ہے

(٢٣٢)

دل ہو خراب، دین پہ جو کچھ اثر پڑے — اب کارِ عاشقی تو بہر کیف کر پڑے
عشقِ بُتاں کا دین پہ جو کچھ اثر پڑے — اب تو نباہنا ہے جب اک کام کر پڑے
مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے — دیکھی جو ریل، اونٹ سے آخر اُتر پڑے
بے تابیاں نصیب میں تھیں، ورنہ ہم نشیں — یہ کیا ضرور تھا کہ اُنھیں پر نظر پڑے
بہتر یہی ہے قصد اُدھر کا کریں نہ وہ — ایسا نہ ہو کہ راہ میں دشمن کا گھر پڑے
ہم چاہتے ہیں میل وجود و عدم میں ہو — ممکن تو ہے جو بیچ میں اُن کی کمر پڑے
دانا وہی ہے دل، جو کرے آپ کا خیال — بینا وہی نظر ہے کہ جو آپ پر پڑے
ہونی نہ چاہیے تھی محبت، مگر ہوئی — پڑنا نہ چاہیے تھا غضب میں، مگر پڑے
شیطان کی نہ مان جو راحت نصیب ہو — اللہ کو پکار مصیبت اگر پڑے
اے شیخ ان بتوں کی یہ چالاکیاں تو دیکھ
نکلے اگر حرم سے تو اکبر کے گھر پڑے

(٢٣٣)

ادھر ہماری تو یہ نگاوٹ، حضور ایسے حضور ایسے
اُدھر یہ فرما کے مُسکرانا کہ ہوں گے کم اہلِ زُور ایسے
خدا کی ہستی میں شبہ کرنا اور اپنی ہستی کو مان لینا
پھر اس پہ طرہ یہ ادّعا کا کہ ہم ہیں اہلِ شعور ایسے
ہمیں نے چاہا نہ قُربِ ان کا، فریبِ دنیا کے دوں میں آ کر
وگرنہ ایمان کی جو پُوچھو، نہ تھے وہ کچھ ہم سے دُور ایسے

(٢٣٤)

ہمارے مصحفِ ایماں کا اول ہے نہ آخر ہے — خدا کی شان آیت ہے، مذاقِ دل مفسّر ہے

(٢٣٥)

قرآن چھوڑ بھاگے، شیطان کے مقابل — اس معرکہ میں اکثر احباب بیز نکلے
بُڑھے ہنسی کو اپنی ثابت کریں تو کیوں کر — جب دانت ہی نہیں ہے، پھر کون چیز نکلے
مجنوں نے نام پایا اور کوہ کن بھی اُبھرا — اس مدرسے کے لڑکے سب خوش تمیز نکلے

(٢٣٦)

جو قانع ہے کسی دن اُس کی قسمت لڑ ہی جاتی ہے
جو اہلِ حرص ہیں، اُن پہ مصیبت پڑ ہی جاتی ہے
حسینانِ جہاں سے آنکھ اپنی لڑ ہی جاتی ہے
دل آ ہی جاتا ہے، آخر مصیبت پڑ ہی جاتی ہے
جوانی میں ہلاکت دل کی ہے اس کا دبا رکھنا
کہ ایسی چیز دب کر گرمیوں میں سڑ ہی جاتی ہے
گلستاں میں گُلِ رنگیں کو زینت کی ضرورت کیا
مگر اس لعل پہ الماسِ شبنم جڑ ہی جاتی ہے

(٢٣٧)

ہے قوم جسم، سلطنت اس میں ہے مثلِ رُوح (ق) — جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے
سعیٔ شغالِ و گرگ سے جنبش ہوئی اگر — نافہم سمجھے، قوم میں خود انتعاش ہے
البتہ زندگانیٔ شخصی کا ہے وجود — قانون میں ہر اک کے لیے زندہ باش ہے
پیمانہائے ساختۂ شاہِ وقت پر — محدود طالبین کی فکرِ معاش ہے
بے علمِ مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست — اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزوِ غیر — یہ مسئلہ صحیح ہے اگر دل خراش ہے
اپنی یہ احتیاط کہ بوسے پہ اکتفا — اس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

(٢٣٨)

اپنے برتاؤ سے گو وہ مجھے ناخوش رکھے — ہے دُعا میری یہی، اُس کو خدا خوش رکھے
منہ چھپا لیتے ہیں زلفوں سے، میں گو ہوں ناخوش — ہنس کے کہتے ہیں، تجھے میری بلا خوش رکھے
واہ کس چال سے غنچوں کو ہنسایا تو نے — لُطفِ باری تجھے اے بادِ صبا خوش رکھے
ان بتوں کو نہیں کچھ صدق و صفا سے مطلب — بس خوشامد سے کوئی ان کو ذرا خوش رکھے
باغ و صحرا میں بھی بے لُطف رہا کرتا ہوں — رنج دے چرخ تو کیا آب و ہوا خوش رکھے
اس مسِ شوخ سے راحت نہ ملے گی مجھ کو — عمر بھر، خیر وہ اک شب تو بھلا خوش رکھے
آپ فرماتے ہیں اکبر سے مجھے خوش رکھو — خود جو مغموم ہو، وہ اور کو کیا خوش رکھے

(٢٣٩)

مثلِ بلبل زمزموں کا خود یہاں اک رنگ ہے — ارغنوں اس انجمن میں خارج از آہنگ ہے

ہر خیال اپنا ہے یاں اک مطربِ شیریں نوا
ہر نفس سینے میں اک موجِ صدائے چنگ ہے

ہر تصور ہے مرا عکسِ جمالِ روئے دوست
میرا ہر مجموعۂ وہم اک گلِ خوش رنگ ہے

لوحِ دل ہر جنبشِ مژگاں سے ہے معنی پذیر
ہر رگِ اندیشہ نقشِ خامۂ ارژنگ ہے

ہر حبابِ بحرِ جوشِ طبع ہے اک آسماں
دشتِ دل کا ذرّہ ذرّہ کوہ کا ہم سنگ ہے

عکس تیرا پڑ کے اس میں ہو گیا پاکیزہ تر
اے بُتِ کافر مری آنکھوں میں فیضِ گنگ ہے

نظمِ اکبرؔ سے بلاغت سیکھ لیں اربابِ عشق
اصطلاحاتِ جنوں میں بے بہا فرہنگ ہے

(۲۴۰)

داخل ہوئے حرم میں بتوں کو نکال کے
اسلام کو قبول کیا دیکھ بھال کے

(۲۴۱)

اُلجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مرے دل نے مدد طولِ امل سے

اُن کی نگہ مست ہے لبریزِ معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظؔ کی غزل سے

ادراک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوا روشنیِ صبحِ ازل سے

قرآن سے ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے
کس حُسن سے؟ یہ بھی تو سنو، حُسنِ عمل سے

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چُپ
عظمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

درجہ متحیّر کا ہے بے خود سے فزوں تر
ہے رُوح کو اُمیدِ ترقّی کی اجل سے

بحثِ کُن و لَو میں سمجھتا نہیں اکبرؔ
جو ذرّہ ہے موجود ہے وہ روزِ ازل سے

ہو دعوئے توحید مبارک تمھیں اکبرؔ
ثابت بھی کرو اس کو مگر طرزِ عمل سے

(۱۴۲)

مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز
ناداں ہے کو اٹھاتے جو چُول ہے

اتنا ہی آدمی ہیں سمجھئے کمالِ فہم
جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے

جو کام آئے میرے، کروں اس طرف کو رُخ
تخصیص سر دستے ہے نہ وحشت ہبول سے

ہرگز اس انجمن کو نہ سمجھو ممدِّ قوم
خالی ملے جو ذکرِ خدا و رسولؐ سے

(۱۴۳)

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

کہاں تک داد دوں تیری بلاغت کی میں اکبرؔ
یہ تیرا ایک مطلع لاکھ مضمونوں کا حاصل ہے

(۱۴۴)

دین و ملّت کی ترقّی کا خیال اچھا ہے
اصل مضبوط ہو جس کی، وہ نہال اچھا ہے

بخدا ہند کے پُرزے بھی غضب ڈھالتے ہیں
یہ غلط ہے کہ ولایت ہی کا مال اچھا ہے

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا
پانیئر[1] لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

(۱۴۵)

طائرِ رنگتِ چمن اُڑنے کو پَر کھولے ہے
آشیاں ایسے گلستاں میں نہ بُلبل باندھے

ہوئے مطلوب جسے زادِ رہِ منزلِ فقر
گرہِ صبر میں وہ نقدِ توکّل باندھے

نظر آئے شبِ تاریک میں جگنو کی چمک
وہ جو تعویذِ طلائی پہ کا کُل باندھے

(۲۴۶)

کبھی ہے صبحِ عید اس میں، کبھی شامِ محرم ہے
یہ عالم چشمِ بینا کے لیے عبرت کا عالم ہے

دوا ہے کالج اور کونسل، سو اس کی ہے فراوانی
غذا ہے راحتِ دل اور دولت وہ بہت کم ہے

(۲۴۷)

تمھاری بخشوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی میں کم نہ ہوتے
مگر یہ بات آگئی سمجھ میں، خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

یہ حُسن ہی سے ہے عشق پیدا، یہ عشق ہی سے مصیبتیں ہیں
جو یہ نہ ہوتا تو دل نہ ہوتا، جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتے

تمھارے عشوے، تمھارے غمزے، نگاہِ ساقی کے ہیں مؤیّد
وگرنہ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کے اتنے سامان بہم نہ ہوتے

کہا سکندر نے یہ بحسرت، جب آگیا اس کا وقتِ رحلت
کہ سہل تر ہوتی نزع ہم پر جو محوِ جاہ و حشم نہ ہوتے

بلندیاں ہوتی ہیں مخالف، جو پستیوں پہ ہو میل دل کا
زمیں کے فتنوں میں گر نہ پھنستے، فلک کے جور و ستم نہ ہوتے

مذاقِ فطرت میں بس نہ جاتے جو قامتِ گیسوئے حسیناں
یہ راستی سرو میں نہ ہوتی، یہ سُنبلِ تر میں خم نہ ہوتے

تری ترقّی، مرا تنزّل، تری جفائیں، مرا تحمّل
فلک کی گردش کا لُطف کیا تھا، جو تو نہ ہوتا، جو ہم نہ ہوتے

(۲۴۸)

یہ موجودہ طریقے راہیِ مُلکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے

نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گُل، زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پُتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں، وہ سب سے کم ہوں گے

---

[1] PIONEER، ایک انگریزی اخبار

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

(۲۴۹)

موت سے وحشت، بشر کا اک خیالِ خام ہے   اصلِ فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے
اس تجارت گاہِ دنیا کا کہوں کیا تم سے حال   کارخانے سب خدا کے ہیں، ہمارا نام ہے

(۲۵۰)

پیشِ نظر صنم ہے، بس عاشقی کا غم ہے   دنیا کی فکر کم ہے، اللہ کا کرم ہے
یہ گیسوئے معنبر، یہ چشمِ سحر آگیں   کیا پوچھتے ہو صاحب اندھیر ہے ستم ہے
سیّد کی روشنی کو اللہ رکھے قائم   بتی بہت ہے موٹی، روغن بہت ہی کم ہے
کیا خوب پڑھ رہے ہیں مصرع مہنت صاحب   بھنڈار تو ہے خالی، جاری مگر بھرم ہے

(۲۵۱)

یہی خوشیاں رہیں گی دہر میں ایسے ہی غم ہوں گے   مگر اک وقت آئے گا، نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت صدمہ پہنچتا ہے   جو امیدیں کرے گا کم، اُسے صدمے بھی کم ہوں گے

(۲۵۲)

اسبابِ انتشار و جنوں مجھ سے چھن گئے   مطلب یہ ہے کہ عشق و جوانی کے دن گئے
جانے کی اس گلی میں قسم کھائی تھی مگر   مچلا یہ دل کہ بن نہ پڑی مجھ سے بن گئے

(۲۵۳)

انداز قیامت کے ہیں اے جان تمہارے   سو دل ہوں تو سو دل سے ہوں قربان تمہارے
ایمان ہو یا کفر ہو، سچ بات تو یہ ہے   اسلام تمہارا ہے، مسلمان تمہارے

(۲۵۴)

یہ غزل رسالہ "پیامِ یار" کی دی ہوئی طرح پر لکھی گئی تھی۔

اس میں عکس آپ کا اتاریں گے   دل کو اپنے یونہیں سنواریں گے
بحث میں مولوی نہ ہاریں گے   جان ہاریں گے، جی نہ ہاریں گے
آپ ناحق پہ اور ہم حق پر   آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں گے
ہم سے کرتی ہے یہ بہت غمزے   ہم بھی دنیا پہ لات ماریں گے
رزقِ مقسوم ہی ملے گا اُسے   کوئی دنیا میں دوڑے یا رینگے
عشق کہتا ہے لطف ہوں گے بڑے   ہجر کہتا ہے جان ماریں گے
ہیچ ہے جان ہے یہی جو خوشی   کیجیے ظلم دم نہ ماریں گے
دل کی افسردگی نہ جائے گی   ہاں وہ چاہیں گے تو اُبھاریں گے
مبتلائے بلا تو ہوں غافل   یہ بھی اللہ کو پکاریں گے
لائے بھی تو خدا کہیں وہ گھڑی   کہتے ہیں تجھ کو خوب ماریں گے
دل نہ دوں گا میں آپ کو ہرگز   مفت میں آپ جان ماریں گے
مطبخِ قوم میں رہا کیا ہے   صرف شیخی ہی اب بگھاریں گے
پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح
گل کو کیا باغباں سنواریں گے

(۲۵۵)

ضد ہے انھیں پورا مرا ارماں نہ کریں گے   منہ سے جو نہیں نکلی ہے، اب ہاں نہ کریں گے
کیوں زُلف کا بوسہ مجھے لینے نہیں دیتے   کہتے ہیں کہ واللہ پریشاں نہ کریں گے
ہے ذہن میں اک بات تمہارے متعلق   خلوت میں جو پوچھو گے تو پنہاں نہ کریں گے
واعظ تو بتاتے ہیں مسلماں کو کافر   افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے
کیوں شکر گزاری کا مجھے شوق ہے اتنا   سنتا ہوں وہ مجھ پہ کوئی احساں نہ کریں گے
دیوانہ نہ سمجھے ہمیں وہ، سمجھے شرابی   اب چاک کبھی جیب و گریباں نہ کریں گے
وہ جانتے ہیں غیر مرے گھر میں ہے مہماں   آئیں گے تو مجھ پہ کوئی احساں نہ کریں گے

(۲۵۶)

اہلِ غرور و حرص کو کیا علم سے شرف   تا چرخ بھی پہنچ کے وہ شیطان ہی رہے
اٹھی نگاہ دیر میں لیکن جھکا نہ سر   پیشِ صنم بھی ہم تو مسلمان ہی رہے

(۲۵۷)

بتِ ستمگر کی کچھ نہ پوچھو، حسین بھی ہے، ذہین بھی ہے
نہیں ہے دل ہی پہ صرف آفت، یہاں تو خطرے میں دین بھی ہے
اگرچہ مغرب سے سازِ دل ہے، مرید آہنگِ مشرقی ہوں
اگر پیانو ہے انجمن میں، محلِ خلوت میں بین بھی ہے
رعایتِ لعلِ لب سے میں نے کہا اُسے مالکِ بدخشاں
تو بولا تیوری چڑھا کے، دیکھو جبیں کے قبضہ میں چین بھی ہے
ہمارے جھگڑوں کی کچھ نہ پوچھو، تمام دنیا ہے اور ہم ہیں
کہ جیب میں زر ہے، گھر میں زن ہے، خراج پہ کچھ زمین بھی ہے
ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور ان کی سوئی بھی ہے وہ آفت
کہ صاف بھی ہے، چمک بھی رکھتی ہے، گول بھی ہے، مہین بھی ہے
دعا کو بھی وہ کبھی ہے اٹھتا، اسے ہے دن رات صرف چکر
خدا کی قدرت کے کارخانے میں ہاتھ بھی ہے، مشین بھی ہے

(۲۵۸)

ہے وہمِ نقشِ ہستی، ہر چند دل نشیں ہے   دیکھو اسے تو سب کچھ، سوچو تو کچھ نہیں ہے
دیکھا نہیں کسی نے اس یارِ نازنیں کو   لیکن سنا یہی ہے بے انتہا حسیں ہے
روحانیت کے بدلے آنکھوں میں خاک ہے اب   اُس میں "وہی وہی" تھا، اِس میں "یہیں یہیں" ہے
تصدیق سے حسیں ہو کیوں کر ترا تصور   اک لفظِ بے صدا ہے، اک نقشِ بے نگیں ہے

(۲۵۹)

کھڑے ہیں بارِ ششدر، حیرت و عبرت کا مضموں ہے   نہ جنگل ہے نہ ناقہ ہے، نہ لیلا ہے نہ مجنوں ہے
وہ رنگِ بزمِ اکبر اب کہاں، بہتر ہے اٹھ جاؤ   یہی بس ایک تدبیرِ سکونِ جانِ محزوں ہے

(۲۶۰)

فتنہ اٹھے کوئی یا گھات میں دشمن بیٹھے   کارِ الفت پہ تو اب حضرتِ دل ٹھن بیٹھے
کیوں نہ اس سے مرا دل لے بُتِ بدظن، بیٹھے   ہم کھڑے بھی نہ رہیں، بزم میں دشمن بیٹھے
بزم میں وہ جو دبا کر مرا دامن بیٹھے   اٹھ گئے رشک سے، پھر پاس نہ دشمن بیٹھے
شیخ کعبہ میں، کلیسا میں برہمن بیٹھے   ہم تو کوچہ میں ترے مار کے آسن بیٹھے
شوخیاں شوق سے کر، مجھ کو بھی لطف آتا ہے   سچ کہا تو نے کہ نکلا مرا دشمن بیٹھے
سوئے دولت نظر آئی نہ جو راہِ اعزاز   مسندِ صبر و توکل ہی پہ ہمہ تن بیٹھے

نظر اُٹھی تو اٹھائے گئے، نظروں سے گرے — غلطی کی ترے پاس لے بُت بدظن بیٹھے

ہوں میں وہ رند اگر حشر میں ملزم ٹھہروں — فیصلے کے لیے حوروں کا کمیشن بیٹھے

انقلابِ روشِ چرخ کو دیکھا اکبر — کل جو تھے دوست مرے، آج عدو بن بیٹھے

ہند سے آپ کو ہجرت ہو مبارک اکبر — ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

(۲۶۱)

کیا ملا عرض آں و ایں کر کے — چل دیے وہ چُناں چُنیں کر کے

فائدہ کیا کہ پھر کہوں ان سے — کر چکے ہاں وہ اب نہیں کر کے

فتنے مسجد میں اٹھے ہیں اکبر — دَیر میں بیٹھ ترکِ دیں کر کے

(۲۶۲)

وہ ہوا نہ رہی، وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی، وہ حسیں نہ رہے

وہ فلک نہ رہا، وہ سماں نہ رہا، وہ مکاں نہ رہے، وہ مکیں نہ رہے

وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی

وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا، کہیں اور کی کیا، وہ ہمیں نہ رہے

نہ وہ آن رہی، نہ اُمنگ رہی، نہ وہ رندی و زُہد کی جنگ رہی

سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے، اور دَیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

نہ وہ جام رہے، نہ وہ مست رہے، نہ فدائی عہدِ الست رہے

وہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا، وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے

ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا، نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا

یہ محال ہے اہلِ وفا کے لیے، غمِ ملت و الفتِ دیں نہ رہے

ترے کوچۂ زلف میں دل ہے مرا، اسے اب میں سمجھتا ہوں دامِ بلا

یہ عجیب ستم ہے عجیب جفا کہ یہاں نہ رہے تو کہیں نہ رہے

یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب، ابھی جاؤ نہ تم، نہ کرو یہ غضب

کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

جو تھیں چشمِ فلک کی بھی نورِ نظر، وہی جن پہ نثار تھے شمس و قمر

سو اب ایسی مٹی ہیں وہ انجمنیں کہ نشاں بھی اُن کے کہیں نہ رہے

وہی صورتیں رہ گئیں پیشِ نظر جو زمانہ کو پھیریں ادھر سے اُدھر

مگر ایسے جمالِ جہاں آرا جو تھے رونقِ روئے زمیں نہ رہے

غم و رنج میں اکبر اگر ہے گھرا، تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا

کسی شے کو نہیں ہے جہاں میں بقا، وہ زیادہ ملول و حزیں نہ رہے

(۲۶۳)

پراگندہ بہت ہے دل مرا دنیا کے دھندوں سے[1]

چھڑا دے مجھ کو یارب نوکری کے سخت پھندوں سے

غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں

خدایا بے نیازی دے مجھے ان خود پسندوں سے

کباب آیا تو کیا جب دل ہوا جل کر کباب اپنا

مجھے نانِ جویں بہتر ہے بس ایسے پسندوں سے

یہ خواہش ہے کہ ذکرِ حق سے دل تازہ رہے ہر دم

خداوندا ملا دے مجھ کو اپنے نیک بندوں سے

مسلمانوں کی خوش حالی کی بے شک دھن ہے سید کو

مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے، نہ چندوں سے

درستی تخت و عزت کی کہاں اب کسیل کانٹوں میں

توقع شہسواری کی نہ رکھو نعل بندوں سے

گُندھا وہ گیسوئے مشکیں کھلا یہ ڈھیلی اسپیچیں

دلِ وحشی اکبر پھنس چکا ایسی کمندوں سے

(۲۶۴)

ترچھی نظر سے کیجیے عشاق کا شکار — کیا احتیاج آپ کو تیر و کماں کی ہے

(۲۶۵)

ڈیر فرینڈ[1] نہ کہیے، جنابِ من تو ہے — حضور مجھ سے کوئی صورتِ سخن تو ہے

جو زر نہیں ہے نہ ہو، دولتِ سخن تو ہے — نہیں جو رنگ تو کیا غم مئے کہن تو ہے

رسائی اپنی ہے ان تک، نہیں ہے غیر کو دخل — پھر اپنا اپنا طریقہ تو ہے، چلن تو ہے

(۲۶۶)

سینے سے لگائیں تمھیں، ارمان یہی ہے — جینے کا مزا ہے تو مری جان یہی ہے

صبر اس لیے اچھا ہے کہ آئندہ ہے اُمید — موت اس لیے بہتر ہے کہ آسان یہی ہے

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا — بس جان گیا میں، تری پہچان یہی ہے

گیسو کے شریک اور بھی تھے قتل میں میرے — کیا وجہ ہے اس کی کہ پریشان یہی ہے

دل تیری محبت میں دو عالم کو بھلا دے — مذہب ہے یہی اور مرا ایمان یہی ہے

اس بُت نے کہا بوسۂ بے اذن پہ ہنس کر — بس دیکھ لیا آپ کا ایمان یہی ہے

کرتے ہیں بہت ذکر وہ ظلموں میں اضافہ — مجھ پہ اگر اُن کا ہے کچھ احسان، یہی ہے

ہم فلسفہ کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث — وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے

اکبر کو دعا دیتے ہیں احباب یہ کہہ کر — اب اپنی جماعت میں مسلمان یہی ہے

(۲۶۷)

سدھاریں شیخ کعبہ کو، ہم انگلستان دیکھیں گے — وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

جوانوں کو ذرا پروا نہیں بے اعتدالی کی — بڑھاپے میں نتیجے اس کے یہ نادان دیکھیں گے

حسینانِ عدو سے اتقا کا سامنا ہوگا — میں دیکھوں گا انھیں اور وہ مرا ایمان دیکھیں گے

تری دیوانگی پر رحم آتا ہے ہمیں اکبر — کوئی دن وہ بھی ہوگا ہم تجھے انسان دیکھیں گے

(۲۶۸)

عقل ہے، ایمان ہے، دل ہے، جان ہے — لیجیے سب آپ پر قربان ہے

خوبیٔ مذہب دمِ آخر کھلی — نزع میں مونس فقط ایمان ہے

مل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ — آدمی کا آدمی شیطان ہے

کیا مجھے کرتے ہو رندوں میں شمار — سانس لیتا ہوں، بس اتنی جان ہے

خود بنا ہے کیا وہ بُت اتنا حسیں — لطفِ فطرت ہے، خدا کی شان ہے

سعیٔ بازو سے کرے جو کسبِ رزق — بس وہی اللہ کا مہمان ہے

لطفِ ساقی سے نہ چھلکے جامِ دل — ظرفِ عالی کی یہی پہچان ہے

بے وقوفی ہے تعجب موت پر — عقل تو جینے ہی پر حیران ہے

---

[1] یعنی دنیا کے دھندے۔

[1] DEAR FRIEND

عالمِ ہستی پہ حیرت ہے مجھے (ق) کس لیے آخر یہ سب سامان ہے

یا مصیبت امرِ معنی خیز ہے   یا یہ تحیرِ خود بہت نادان ہے
اس کی نادانی مگر مانے گا کون   ذرّہ ذرّہ عاقلی کی جان ہے
پھر اٹھی ہے آپ کی تیغِ ستم   مجھ میں کیا باقی ابھی کچھ جان ہے
حکمِ خاموشی ہے اور میری زباں   آپ کی باتیں ہیں میرا کان ہے

(۲۶۹)

لطف تھا جن سے نظارے کا حسیں وہ نہ رہے   جن سے رونق تھی مکانوں کی مکیں وہ نہ رہے
میں جو روتا ہوں کہ افسوس زمانہ بدلا   مجھ پہ ہنستا ہے زمانہ کہ تمھیں وہ نہ رہے

(۲۷۰)

طلب ہو صبر کی اور دل میں آرزو آئے   غضب ہے دوست کی خواہش ہو اور عدو آئے
بہار میں بھی نہ راحت ملے جو فرقت ہو   صبا سے بھی گلِ داغِ جگر کی بو آئے
بتوں کے ظلم کو کردوں میں ہر طرح ثابت   مگر خدا نہ کرے ایسی گفتگو آئے
کیا ہے نشۂ الفت نے مائلِ گریہ   شراب پینے کو آخر کنارِ جو آئے
تم اپنا رنگ بدلتے رہو فلک کی طرح   کسی کی آنکھ میں اشک آئے یا لہو آئے
تری جدائی سے ہے روح پر یہ ظلم کہ اس   میں اپنے آپ میں پھر کیوں رہوں جو تو آئے
ریا کا رنگ نہ ہو مستند ہیں وہ اعمال   کلام پختہ ہے جب دردِ دل کی بو آئے
لبوں کا بوسہ جسے مل گیا ہو، وہ جانے   قدم تو اس بتِ بے دیں کے ہم بھی چھو آئے
کھلی جو آنکھ جوانی میں، عشق آ پہنچا   جو گرمیوں میں کھلیں در تو کیوں نہ لو آئے
وہ مے نصیب کہاں ان ہوس پرستوں کو   کہ ہو قدم کو نہ لغزش، نہ منہ سے بو آئے

(۲۷۱)

بہت دن محتسب کے ہاتھ سے مے کے سبو ٹوٹے   شکایت کیا اگر دستِ سبو سے اب وضو ٹوٹے
کچھ ایسا بڑھ گیا ہے حسنِ لطفِ ساقیِ دوراں   ہزاروں شیشۂ تقویٰ پڑے ہیں چار سو ٹوٹے
شکستِ نیتِ طوفِ حرم تجھ سے ہوئی اے دل   سزا ہے اس بتِ ظالم کے ہاتھوں سے جو تو ٹوٹے

(۲۷۲)

ہوتا ہے نفع یورپین نان پاؤ سے   میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے
تنہا وہ رہ گئے تھے تو میں خود نہ بیٹھتا   ناحق مجھے ذلیل کیا جاؤ، جاؤ سے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے   لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

(۲۷۳)

بے نالہ و فریاد و فغاں رہ نہیں سکتے   قہر اس پہ یہ ہے، اس کا سبب کہہ نہیں سکتے
موجیں ہیں طبیعت میں مگر اٹھ نہیں سکتیں   دریا ہیں مرے دل میں مگر بہ نہیں سکتے
پتوار شکستہ ہے، نہیں طاقتِ ترمیم   ہے ناؤ میں سوراخ مگر کہہ نہیں سکتے
کہہ دو گے کہ ہے تجربہ اس بات کے برعکس   کیوں کر یہ کہیں ظلم و ستم سہہ نہیں سکتے
عزت کبھی وہ تھی کہ بھلائے سے نہ بھولے   تحقیر اب ایسی ہے جسے سہہ نہیں سکتے

(۲۷۴)

ہم نے یہ نکتہ سنا اک مردِ حق آگاہ سے   پھر گیا اس سے زمانہ جو پھرا اللہ سے
ضعفِ مذہب ہو گیا ہے باعثِ طولِ سخن   گفتگو عامی سے ہو یا بحث ہو ذی جاہ سے
ایک لکچر کی ضرورت ہوتی ہے ہر بات پر   کام مطلق اب نہیں چلتا معاذ اللہ سے
آپ فرماتے ہیں، تجھ سے مجھ کو الفت ہے بہت   اور ثابت کرتے ہیں اس کو فقط واللہ سے

(۲۷۵)

ان بتانِ بے وفا کے حسن کا دل دادہ ہے   فکر ہے اکبر کی رنگیں، دل نہایت سادہ ہے
رقصِ پروانہ کا گردِ شمع دیکھیں اہلِ ذوق   کس خوشی سے جان دینے کے لیے آمادہ ہے
مائلِ خالق مجھے کرتی ہے یاں رفتارِ خلق   چشمِ بینا کے لیے ہر نقشِ پا سجادہ ہے

(۲۷۶)

کہاں تسکینِ خاطر نالۂ جانکاہ کرنے سے   بھڑکتی آتشِ دل اور بھی ہے آہ کرنے سے
یہ دورِ آسماں خضرِ طریقت ہو نہیں سکتا   خدارا اے خرد باز آ مجھے گمراہ کرنے سے
وہ کون ایسی نظر ہے جو نہ ہو محو ایسی صورت پر   وہ کون ایسی زباں ہے رک سکے جو واہ کرنے سے
مصیبت سخت تھی لیکن زمانہ دیکھ کر دل نے   کہا کیا فائدہ احباب کو آگاہ کرنے سے

(۲۷۷)

مسوں کے سامنے کیا مذہبی بہانہ چلے   چلیں گے ہم بھی اسی رخ، جدھر زمانہ چلے
میں جانتا ہوں نہ چھوڑیں گے آپ چال اپنی   کسی کا کام چلے اے حضور، یا نہ چلے
خدا کے واسطے ساقی یہی نگاہِ کرم   چلا ہے دور تو پھر کیوں رکے، چلا نہ چلے
کھلا ہے باغِ قناعت میں غنچۂ خاطر   خدا بچائے، کہیں حرص کی ہوا نہ چلے
نصیب ہو نہ سکی دولتِ قدم بوسی   ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے
فروغِ عشق کا بے آہ کے نہیں ممکن   نہ پھیلے بوئے گلستاں اگر ہوا نہ چلے
کھلے کو اثر جو کرے کے، پھر کسی کو کب   یہ حکم بھی تو ہوا ہے کہ راستا نہ چلے
امیدِ حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر   خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ پنجگانہ چلے
خودی کی حس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر   کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

(۲۷۸)

حضور اوروں کے خوش کرنے کی فکر البتہ فرمائیں   ہماری کیا ہے، شاعر کے لیے اک واہ کافی ہے
خوشی سے ماسوا پر آپ قبضہ کیجیے اپنا   مری تسکینِ دل کے واسطے اللہ کافی ہے
نہایت ناپسند ان کو ہے یادِ مرگ اے اکبر   مگر اس کو بھلا دینے کو حبِ جاہ کافی ہے

(۲۷۹)

وصفِ قدِ یار میں مصروف میرا خامہ ہے   میری جو تحریر ہے وہ اک قیامت نامہ ہے

(۲۸۰)

میرے دل کو وہ بتِ دل خواہ جو چاہے کرے   اب تو دے ڈالا اسے اللہ جو چاہے کرے
حضرتِ اکبر سا ضابط اور یہ بے تابیاں   آپ کی ترچھی نظر واللہ جو چاہے کرے
منزلِ صدق و صفا ہے ہر طرح خطروں سے پاک   نیک بختوں میں سے طے یہ راہ جو چاہے کرے
قاضی و مفتی ہیں غرقِ بادۂ مستی و کبر   قوم کا ضعف اور حبِ جاہ جو چاہے کرے
شیخ کی منطق ہو یا چشمِ فسوں سازِ بتاں   سیدھا سادہ ہوں، مجھے گمراہ جو چاہے کرے
دیکھ کر لوٹتی ہے یہ ہمن، کہتے ہیں اس عہد میں   شادی تو آساں نہیں ہاں بیاہ جو چاہے کرے
خرچ کی تفصیل پوچھوں گا نہ مانگوں گا حساب   لے لے وہ بت کُل مری تنخواہ، جو چاہے کرے
اچھے اچھے پھنس گئے ہیں نوکری کے جال میں   سچ یہ ہے افزونیِ تنخواہ جو چاہے کرے
بااثر ہونا تو ہے موقوف دل کے رنگ پر   جوش میں یوں آکے اکبر آہ جو چاہے کرے

(۲۸۱)

جھکتا نہیں بندہ کسی بدخواہ کے آگے   کیا غم ہے توکلتُ علی اللہ کے آگے
منطق بھی ہے، قانونِ شہادت بھی، خرد بھی   سب ہیچ مگر آپ کی واللہ کے آگے

(۲۸۲)

ان کی نظر کا آخر کیا کر لیا کسی نے　　بس رہ گئے یہ کہہ کر، مارا ہمیں اسی نے
چمکے ہیں بزمِ جم میں اب گیسوئے طلائی　　سکّہ نیا بٹھایا گردوں کی پالسی نے
کیا حالِ دل سنائیں، کیا سر قدم پہ رکھیں　　مایوس کر دیا ہے اس بُت کی بے حسی نے
جلوہ ہے آسماں پہ ابرو شفق کا گویا　　اچھا سماں دکھایا لبِ پُر تری مسی نے

(۲۸۳)

وہ خوب سمجھتے ہیں یہ کیوں مجھ کو غشی ہے　　یہ بھی اک ادا ہے جو ہیبگا نہ وشی ہے
اِنکارِ دوا عالم نے کیا ہے مجھے بیمار　　سنتا ہوں علاج اس کا فقط بادہ کشی ہے
محبوبہ بھی رخصت ہوئی، ساقی بھی سدھارا　　دولت نہ رہی پاس تو اب نَبّی ہے نہ شی ہے
میں کون سا منہ لے کے انھیں شکل دکھاؤں　　گورے کو کہا جب، یہ نگوڑا حبشی ہے

(۲۸۴)

اِدھر ہے جلوۂ مضموں، اُدھر حسنِ قوافی ہے　　یہی اک شغل میرے دل کے بہلانے کو کافی ہے
جنابِ شیخ ہی کو فکرِ اسنادِ معانی ہے　　ہماری طبعِ موزوں کو زمینِ شعر کافی ہے

۲۸۵

تیری زلفوں میں کافری ہے　　تیری آنکھوں میں ساحری ہے
اللہ رے مصائبِ شبِ ہجر　　گویا ہر سانس آخری ہے
کہنے لگے سُن کے نظم میری　　دقیانوسی یہ شاعری ہے

(۲۸۶)

اٹھ گیا دنیا سے دل عزت گزینی کے لیے　　یاد تیری مل گئی ہے ہم نشینی کے لیے

(۲۸۷)

مطیع و تابعِ فرماں کو عذر ہی کیا ہے　　کھُلے تو حال کہ مرضی حضور کی کیا ہے
جنابِ شیخ کو ہے میرے حال پہ افسوس　　کہو کہ اس سے بھی ہوگا سوا، ابھی کیا ہے
صدائے صور کی ہے ابتدا زمانے میں　　بڑھے گی اس کی بتدریج لَے، ابھی کیا ہے
وہ عشق کیا جو نہ ہو ہادیٔ طریقِ کمال　　جو عقل کو نہ بڑھائے، وہ شاعری کیا ہے
ہر ایک کو ہے زمانہ میں زندگی مقصود　　کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے
بتوں کو دیتے ہیں ہم جان دل لگی کے لیے　　مگر یہ جان گنوانا ہے، دل لگی کیا ہے
مرید لوگ بھی اب اعتنا نہیں کرتے　　جو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں شیخ جی کیا ہے
جو تیرے محو ہیں اُن کو بتوں سے کیا مطلب　　وہ حُور کی نہیں سُنتے تو پھر پری کیا ہے
اس انقلاب کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں　　زمانہ کہتا ہے، دیکھا کرو، ابھی کیا ہے

(۲۸۸)

گُلِ تر کو بھلا اس عارضِ رنگیں سے کیا نسبت　　کہ اُس پہ اوس پڑتی ہے یہاں خوبی ٹپکتی ہے
تمھارے کان کی بجلی عیاں ہے قربِ عارض میں　　یہی وہ برق ہے، سُورج کے پہلو میں چمکتی ہے

(۲۸۹)

اپنے پہلو سے وہ غیروں کو اُٹھا ہی نہ سکے　　اُن کو ہم قصّۂ غم اپنا سُنا ہی نہ سکے
ذہن میرا وہ قیامت کہ دو عالم پہ محیط　　آپ ایسے کہ مرے ذہن میں آ ہی نہ سکے
دیکھ لیتے جو انھیں تو مجھے رکھتے معذور　　شیخ صاحب مگر اس بزم میں جا ہی نہ سکے
عقل مہنگی ہے بہت، عشق خلافِ تہذیب　　دل کو اس عہد میں ہم کام میں لا ہی نہ سکے
ہم تو خود چاہتے تھے چین سے بیٹھیں کوئی دم　　آپ کی یاد مگر دل سے بھُلا ہی نہ سکے
عشق کامل ہے اسی کا کہ پتنگوں کی طرح　　تاب نظارۂ معشوق کی لا ہی نہ سکے
دامِ ہستی کی بھی ترکیب عجب رکھی ہے　　جو پھنسے اس میں وہ پھر جان بچا ہی نہ سکے
مظہرِ جلوۂ جاناں ہے ہر اک شے اکبرؔ　　بے ادب آنکھ کسی سمت اٹھا ہی نہ سکے
ایسی منطق سے تو دیوانگی بہتر اکبرؔ　　کہ جو خالق کی طرف دل کو جھکا ہی نہ سکے

(۲۹۰)

جو زاہدوں کی طرف سے تیری نگاہِ فتّاں پھری نہیں ہے
تو کیا سبب ہے ہنوز ان کی بنائے تقویٰ گری نہیں ہے
اگرچہ عاشق بتوں کا ہوں میں، نظر خدا سے پھری نہیں ہے
جو آنکھ رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ عاشقی کافری نہیں ہے
جمالِ دلکش کا محو ہونا، نہیں ہے ہرگز خلافِ طاعت
خدا کی قدرت کی قدر کرنا، ثواب ہے، کافری نہیں ہے
بس اک اشارے میں لے گئی تو، دلوں سے ایمان و صبر و تقویٰ
بتا تو اے چشمِ مستِ کافر، یہ کیا ہے گر ساحری نہیں ہے

(۲۹۱)

ہماری دولتِ ایماں بُتِ کافر نے لُوٹی ہے　　اُمیدِ عیش پر خوش تھے مگر اب وہ بھی ٹوٹی ہے

(۲۹۲)

مری تقدیر طبعِ یار کو بے چین کرتی ہے　　سبب کیا ہے، وہی کہتا ہوں جو دل پر گزرتی ہے
ٹھہرتا ہی نہ ہو جو دل، وہ ہے انمول دنیا میں　　یہ کیا پوچھا کہ تیرے دل کی کیا قیمت ٹھہرتی ہے
سلیقہ عاشقی کا دل میں پیدا کرتی ہے فطرت　　خدا جانے عنایت کرتی ہے یا ظلم کرتی ہے

(۲۹۳)

یقینِ قوتِ تدبیر، بُت پرستی ہے　　غرورِ رفعتِ دنیا، نظر کی پستی ہے
حدیثِ زُلف و کمر معرفت کی غزلوں میں　　خدا کے عشق میں بھی لطفِ بُت پرستی ہے

(۲۹۴)

مسلمانوں کو لطف و عیش سے جینے نہیں دیتے　　خدا دیتا ہے کھانا، شیخ جی پینے نہیں دیتے

(۲۹۵)

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے　　وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے
دف بجایا ہی کیے مضموں نگار　　وہ کمیٹی میں مٹکتے ہی رہے
سرکشوں نے طاعتِ حق چھوڑ دی　　اہلِ سجدہ سر پٹکتے ہی رہے
گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل　　اونٹ کانٹوں پہ لٹکتے ہی رہے
جو غبارے تھے وہ آخر گر گئے　　جو ستارے تھے چمکتے ہی رہے

(۲۹۶)

مرے اجداد بھی ڈرتے تھے اکبرؔ میں بھی ڈرتا ہوں　　مگر اُن کو گناہوں سے تھا ڈر اور مجھ کو مرنے سے
نشاں اللہ کا اس راہ میں دیتا نہیں واعظ　　بجا ہے ہمتِ مسلم جو رُکتی ہے اُبھرنے سے
سعادت کا جو طالب ہے کھُلا رکھ چشمِ عبرت کو　　اثر دکھلائے گا یہ نقشِ ہستی آہ بھرنے سے
سرائے دہر کو جس نے محلِ خوف سمجھا ہے　　اُسے کیا لطف آئے گا یہاں دل کے ٹھہرنے سے
خدا کے نام میں لذت نہ پائی اہلِ غفلت نے　　تعجب اس میں کیا، دل مر گیا دنیا پہ مرنے سے

---

۱ ضمیر مذکر غائب HE　۲ ضمیر مؤنث غائب SHE　۳ یہ لفظ آخر میں ہے.
ضرورتِ قافیہ کے لیے نون گرایا گیا ہے۔ جیسے زمیں سے زمی۔

خدا کے خوف کو کچھ تو جگہ دے دل میں اے اکبرؔ　　بُتوں کی کافری بڑھتی ہے تیرے واہ کرنے سے

(۲۹۷)

اگر ملنا نہیں منظور، آنکھیں کیوں ملاتے ہو　　یہ ترسانے سے حاصل، فائدہ بے چین کرنے سے؟
نہ بننے دے گا تجھ کو جوشِ دل اب دست کش ہرگز　　قیامت ہو گیا ہے آپ کا سینہ اُبھرنے سے
جوانی کی ہے آمد، شرم سے جھک سکتی ہیں آنکھیں　　مگر سینہ کا فتنہ رُک نہیں سکتا اُبھرنے سے

(۲۹۸)

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے　　ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے
سیکڑوں دورِ جنوں ہیں ابھی آنے والے　　مطمئن کیا ہیں مجھے ہوش میں لانے والے
اٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے اربابِ نظر　　گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے
خاتمہ عیش کا حسرت ہی پہ ہوتے دیکھا　　رو ہی کے اٹھتے ہیں اس بزم سے گانے والے
حدِ ادراک میں داخل نہ ہوا سرِّ ازل　　کچھ سمجھ ہی نہ سکے ہوش میں آنے والے
موجِ معنی ہوئی گم، بندھ گئے الفاظ کے پُل　　کچھ خبر ہے تجھے اے بات بنانے والے
آپ اندھیرے میں ہیں بجلی سے مدد لیتے ہیں　　چاند سورج ہیں جہاں راہ دکھانے والے
بارِ احساں جسے کہتے ہیں، وہ ہے کوہِ جفا　　کاش نادم ہوں یہ احساں جتانے والے
آپ منکر ہیں، غلامی بھی نہیں ملتی ہے　　سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے
قدمِ شوق بڑھے ان کی طرف کیا اکبرؔ　　دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

(۲۹۹)

رہ گئے ہم ہاتھ ہی ملتے ہوئے　　دل ہمارا لے کے وہ چلتے ہوئے
کیوں نہ ہو تادیبِ کالج بے ثمر　　کس نے دیکھا بید کو پھلتے ہوئے

(۳۰۰)

سب میں وحشت ہے زمانہ کے بدل جانے سے　　دل اب اپنے سے نہ ملتا ہے نہ بیگانے سے
رحم کر قوم کی حالت پہ تو اے ذکرِ خدا　　بے ادب ہو گئی مجلس ترے اُٹھ جانے سے
جب ہمیں وہ نہ رہے، پھر یہ بدلنا کیسا　　یہ کہو مٹ گئے دنیا کے بدل جانے سے
نقصِ تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی　　دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے
شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے　　دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے
حکمِ اکبرؔ کو ہوا ہے کہ کرو ترکِ سخن　　خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

(۳۰۱)

دم لبوں پر تھا دلِ زار کے گھبرانے سے　　آ گئی جان میں جاں آپ کے آ جانے سے
تیرا کوچہ نہ چھٹے گا ترے دیوانے سے　　اس کو کعبے سے نہ مطلب ہے نہ بت خانے سے
بچتا ہوں کوئے حسیناں کی ہوا کھانے سے　　فائدہ کیا ہے دبی آگ کے بھڑکانے سے
رقص کرتی ہے صبا، گرم نوا ہے بلبل　　کشتہ اس ناچ کا ہوں، مست ہوں اس گانے سے
جو کہا میں نے کہ کرو کچھ مرے رونے کا خیال　　ہنس کے بولے مجھے فرصت ہی نہیں گانے سے
جاں بلب دیکھ کے سینے سے لگایا اس نے　　گھٹ گئی شرم مرے شوق کے بڑھ جانے سے
خیر چپ رہئے مزا ہی نہ ملا بوسے کا　　میں بھی بے لطف ہوا آپ کے جھنجھلانے سے
خوش کرے کیا مجھے غنچوں کا شگفتہ ہونا　　رنج ہوتا ہے بہت پھولوں کے کمھلانے سے
اپنے دل ہی کی رفاقت میں بسر کی میں نے　　شکر اللہ کا ہے، نبھ گئی دیوانے سے
شیخ نافہم ہیں، کرتے جو نہیں قدر اس کی　　دل فرشتوں کے ملے ہیں ترے دیوانے سے
مضطربِ عشقِ بتاں میں ہوں عبث میں اتنا　　رام ہو جائیں گے کیا وہ مرے گھبرانے سے
میہماں چرخِ ستمگر کا کیا قسمت نے　　کوئی چارہ نہیں اب خونِ جگر کھانے سے
خوانِ الوانِ جہاں پر یہ ہوا ہم کو یقین　　حفظِ ایماں ہے فقط خونِ جگر کھانے سے
میں جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں　　کارِ دنیا نہ رکے گا ترے مر جانے سے
رونقِ عشق بڑھا دیتی ہے بے تابیِ دل　　حسن کی شان فزوں ہوتی ہے شرمانے سے
دلِ صد چاک سے کھل جائیں گے ہستی کے یہ پیچ　　بل نکل جائیں گے اس زلف کے اس شانے سے
کون ہمدرد کسی کا ہے جہاں میں اکبرؔ　　ایک اُبھرتا ہے یہاں ایک کے مٹ جانے سے
صفحۂ دہر پہ ہیں نقشِ مخالف اکبرؔ　　ایک اُبھرتا ہے یہاں ایک کے مٹ جانے سے

(۳۰۲)

کل تک محبتوں کے چمن تھے کھلے ہوئے
دو دل بھی آج مل نہیں سکتے ملے ہوئے
اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے انھیں کے ہزاروں گلے ہوئے
آنکھیں دکھا رہی ہیں کہ ہے دل میں بیر بھی
عارض اگرچہ گُل کی طرح ہیں کھلے ہوئے

(۳۰۳)

آنکھیں مجھے تلووں سے وہ ملنے نہیں دیتے　　ارمان مرے دل کا نکلنے نہیں دیتے
خاطر سے تری یاد کو ٹلنے نہیں دیتے　　سچ ہے کہ ہمیں دل کو سنبھلنے نہیں دیتے
کس ناز سے کہتے ہیں وہ جھنجھلا کے شبِ وصل　　تم تو ہمیں کروٹ بھی بدلنے نہیں دیتے
پروانوں نے فانوس کو دیکھا تو یہ بولے　　کیوں ہم کو جلاتے ہو کہ جلنے نہیں دیتے
حیراں ہوں کس طرح کروں عرضِ تمنا　　دشمن کو تو پہلو سے وہ ٹلنے نہیں دیتے
دل وہ ہے کہ فریاد سے لبریز ہے ہر وقت　　ہم وہ ہیں کہ کچھ منہ سے نکلنے نہیں دیتے
گرمیِ محبت میں وہ ہیں آہ سے مانع　　پنکھا نفسِ سرد کا جھلنے نہیں دیتے

(۳۰۴)

وہ حجاب ان کا آج تک نہ گیا　　نہ گیا اُن کے دل سے شک نہ گیا
اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی　　وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا
کیا ٹھہرتا ہمارے آگے غیر　　دیکھیے آخرش کھسک نہ گیا

(۳۰۵)

حسن نے ناز کئے، عشق کی تکمیل ہوئی　　نہ نظر آپ کی سمجھی، نہ مرا دل سمجھا
آپ دیکھیں مجھے اور میں نہ کروں یادِ خدا　　موت سے آپ نے ایسا مجھے غافل سمجھا

(۳۰۶)

اب شغلِ زندگی کے ہیں قانون ہی کچھ اور　　کیسی غزل، یہاں تو ہے مضمون ہی کچھ اور
وہ جادوئے سخن ہے نہ وہ رنگِ انجمن　　تہذیبِ مغربی کے ہیں افسون ہی کچھ اور

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے　　فخریہ آپ سنانے لگے نظمِ ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں مرے تھے بے دست　　آپ کے کون تھے ملٹن، یہ سنوں حضرتِ من

بوسے جاڑوں میں لالۂ گنگا دیں　　دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکیں
ڈاڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں　　مدعا یہ کہ گھام لیتا ہوں

---

۱ انگریزی میں بجلی پیدا کرنے کے آلہ کو کہتے ہیں۔

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں　　یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہر بات پہ تم قسمیں کھانا جب یاد کریں راجہ صاحب　　دربار اودھ میں اے اکبر واللہ نہیں، تو کچھ بھی نہیں
ملنے کا کسی سے ہے یہ مزا، اک جوشِ طبیعت ہو پیدا　　اس بزم میں میرے پہونچنے پر آہا نہیں، تو کچھ بھی نہیں

تھا تصوّر بالکل آزادیٔ رندانہ ہوں　　لیکن اب بالکل اسیرِ انتظامِ خانہ ہوں
پہلے تھے اس بت کے گرد، اب ساتھ ہے بچوں کی فوج　　عشق میں دیوانہ تھا، اب فکر میں دیوانہ ہوں

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مذہب نے کہا کہ جان سے عاری ہیں　　آپس ہی کے لوگ باعثِ خواری ہیں
گویا قزاق تھے، ہوئے ہیں اب اسیر　　اپنوں ہی میں کچھ گرہ کاری ہیں

حیراں ہیں اس زمانے میں ہم جی کے کیا کریں　　جائز سہی شراب، مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجہ کی ہوتی نہیں نصیب　　پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے، بی کے کیا کریں

شیخ کی وہ دھج نہیں، وہ شیخ کی ڈاڑھی نہیں　　دوستی مذہب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں　　اور تیرے بیان کی دلآویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بےخوف　　لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند　　کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

گورمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　گلے میں جو اتریں، وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر　　انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

شیخ اس درجہ اناڑی ہے، جو گھوڑے پہ چڑھے　　باگ گردن میں، رکاب آ کے پھنسی ران میں ہو
لات دنیا پہ نہ مارو ابھی اے حضرتِ شیخ　　بیٹھکیں کر لو ذرا، زور تو کچھ ران میں ہو

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنون کو　　اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں　　پھینکیے اب کوٹ کو، تہ کیجیے پتلون کو

دقیانوسی طریق سے منہ موڑو　　شیرازۂ مذہبی لُغت کا توڑو
بھوکے سے کہو کہ حدِ تہذیب میں رہ　　آنتوں کو کہو کہ قل ھو اللہ چھوڑو

فقط مذہب سے تم میں عزت و وقعت کی ہے یہ بُو　　وگرنہ اور کیا نسبت، کجا ولیم کجا کلّو

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو، طعنۂ حالی سنو　　با ہنر ہو کر جو چمکو، قوم سے گالی سنو
ہم کو تو پیرِ طریقت نے بھی دی ہے صلاح　　قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سنو

اونٹ نے گایوں کی ضد پر شیر کو پوجا بھی کیا　　پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھا چاہتے ہو ہاتھ اپنی دسترس　　منہ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنّا نہ دو

تکلفات سے للہ اپنا سر نہ پھراؤ　　جو دال روٹی ہو موجود، وقت پر وہ کھلاؤ
مجھے بھی چکھو گے کیا رکھ کے خوانِ نعمت پر　　کباب کرتا ہے اب مجھ کو انتظارِ پلاؤ

نیکی کے حق میں کج ادائی نہ کرو　　اللہ کے ساتھ بےوفائی نہ کرو
نیٹو بھی رہو گے اور مرو گے بھی ضرور　　کہتا ہوں کہ دعوئ خدائی نہ کرو

صاحب سے اذن لے کے کروں گا میں عشقِ چشم　　لیسنس ہے ضرور ہرن کے شکار کو

جب پڑی قومی مصیبت تو کسی نے کیا کیا　　سب ہوئے اندوہگیں، خونِ جگر سب نے پیا
ہاں جو شاعر تھے انہوں نے نالۂ موزوں کے ساتھ　　داغِ دل کو آسمانِ نظم پر چمکا دیا

پیتا ہوں شرابِ آبِ زمزم کے ساتھ　　رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹم ٹم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی اور مجازی دونوں　　قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

قوم سے مے کی سفارش کیا کروں　　نیک کو شیطان کر دیتی ہے یہ
ایک جوہر ہے فقط اس میں مفید　　خودکشی آسان کر دیتی ہے یہ

رُباعیات و قطعات و دیگر منظومات

(۱)

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لیے　　اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لیے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر　　نظّارۂ شاہدِ معانی کے لیے

(۲)

تائیدِ وضعِ ملت و دیں کی کروں گا میں　　اہلِ زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش　　سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سو طبیب پر

(۳)

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب　　اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثلِ نسیم وہ گلے سے لگ جائے　　مانندِ کلی کے پھول جانا اچھا

(۴)

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا　　غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بےشمار دیکھیں لیکن　　کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

(۵)

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا　　احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر　　لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

(۶)

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا　　افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی　　جینا ذلت سے ہو، تو مرنا اچھا

(۷)

رشوت ہے نگوڑے نیک نامی کا چھرا   عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری   گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

(۸)

گزرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ   سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جسم ہے موجود   کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

(۹)

وفا میں ثابت قدم رہنے کی ترغیب:-

ہر چند محلِ انقلابات رہا   گھٹنے بڑھنے کا پیچ دن رات رہا
چھوڑیں نہیں منزلیں قمر نے اپنی   ذی رتبہ و صاحبِ مقامات رہا

(۱۰)

آزاد سے دیں کا گرفتار اچھا   شرمندہ ہو دل میں، وہ گنہ گار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے اِک خصلتِ بد   واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

(۱۱)

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں   اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ، وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

(۱۲)

انقلابِ جہاں کو دیکھ لیجے   حُبِّ دنیا سے قلب پاک ہوا
کل کلی کھل کے ہو گئی تھی پھول   پھول کمھلا کے آج خاک ہوا

(۱۳)

تھا سر میں کمال، وہ تو سلطان بنا   تھا دل میں جمال، وہ مسلمان بنا
لذتِ طلبی سے نفس رندی پہ جھکا   تھا پیٹ بہت حریص، شیطان بنا

(۱۴)

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا   چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر   اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

(۱۵)

رُسوا وہ ہُوا جو مستِ پیمانہ ہُوا   لپکا جو سایہ پہ، وہ دیوانہ ہُوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست   محروم اُدھر، اِدھر سے بیگانہ ہُوا

(۱۶)

کرم حق پہ رکھ نظر اپنی   جو عقیدہ ترا نہ ہو ڈھیلا
آسرا سب کا چھوڑ دے اکبر   وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

(۱۷)

مجلس میں خیالِ بادہ نوشی پایا   مکتب میں سرِ سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر   لیکن اک عالمِ خموشی پایا

(۱۸)

کہنے کو تو شاہ سب ہیں، مہاراج ہیں سب   مالک دولت کے، مالکِ تاج ہیں سب
لیکن کھولو جو چشمِ تحقیق اکبر   بے بس ہیں سب، خدا کے محتاج ہیں سب

(۱۹)

جلوۂ ارض و سما دکھلا کے ہے نیچر بھی چپ   لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ کہہ کے پیغمبر بھی چپ[1]
بحث اُس کی ذات میں کیوں کر رہا ہے فلسفی   ایسے ایسے چپ ہیں، یہ ہوتا نہیں اس پر بھی چپ

(۲۰)

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم   ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بُت نکال دیئے تھے رسولؐ نے   اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

(۲۱)

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد بہت   ساحر کم ہیں، ملیں گے صیاد بہت
ہے بزمِ سخن کا حال یہ اکبر   شاعر کم ہیں مگر ہیں استاد بہت

(۲۲)

بندوں نے بھلا دیا ہے وہ عہدِ الست   نا فہمی و حرص میں ہیں اکثر بدمست
کیا زید و بکر معترض ہوتا ہے   اِک گور پرست ہے تو ایک زور پرست

(۲۳)

پیری آئی، ہوئی جوانی رخصت   ساتھ اس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبر   ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

(۲۴)

تری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست   خدا گواہ کہ یہ کچی ہے بات اے دوست
طلب مدد کی نہیں اُن سے جو ہیں خود محتاج   طلب مدد کی ہے بالصّبرِ والصلوٰۃ اے دوست

(۲۵)

تحریکِ ضرورتِ معیشت ہے بہت   خرقہ کو بھی اب خیالِ خلعت ہے بہت
خالق سے جمال کا تو سودا کم ہے   اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت

(۲۶)

دُنیا کرتی ہے آدمی کو برباد   افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی   عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد

(۲۷)

حق نے جنہیں دی ہے فہمِ قرآن مجید   ہونے کے نہیں وہ پیر گردوں کے مرید
بدلے سو رنگ انقلابِ دُنیا   ہر حال میں اُن کو ہے خدا ہی سے امید

(۲۸)

کس نماند ست کہ در بیشۂ شکارے بکند   تیغ گیرد بکف و فتح دیارے بکند
ایں زماں ہمتِ مرداں بہ ہمیں محدود ست   زنے از پردہ برون آید و کارے بکند

(۲۹)

چھوڑ دہلی، لکھنؤ سے بھی نہ کچھ امید کر   نظم میں بھی وعظِ آزادی کی اب تائید کر
صاف ہے، روشن ہے اور ہے صاحبِ سوز و گداز   شاعری میں بس زبانِ شمع کی تقلید کر

(۳۰)

فرمانِ اجل کا آ گیا وقتِ صدور   ہوں گے کوئی دم میں شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر کیا کہتے ہیں   یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند حضور

(۳۱)

دیکھیے اکبر کے آج کچھ اشعار   آئی بے حد پسند یہ گفتار
تخمیر بہ خود بنے گا واعظِ دیں   لیک بعد از خرابیٔ بسیار

(۳۲)

بے سود ہے یہ شکوہ و لفاظی و سیر   افسوس ہے مخلصوں کو اور بنتے ہیں غیر

---

[1] اشارہ ہے کلمہ طیبہ لا اِلٰہ اِلا اللہ کی طرف

پہلے ابجد سے اب لیٹر کہہ کر ہوسکتی ہے تب اُمیدِ تمتّت بالخیر

(۳۳)

منکر ہیں روح کے جو یہ اہلِ غرور اک امر ہے پوچھنا ہمیں ان سے ضرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو پیدا ہُوا مادہ میں کیوں کر یہ شعور؟

(۳۴)

سیّد صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور کہتا نہیں تم سے ہیں کہ ہو اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

(۳۵)

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر لکھیں یارب ملک میرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی کی ہے پایا نہیں میں نے اس کا انجام بخیر

(۳۶)

ہو علم اگر نصیب، تعلیم بھی کر دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو جو اہل ہیں اس کے، ان کی تعظیم بھی کر

(۳۷)

یہ تھی غلطی دیا جو معبود کو چھوڑ اصلاح یہ ہے، نمود بے سُود کو چھوڑ
بزمِ ملت کا عافیت جُو ہے اگر اللہ کے آگے جُھک، اُچھل کُود کو چھوڑ

(۳۸)

کہہ دو کہ میں خوش ہوں، رکھوں گر آپ کو خوش بجلی چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

(۳۹)

بے سُود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش ذلّت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈھ محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

(۴۰)

غالب انساں پہ خود پسندی ہے فقط مذہب کیا ہے، گروہ بندی ہے فقط
ہر فتنۂ دہر سے یہ آتی ہے صدا نعمت ہے اگر تو عقلمندی ہے فقط

(۴۱)

ہے ماہِ صیام کی نہایت تعریف بے شبہ یہ ہے مہذب و پاک و لطیف
نا اہلوں کو یہ کبھی لگاتا نہیں مُنہ کہتے ہیں اسی سبب سے رمضاں کو شریف

(۴۲)

تکمیل میں اُن علوم کے ہو مصروف نیچر[1] کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں عہدہ مطلوب ہے، وطن ہے مالُوف

(۴۳)

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی اُمنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرتِ مذاقؔ ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

(۴۴)

اہلِ حرص و طمع پر طعن:-

ہے حرص و ہوس کے فن کی مجھ کو تکمیل غیرت[2] نہیں میری بزمِ دانش میں دخیل

ہیں نفس کی خواہشیں بہت مجھ کو عزیز جب چاہے کریں خوشی سے وہ مجھ کو ذلیل

(۴۵)

بے غیرت و خود فروش و جاہل سے نہ مل حق سے جو ہو غافل، ایسے غافل سے نہ مل
یک جا کر دیں حوادثِ دہر اگر جائز ہے کہ اُن سے مل، مگر دل سے نہ مل

(۴۶)

دل ہو جو وسیع اور روشن ہو خیال ہر رنگ دکھاتے تجھ کو خالق کا جمال
سارا دنیا ہے اس کو پیاری اکبر کہتا ہے کم آل[1]، جس کو حاصل ہے کمال

(۴۷)

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم
مسجد سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا مذہب جو مٹا تو زورِ ملت معدوم

(۴۸)

خواہانِ علم، نہ طالبِ گنج ہیں ہم بے کینہ و بے ریا و بے رنج ہیں ہم
لغزش ہو کوئی تو دوست فرمائیں معاف آزاد ہیں، مست ہیں، سخن سنج ہیں ہم

(۴۹)

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم گو پالشیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زباں نہیں ہے شمعِ اخلاص جلنے والے بہت ہیں، دل سوز ہیں کم

(۵۰)

اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی گذرتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقی قومی ہے ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

(۵۱)

دیکھو جو مقابل اس کے سارا عالم دُنیا بخدا ہے اک ذرّے سے بھی کم
اس اک ذرّے میں ہے ہماری کیا اصل نافہم ہیں، کہ رہے ہیں ناحق ہم ہم

(۵۲)

مخلوط کرو نہ نفس و نیچر کو بہم گر نفس نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم
جو بھوک لگے زباں کو، وہ ٹھیک نہیں نافع وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

(۵۳)

پڑتا ہے بُتوں سے ساعتِ چند کا کام تمہید میں اس کی دولت و عمر تمام
اللہ سے ہر نفس کا رہتا ہے لگاؤ دشوار ہے نفس پر عبادت کا نام

(۵۴)

علم و حکمت میں ہو اگر خواہشِ فیم[2] سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم[3]
شادی نہ کر اپنی قبلِ تحصیلِ علوم بُت ہو کہ پری ہو، خواہ وہ ہو کوئی میم

(۵۵)

بھولے جاتے ہیں ہسٹری بھی اپنی مذہب کو بھی ضعیف پاتے ہیں ہم
ہے دولت و جاہ بھی کمی پر ہر روز ظاہر یہ ہے کہ مٹتے جاتے ہیں ہم

(۵۶)

اس بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں تسکین کے جو تھے سبب، اُٹھے جاتے ہیں
اک قوتِ مذہبی عقیدوں سے تھی وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

---

۱ ایک انگریزی مورخ کہتا ہے کہ یہ مسئلہ ڈارون کی سمجھ میں نہیں آیا۔

۲ عالیجناب شیخ احمد حسین صاحب خان بہادر تعلقہ دار پریانواں

۱ COME ALL ۲ FAME (شہرت) ۳ AIM (مقصود)

(۵۷)

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں　　بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار　　مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

(۵۸)

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں　　مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزلِ عدم اے اکبرؔ　　اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

(۵۹)

توحید اِن کے دلوں میں محفوظ نہیں　　اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں
اس فرقۂ نو کو میں نے دیکھا اکبرؔ　　اسلام اس کی نظر میں ملحوظ نہیں

(۶۰)

تجھ کو بھی جہاں میں کچھ شرف ہے کہ نہیں　　کوئی طاقت تری طرف ہے کہ نہیں
داخل ہے نمازیوں میں یا فوج میں ہے　　آخر تری بھی کوئی صف ہے کہ نہیں

(۶۱)

وہ رنگِ کہن تمہارے عاشق میں نہیں　　اُلجھا ہوا اب وہ طرزِ سابق میں نہیں
الفت ثابت کرو عمل سے صاحب　　واللہ دخل میری منطق میں نہیں

(۶۲)

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں　　اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرء القیس بنیں　　پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

(۶۳)

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت　　کہ ہم کیوں کر وہاں کا حال جانیں
لحد تک آپ کی تعظیم کر دی　　اب آگے آپ کے اعمال جانیں

(۶۴)

دلکش نہیں وہ حسیں جسے شرم نہیں　　رونق نہیں اس کی جس کا دل گرم نہیں
سختی میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف　　پگھلی ہے برف گرکہ وہ نرم نہیں

(۶۵)

سمجھے جو کوئی بُرا یہ مضمون نہیں　　کوئی پہلو خلافِ قانون نہیں
ہر چند کہ یہ مزے چکھاتا ہے بہت　　شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں

(۶۶)

وہ غیرتیں، وہ صبر، وہ ایمان ہیں کہاں　　حسنِ عمل کے دل میں وہ ارمان ہیں کہاں؟
اِک غل مچا ہوا ہے کہ مسلم ہیں خستہ حال　　پوچھے ذرا کوئی کہ مسلمان ہیں کہاں؟

(۶۷)

اُلفت اور ادب نہیں تو انسان نہیں　　بے صبر و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں
جو غیرِ خدا کو جانتا ہو قادر　　اکبرؔ بخدا کہ وہ مسلمان نہیں

(۶۸)

بیخود ہیں وہ جو دل سے ہیں اللہ کے خواہاں　　ہیں مست نگاہ بُتِ دلخواہ کے خواہاں
آسودہ ہیں، علم و ہنر و فن میں جو ہیں محو　　چکر میں ہیں بس جاہ کے اور شاہ کے خواہاں

(۶۹)

ہے صبر و قناعت اک بڑی چیز اکبرؔ　　لذت ابھی اس کی تو نے چکھی ہے کہاں
دنیا طلبی کے وعظ میں محو ہے تو　　یہ بھی تو ذرا سمجھ کہ رکھی ہے کہاں

(۷۰)

مشکل ہے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں　　پہچانتیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تفصیل نہ پوچھ، ہیں اشارے کافی　　یوں نہیں یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

(۷۱)

گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں　　اب ابتری سے یہ قوم رُکتی ہی نہیں
ہوتی نہیں ان میں کچھ بھی غیرت پیدا　　اور بات اکبرؔ کی ہے کہ چُبھتی ہی نہیں

(۷۲)

چغلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں　　ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے، لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ　　ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

(۷۳)

اوروں کی کہی ہوئی جو دُہراتے ہیں　　وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسبِ حال مضمون نکال　　انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

(۷۴)

کہنے سننے[1] کی گرم بازاری ہے　　مشکل ہے مگر اثر پڑا ہے دل میں
ایسا سُنیے کہ کہنے والا اُبھرے　　ایسے کہیے کہ بیٹھ جائے دل میں

(۷۵)

لفظوں کے چمن بھی اس میں کھل جاتے ہیں　　بے ساختہ قافیے بھی مل جاتے ہیں
دل کو مطلق نہیں ترقی ہوتی　　تعریف میں سر اگرچہ ہل جاتے ہیں

(۷۶)

خاطر مضبوط، دل توانا رکھو　　اُمید اچھی، خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں　　اکبرؔ اللہ پہ بھروسا رکھو

(۷۷)

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو　　اللہ سے نیک اُمید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبرؔ　　بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

(۷۸)

تہذیب وہ ہے کہ رنگِ مذہب بھی ہو　　آزاد وہ ہے کہ جو مؤدب بھی ہو
تزئین وہ ہے کہ خاکساری بھی ہو ساتھ　　اسپیچ وہ ہے کہ اس میں یارب بھی ہو

(۷۹)

اللہ کا صدق سے جو طالب ہو　　حیرت نہیں گر ملک کا ہم قالب ہو
ہرگز نہ بڑھیں گے اس سے نیچر کے مرید　　ممکن نہیں جسم روح پہ غالب ہو

(۸۰)

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو　　بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ　　دیکھنا اکبرؔ بچائے رکھنا اپنے آپ کو

(۸۱)

اسلام ہی کو بس اپنی ملت سمجھو　　بیگانہ روش میں اپنی ذلت سمجھو
جو اس کے خلاف رائے رکھے اکبرؔ　　خاموش رہو، سمجھ کی قلت سمجھو

لہ سنسکرت کا ایک بڑا مصنف ہے۔

[1] SPEECH، تقریر

(۸۲)

جس بات میں تم شکستِ ملت سمجھو   اس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو
جو بندۂ نفس ہو مخالف اس کا   قومی غیرت کی اس میں قلت سمجھو

(۸۳)

کچھ منع نہیں، ہر ایک کی تحریر پڑھو   لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمتِ دنیا کی جب دبائے دل کو   خالق کا کرو خیال، تکبیر پڑھو

(۸۴)

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو   باتیں جو بُری ہیں، اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر   اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

(۸۵)

دنیائے دنی کی یہ ہوس جانے دو   گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ   اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

(۸۶)

شیطان واعظ ہے، پنبہ در گوش رہو   غالب ہے اسی کی بات، خاموش رہو
بدلا پاتا ہوں مجلسِ دہر کا رنگ   ہستی کی ہوس نہ ہو تو بیہوش رہو

(۸۷)

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی   اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ   موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

(۸۸)

اے حیدرِ بزرگ کے نواسو، پوتو!   تزئین کو تہ کرو، زمینیں جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت   اللہ مدد کرے گا، ویسے ہو تو!

(۸۹)

شہوات کی بے دردی کا منصوبہ نہ ہو   دولت تری خادمہ ہو، محبوبہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا، ہو جائے   لیکن بہ تکلفاتِ مطلوبہ نہ ہو

(۹۰)

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی
من تُرا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ
من تُرا پاجی بگویم، تو مرا پاجی بگو

(۹۱)

ہوئی نصیب تلخ کامی تم کو   محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام   ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

(۹۲)

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو   تقدیر کا نام لیں تو بدنامی ہو
القصہ عجیب ضیق میں ہیں ہندی   یورپ کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

(۹۳)

مُغوی کو بھی بد نہ کہیے، ترغیب ہے یہ   کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن   اک شور مچا، خلافِ تہذیب ہے یہ

(۹۴)

ہے عقلِ بشر بھی تابعِ حکمِ خدا   بے فائدہ سب میں بحث و تقریر ہے یہ
مذہب کے باب میں ہے الٹا شبہ   کہہ دو اکبر کہ جزوِ تقدیر ہے یہ

(۹۵)

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ   تا دمِ مرگ رہے یادِ خدا، جان کے ساتھ
میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی   سر ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

(۹۶)

مسکین گدا ہو یا شاہِ ذی جاہ   بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں اِک وقت   کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

(۹۷)

خوبی طاعت کی ہے مسلّم اب بھی   عزت اس کی نہیں ہوئی کم اب بھی
خود بین و حریص و جنگجو ہو نہ اگر   واقف کی نظر میں ہے مکرّم اب بھی

(۹۸)

رغبت جو دلائی وسعتِ مشرب کی   شامل اس میں غرض تھی بے شک سب کی
لیکن تبدیلِ وضع و نقلِ ناتج   ہے بعض کی بات اور اپنے ہی مطلب کی

(۹۹)

مذہب ہے گم ترقیِ یورپ کے سامنے   معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی
لیکن وہ آفتاب ہے اور یہ ہے مثلِ ابر   ابرِ غلیظ سے ہے نہاں آفتاب بھی

(۱۰۰)

راحت کا ساماں بڑھا تو غفلت بھی ہوئی   حسرت کا کھچا جو سین، عبرت بھی ہوئی
دنیا میں ہے جو پیش آیا اکبر   بس اس کے مطابق اُس کی حالت بھی ہوئی

(۱۰۱)

تحصیلِ علوم کر کہ دولت ہے یہی   اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت[1]   محفوظ ہو معصیت سے، عزت ہے یہی

(۱۰۲)

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی   اور ذکرِ خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اُس سے بڑھ کر   بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

(۱۰۳)

روزی مل جائے، مال و دولت نہ سہی   راحت ہو نصیب، شان و شوکت نہ سہی
گھر بار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ   دربار میں باہمی رقابت نہ سہی

(۱۰۴)

رازِ بتِ شوخ کی خبر ہی نہ ملی   دل کیا ملتا، کبھی نظر ہی نہ ملی
کیا وصل کا حوصلہ کریں پیشِ رقیب   جن کو اس وقت تک کمر ہی نہ ملی

(۱۰۵)

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی، غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیالِ ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز یہ بحث ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی مانک
غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک[2]

---

[1] سید عشرت حسین خلفِ حضرت اکبر

[2] دوائے مقوی کو ٹانک کہتے ہیں ۱۲

(۱۰۶)

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی   دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی   کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

(۱۰۷)

گو کہ رک سکتی نہیں یہ نقلِ وضعِ مغربی   پھر بھی کامل طور پر ممکن نہیں ہم تابی
اپنی تاریخ، اپنی ملّت سے رہو تم باوفا   بندگی تم کو مبارک، صاحبوں کو صاحبی

(۱۰۸)

دیکھے جو حوادثِ سماوی ارضی   قائم کرلیں ہیں تو نے باتیں فرضی
بھولا ہے خدا کو ذرا غور تو کر   زندہ رکھتی ہے تجھ کو کس کی مرضی؟

(۱۰۹)

وہ شوکت و شانِ زندگانی نہ رہی   غیرت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی
پردہ اُٹھا تو کھُل گیا اے اکبر   اسلام میں وہ اب لن ترانی نہ رہی

(۱۱۰)

حصہ حریص کا ہے بے دینی و غلامی   قانع کے واسطے ہے اعزاز و نیک نامی
محنت ہی کے لیے ہے تفریحِ قلب روزی   مقبولِ دوستاں ہے اکبر کی خوش کلامی

(۱۱۱)

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی   ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ   عزت کے لیے کافی ہے اے دل نیکی

(۱۱۲)

بارہا جوشِ جنوں میں مجھے آیا ہے خیال   کہ تماشا ہے یہ ہنگامۂ ہستی و بدی
نظرِ عشق میں ہے زندگی و موت اکبر   اضطرابِ نفسِ چند و سکونِ ابدی

(۱۱۳)

یہ زینتِ دنیا ہے کہ مٹی پہ ہے پتی   بچوں کے سوا کون ہو اس کا متمنی
گوشِ شنوا ہو تو سنوا سکے ترانے   اس بزم میں اکبر سا نہیں کوئی مغنی

(۱۱۴)

اس عہد میں یہی ہے بس داخلِ نکوئی   مذہب پہ نکتہ چینی، ملت کی عیب جوئی
شوقِ عمل نہیں ہے، فکرِ اجل نہیں ہے   ناصح بنے ہیں اکثر، عابد نہیں ہے کوئی

(۱۱۵)

منظور اے دل ہماری عرضی ہوگی   اُس وقت کہ جب خدا کی مرضی ہوگی
اس دورِ فنا میں ہوگی لیکن جو بات   وہ صرف برائے نام و فرضی ہوگی

(۱۱۶)

تاثیرِ ہوائے باغِ ہستی نہ گئی   صورت کی ادا، نظر کی مستی نہ گئی
ہوتے ہی رہے جمالِ دل کش پیدا   طبعِ انساں سے بت پرستی نہ گئی

(۱۱۷)

سوچو کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے   دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے
ہشیار رہ کے پڑھنا، اس جال میں نہ پڑنا   یورپ نے یہ کہا ہے، یورپ نے وہ کہا ہے

(۱۱۸)

رکتا نہیں انقلاب چارہ کیا ہے   حیراں ہیں ملک، بشر بچارا کیا ہے
تسکین کے لیے مگر ہے کافی یہ خیال   جو کچھ ہے، خدا کا ہے، ہمارا کیا ہے

(۱۱۹)

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے   رنگِ چمن فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آکے رازِ فطرت   سنتے ہی پیامِ دوست کھل جاتا ہے

(۱۲۰)

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم   لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں رازِ دہر، شکوہ ہے تو یہ   اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

(۱۲۱)

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے   یا کوئی شئے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا   پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

(۱۲۲)

تو نے دل دہر سے ملا رکھا ہے   قائم غفلت کا سلسلہ رکھا ہے
کیا خود زندہ ہے اپنی طاقت سے تو   آخر کس نے تجھے جِلا رکھا ہے؟

(۱۲۳)

قرآں میں ہمیں خدا نے سمجھایا ہے   شیطان نے فلسفہ میں اُلجھایا ہے
قسمت اب دیکھنی ہے دل کی اکبر   معلوم نہیں کہ یہ کدھر آیا ہے

(۱۲۴)

دنیا نے دین کو بھُلا رکھا ہے   غفلت کی نیند میں سُلا رکھا ہے
اس دور میں خوش نصیب وہ ہے اکبر   جس نے قرآن کو کھُلا رکھا ہے

(۱۲۵)

ہر حال میں بہرِ نوعِ انساں وہ ہے   اللہ و رسول کا بھی مطلب وہ ہے
قرآن کو غور سے پڑھو اور سمجھو   اکبر بخدا کہ جانِ مذہب وہ ہے

(۱۲۶)

یہ رباعی ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی تھی۔

لکچر[1] سے نہ کچھ خیالات سے ہے   تہذیب سے ہے، نہ ترکِ عادات سے ہے
اکبر بخدا، یہ ساری کامیابی   تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

(۱۲۷)

دنیائے دُنی محلِ آفات بھی ہے   فکرِ روزی مخلِ اوقات بھی ہے
طرّہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور   جیتا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

(۱۲۸)

انسان نہیں معتبر، لیاقت بھی ہے   محسوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
اندازِ سخن سے بھی ہے اندازۂ طبع   اک جزوِ قوی مگر شرافت بھی ہے

(۱۲۹)

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے   لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایمان کا ہو نور دل میں، وہ راحت ہے   عزّت وہ ہے جو اپنی ملّت سے ملے

(۱۳۰)

آپس میں موافق رہو، طاقت ہے تو یہ ہے   دیکھو نہ بہم عیب، محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو، روزی بھی ہو، دل کو بھی ہو تسکین   دنیا میں بشر کے لیے نعمت ہے تو یہ ہے

(۱۳۱)

حاسد تجھ پر اگر حسد کرتا ہے   کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے

---

[1] LECTURE

اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس　　اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

(۱۳۲)

انبساطِ نفس الگ ہے، روح کا وجد اور ہے　　وشتِ وحشت اور ہے، اور وادیٔ تجرد اور ہے
ہو جو باطن کی ترقی تجھ کو منظورِ نظر　　یاد رکھ اکبر تجبر اور ہے تجد اور ہے

(۱۳۳)

ارماں نہ شراب و بزمِ شاہد کا ہے　　ساماں نہ محافل و مساجد کا ہے
اکبر کو ہے اُنس کنجِ تنہائی سے　　دھیان اس کو فقط خدائے واحد کا ہے

(۱۳۴)

کچھ شک نہیں کہ خلق سے ملنا ضرور ہے　　جو اس سے اختلاف کرے حق سے دور ہے
لیکن خدا کے واسطے خلقِ خدا سے مل　　سمجھے گا اس کو وہ کہ جو اہلِ شعور ہے

(۱۳۵)

انسان جو عمر ختم کر چکتا ہے　　خوش ہو چکتا ہے، آہ بھر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہے رنگ　　زندہ جو رہا بھی وہ تو مر چکتا ہے

(۱۳۶)

سُنیے حکمت جو مری گفتار میں ہے　　اک حدِ ادب ہر ایک سرکار میں ہے
پروانہ نے شمع سے لپٹنا چاہا　　پہلے تھا نور میں اور اب نار میں ہے

(۱۳۷)

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے　　دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی　　اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

(۱۳۸)

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگِ دیں　　دنیا کی جس کو شرم ہے، مردِ شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں، اس کو کیا کہوں　　فطرت میں وہ رذیل ہے، دل کا کثیف ہے

(۱۳۹)

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے　　اس کے لیے کون سر بکف ہوتا ہے
دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامۂ دشوار　　حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

(۱۴۰)

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے　　بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہر توانائی ہو　　اخلاق میں علیل ہو جاتی ہے

(۱۴۱)

دُنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے　　بے غیرت و بے دلیل پایا میں نے
اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبر　　شدت سے اُسے علیل پایا میں نے

(۱۴۲)

افسوس سفید ہو گئے بال ترے　　لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے
تو زُلفِ بُتاں بنا ہوا ہے اب تک　　دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال ترے

(۱۴۳)

ہیں وعدۂ خالقِ دو عالم سچے　　قرآن سچا، رسولِ اکرمؐ سچے
اے منکرِ دیں، قیامت آنی ہے ضرور　　کہہ دیں گے وہاں کہ دیکھ لے ہم سچے

(۱۴۴)

جب واقعاتِ اصلی، پیشِ نظر نہ آئے　　شاعر نے کام رکھا تحسین و آفریں سے
الفاظ نے سنور کر اپنے قدم جمائے　　نیچیر کی گذارش، رخصت ہوں میں یہیں سے

(۱۴۵)

ایسے بھی ہیں، خلق جن کو فرعون کہے　　ایسے بھی ہیں جنہیں محمد عون کہے
میں نام بنام تم سے کہتا اکبر　　نازک ہے مگر معاملہ کون کہے

(۱۴۶)

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے، پتلون بھی ہے　　بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی　　یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے؟

(۱۴۷)

دولت بھی ہے، فلسفہ بھی ہے، جاہ بھی ہے　　لطفِ حسنِ بتانِ دلخواہ بھی ہے
سب سے قطعِ نظر ہے مشکل لیکن　　اتنا سمجھے رہو کہ اللہ بھی ہے

(۱۴۸)

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے　　مطلب کی کہوں تو پالسی میں اُڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش　　غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

(۱۴۹)

اعلیٰ مقصود چاہیے پیشِ نظر　　کوشش تری گو ہو لطفِ ذاتی کے لیے
فرہاد پہاڑ پہ عمل کرتا تھا　　شیریں کے لیے کہ ناشپاتی کے لیے

(۱۵۰)

مذہب قانون و قوم کا بانی ہے　　خالص طاعت عروجِ روحانی ہے
توہین ایک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ　　یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے

(۱۵۱)

ہمدرد ہوں سب، یہ لطفِ آبادی ہے　　ہمسایہ بھی ہو شریک، تب شادی ہے
تسکین ہے جب کہ ہو خدا پر تکیہ　　قانون بنا سکیں، تب آزادی ہے

(۱۵۲)

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے　　واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر　　چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

(۱۵۳)

ایمان و حواس و حق پرستی کیا ہے　　یہ غفلت و کفر و جوشِ مستی کیا ہے
لاریب یہ سب ہے ایک ہستی کا ظہور　　یہ مجھ سے نہ پوچھ پھر وہ ہستی کیا ہے

(۱۵۴)

جینا تھا جس قدر ہمیں، دنیا میں جی لیے　　ساغر کئی طرح کے ملے اور پی لیے
غم بھی رہا، خوشی بھی، تحیر بھی، فکر بھی　　جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم بس اسی لیے

(۱۵۵)

طاقت وہ ہے بااثر جو سلطانی ہے　　اس جا ہے چمک جہاں زرافشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر　　اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

(۱۵۶)

انسان چاہیے جو بات اچھی چاہے　　بدیوں سے محترز ہو، نیکی چاہے
شیطان سے وہ فلاسفی ہے منسوب　　جس کا مطلب ہے کہ وہ جو جی چاہے

۱؎ یہ بصیغۂ جمع چاہیے۔

(۱۵۷)

پاکیزگیِ نفس کی دشمن مے ہے — انساں کو خراب کرنے والی شئے ہے
شیطان کی ہے پرائیوٹ سکرٹری[1] — مسلم اور اس کو مُنہ لگائے ہے ہے

(۱۵۸)

یہ دربار ہے خالقِ دوجہاں کا — ادب اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے
نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ — یہ عالم خود آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

(۱۵۹)

اوہام کے ہاتھ سے نہ ایذا سہیے — بندوں کے نہیں، خدا کے ہو کر رہیے
ہے پیشِ نگاہ جلوۂ ارض و سما — سُبحان اللہ جوشِ دل سے کہیے

(۱۶۰)

چیخے، چلائے، کُودے، اُچھلے، ٹہلے — ہر پھر کے وہیں رہے، جہاں تھے پہلے
حالت تو وہی ہے بلکہ اُس سے بدتر — یوں مُنہ سے جو جس کے دل میں آئے کہہ لے

(۱۶۱)

غلط فہمی بہت ہے عالمِ الفاظ میں اکبرؔ — بڑی مایوسیوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے
یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اس کا عاشقِ صادق — مگر کہتی ہے خلقت، شمع سے پروانہ جلتا ہے

(۱۶۲)

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے — دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا — پھر کیا تم عرش کے تارے بھی ہوئے

قطعات

جلوۂ دربار دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا، اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی — شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی — خیر اب دیکھیے لُطفِ قوافی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا — اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا — حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے — گورے دیکھے، کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے — بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا — اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا — عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نُور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جمپ[1] سے جاری

کچھ چہروں پر مُردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی — دل نے جو حالت کر دی، دیکھی

ڈالی میں نارنگی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی
بیرنگی، بارنگی دیکھی — دھر کی رنگا رنگی دیکھی

ہاتھی دیکھے بھاری بھر کم — ان کا چلنا، کم کم، تھم تھم
زرّیں جھولیں، نُور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم، چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع — سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر کُٹتی دیکھی — سانس بھی بھیڑ میں گُھٹتی دیکھی
آتش بازی چھُٹتی دیکھی — لُطف کی دولت لُٹتی دیکھی

چوکی اک چوکھٹی دیکھی — خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سُو نعمت رکھی دیکھی — شہد اور دُودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصہ من و سلوا — ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا — میرا حصہ دور کا جلوا

اوجِ برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا — رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں اُن کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی اُن کا — چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی، ساقی اُن کا — آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں — ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں — سب سامانِ عیش و طرب ہیں

اگزیبیشن[2] کی شان انوکھی — ہر شے عمدہ، ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی — من بھر سونے کی لاگت سوکھی

---

[1] PRIVATE SECRETARY

[1] JUMP، جست ۱۲   [2] EXHIBITION، نمائش

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ[1] میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے
قصۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہورِ کوچہ و برزن
ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائرِ ہوش تھے سب کے پرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہرزن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک
زرّیں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا اُن کا اوجِ سما تک
چرخ پہ زُہرہ ان کی تھی گاہک

گو رقّاصہ اوجِ فلک تھی
اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اِندر کی محفل کی جھلک تھی
بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے
کوئی مانے خواہ نہ مانے
سنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو، وہ جانے

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقلِ مسلم سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
گئی دنیا تو پھر ہم دین کو اب کیوں لگا رکھیں
بڑا معلوم ہوتا ہے مسائل کا یہ پشتارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں، مناسب ہے شکست اُن کی
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی، ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بیچارے کو رکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انکارا
چلے مقراضِ تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی، یہ گھر ہو منہدم سارا
عمل جاری رہے، بالکل فقط الفاظ رہ جائیں
انھیں بھی پست کر دے مغربی حکمت کا نقّارا
ترقی پائے گی قوم آپ کی پھر دورِ گردوں میں
عجب کیا ہے کہ پھر بہنے لگے اقبال کا دھارا
قیامت کر گئی قومی ترقی کوششِ مسلم میں
لگا کہنے، زہے نعمت اگر حاصل شود مارا
اگر آں شاہدِ مغرب بدست آرد دلِ مارا
بچشمِ مست او بخشیم تسبیح و مصلّیٰ را
مصلّے کو عرض تہ کر کے اٹھا عابدِ مشرق
جو طاقت آگئی تھی دل میں، اس طاقت سے للکارا
اِدھر تحریر، اُدھر اسپیچ، اِدھر سازش، اُدھر بندش
اسے جھڑکا، اُسے ڈانٹا، اِسے گانٹھا، اُسے مارا
نتائج پر نظر کب مردِ عاشق تن کی ہوتی ہے
وہ سمجھے ہیں نئی اک قوم کا بن جاؤں گا دارا
دور روزہ پالسی نے اس طرف سے تقویت دے دی
اُدھر بجنے لگا فتح و ظفر کا پھر تو نقّارا
دُنزا عہدے، تبسم مشوَرے، وعدے بنے گیسو
وہ گیسو جس سے پھیلی بُو، ہوئے مستِ عنبر سارا
حواسِ ظاہری کے دام سے بچنا ہوا مشکل
کجا موہوم حوریں اور کجا پریوں کا نظّارا
وہ لوٹے، یہ گرے، وہ پھسلے، یہ چپت، اُن کو غش آیا
نہ ایماں میں رہی طاقت، نہ دل میں ضبط کا یارا
حریفانِ طرب آگیں نے چھیڑا سازِ عشرت کو
بجایا سب نے مضرابِ ہوس سے وار وا دارا
بتوں کے عشق میں پڑ ہی چکے تھے عقل پر پتھر
مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا
غریبوں، دردمندوں، بیکسوں کے دل کی کیا بستی
وہ حالت پیش آئی تھی کہ جس سے موم ہو خارا
نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبرؔ کی ظرافت سے رُکے یارانِ خود آرا
زبانِ حال سے فریاد تھی یہ اہلِ تمکیں کی
کہ اے منظمِ جہاں را حافظ و لے عرش را دارا
فغاں زیں ساحرانِ دلکش مسانِ آفتِ ایماں
چناں بُردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را
ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا
نہ تھا یہ مطلب سیّد کہ اس رُخ پر چلے دھارا
وہ پردے کے بڑے حامی تھے، طاعت کے مؤیّد تھے
وہ خواہاں تھے کہ چمکے اوج پر اسلام کا تارا
حباب آسا جو آسانی سے ٹوٹا گنبدِ مذہب
تو کیا اقبال و عزت کا اُدھر بہنے لگا دھارا؟
سُنا سب کچھ مگر دیکھا جو بالآخر تو کیا دیکھا
وہی اینٹیں، وہی پتھر، وہی چونا، وہی گارا
اِدھر شیرازۂ قومی کو ہم ہیں توڑتے جاتے
اُدھر بازی حریفوں کی ہے، ہاتھ اُن کے ہے پوبارا
نتیجے ہم نے خود آنکھوں سے دیکھے دورِ روشن میں
فلک نے سرکشوں کو خاکِ ناکامی پہ دے مارا
کہیں تحقیرِ مذہب کی کوئی تعظیم کرتا ہے
بجھا کر نورِ دل کوکب ہے چمکا بخت کا تارا
بہت ہے غفلت و ترکِ عملِ دنیا میں، یہ مانا
عقیدہ اصل ہے لیکن وہ ہونا چاہیے پیارا
مدارِ خیرخواہی[1] ترکِ مذہب پر نہیں ہرگز
ہر اک نے دل سے انگلش کی ہے لائلٹی کا دم مارا
نہ تھا یہ مطلبِ سادہ کہ اسمٰعیل کا خسرہ ہو
حریفانہ نہ ہو اندازِ مطلب تھا یہی سارا
جب اپنی ہسٹری ہم بھول جائیں گے تو کیا ہوگا
خدارا اک نظر اس سین کا کرتے تو نظّارا
صلوٰۃ بے وضو سے دور ہی ہے اس طرف مسجد
اُدھر قرآن بے رغبت سے مل مذہب کا سی پارا
مشینیں چل رہی ہیں اور کسی کی کچھ نہیں چلتی
اِدھر ہیں بے چھلے کُندے، اُدھر ہے برق وش آرا
خود اپنی قوم کی تحقیر کرنا، اس کے کیا معنی؟
یہ کس جادو نے بچوں کو کیا خود بین و خود آرا؟
کہیں اطفالِ ناداں ہیں، کہیں پیرانِ بے طاقت
یہ غوطے کھاتے ہیں، نقرے میں آتا ہے وہ بیچارا
یہ اخلاقی، یہ روحانی بنائیں ٹوٹتی کیوں ہیں
یہ نفسِ مطمئنہ پر ہوا کیوں غالب امّارا
یہ کس کل کے بنیں گے جزو، کھو کر اپنی ملّت کو
مگر ہاں اپنے بیلوں میں ملا لے کوئی بنجارا
ہمارے حکمراں تو چرچ میں سرگرمِ طاعت ہوں
تو ہم بندے پھریں کیوں دشتِ بے دینی میں آوارا
عمل مطلب ہے بیشک، مگر نور اپنا کیوں کھوئیں
زمانے کو ہے گردش، ہم نہیں ثابت سے سیّارا
ہو الاوّل ہو الآخر ہی شہدِ روح پرور ہے
پھر آزاد ہو کر یہ ہے بالو کا شکر پارا
بٹھایا کیوں نہیں جاتا یہ نقشِ جانفزا دل پر
کہ روحانی ترقی میں ہو لڑکا عرش کا تارا
بہت فکر اس کی ہے دن رات قومی بزرگوں کو
مگر کمزور یہ موجیں، اُدھر غفلت کا ہے دھارا
میں یہ پیچیدہ بحثیں پیش کرنے کو تھا آمادہ
کہ اتنے میں جنابِ حضرتِ حافظ نے للکارا
حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سیّد یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنیڈ[2] بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحیِ مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحتِ ناپاک
اُدھر ہے وحیِ ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

یہ تسبیح و تکبیر و حمد و دعا
ہے نورِ دلِ بندگانِ خدا
یہ پلٹن کے گورے ہر اتوار کو
سجاتے ہیں گرجا کے دربار کو
اگر یہ کہو، ہیں وہ بالکل وحوش
تو دیکھو کہ عابد ہیں حضرت لیٹوش[3]
جب اڈورڈ ہفتم ہوئے تھے علیل
تو کی قوم نے یادِ ربِّ جلیل
کمی کی نہ اسٹیٹ نے خرچ میں
دعائیں ہوئیں دھوم سے چرچ میں

---

[1] FORT، قلعہ

[1] LOYALTY، خیرخواہی [2] LEMONADE [3] اُس زمانہ کے گورنر یوپی کا نام ہے۔

وہ جنرل کہ دبتی تھی جن سے زمین ہیں گرجا میں راکع مع الراکعین
ہوئے جنگ سے زارۂ اندیشہ ناک گرے سجدے میں پیشِ اللہ پاک
سر بادشاہانِ گردن فراز بدرگاہِ او بر زمینِ نیاز

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں، مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی، یہ گیا تو سب گیا
نیشنل فیلنگ[1] تو ہم میں کبھی تھی ہی نہیں
اتحادِ دیں فقط باقی رہا تھا، اب گیا
ہے عقیدوں کا اثر اخلاقِ انساں پر ضرور
اس جگہ کیا چیز ہوگی، وہ اثر جب دب گیا
پیٹ میں کھانا، زباں پر کچھ مسائل ناتمام
قوم کے معنی گئے اور رُوح کا مطلب گیا
منقلب ہوتے ہیں پیہم طالب العلموں کے کورس
کورس بھی رخصت ہُوا، اُس کا زمانہ جب گیا
اتحادِ معنوی ان میں برائے نام ہے
دیکھتے ہو اک گروہ، اک راہ ہو کر کب گیا
بعد ازیں کیا حشر ہوگا، یہ تو سوچو دوستو
جو اٹھا پھر بہرِ ہلاکِ ملت و مشرب گیا
اس سے نفرت ان کو ایسی مستقل تازی زباں
حیف مسلم سے خیالِ مبنی و معرب گیا
مجلسِ دنیا میں کس صف کے ہوئے مستحق
دُور ہو او لارڈ[2] سے اور پر تو یارب گیا
نوکری کے باب میں وہ پالیسی قائم نہیں
ہوش میں آؤ، وہ رنگِ روز و رنگِ شب گیا
ہم یہی کہتے ہیں صاحب، سوچ لو انجامِ کار
دوسرا پھر کیا ٹھکانا ہے اگر مذہب گیا

اِک لُعبتِ چیں کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مفاعیلن
احباب نے تیرِ مطاعن سے اُن کے دل کو مجروح کیا
باپ اُن کے یہ بولے کشتی مری واللہ ڈبو دی، ہائے غضب
اس لڑکے نے صحبتِ بد پا کر یہ کارِ ابنِ نوح کیا
تعلیم کو میں نے بھیجا تھا، تزویج کی اس نے ٹھہرائی
ممدوح تو بننا بھول گیا، بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا، اے قبلہ و کعبہ سنیے تو
یہ کون برائی میں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

مسانِ خود فروش آخر فرستادند ایں بلہا طلب کردند زر چنداں کہ خوں افتاد در دلہا

نشاطِ طبع برہم شد شکست آں رنگِ محفلہا الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
اِدھر ہے علمِ دیں سینہ بہ نورِ ایماں طلب سے زائل اُدھر کالج کا بیڑا پار کرنے پر ہے دل مائل
اِدھر ہے نوکری دشوار، چکر میں ہے ہر سائل شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابِ چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا
نہ قیدِ شرع باقی ہے نہ آزادی کی ہے کچھ حد نہیں کچھ گفتگو اس باب میں، یہ نیک ہے یا بد
بزرگوں کا بھی فتویٰ ہے کہ پڑھ قانونِ سرسید[1] بمی سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا
کہاں کی پیش بینی، جب طبیعت ہی نہ تھی حاضر مقیمِ دیر تھے دلچسپ تھی بزمِ بتِ کافر
نہ تھا کچھ پاسِ ایماں، دل کی تھی مدِ نظر خاطر ہمہ کارم ز خود کامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا
جو ہونا چاہتا ہے بدر، بن جا ماہِ نو حافظ نہ کر آرام، رہِ طلب میں تیز رو حافظ
لگائے رہ اسی سے رات دن تو اپنی لو حافظ حضوری گر ہمی خواہی، ازو غافل مشو حافظ
متیٰ ما تلق من تہویٰ دع الدنیا و اہملہا

آئینہ لفظِ خدا ہے بیسیوں مفہوم کا اور ازاں جملہ مرادف ہے یہ نامعلوم کا
سب کا حصہ قوت و حالت کے لائق ہے یہاں بس یہی مطلب تو ہے اے مہرباں مقسوم کا

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائے گا جوبن پیدا
وہ تو پیدا نہ ہُوا، ہاتھ سے لڑکوں کے مگر ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا
پستیٔ قوم کے جب آ گئے دن اے اکبر اُونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
دین کیا چیز ہے، شیرازۂ قومی ہے فقط جس سے ملت کی ہے اک صورتِ احسن پیدا
آج ہوتا نہیں اس کا ضرر ان کو محسوس ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالہ و سوسن پیدا
بالیقیں آئے گا اس باغ پہ ایسا اک وقت کہ چلیں گی روشیں نشتر و سوزن پیدا
صورتِ برگِ خزاں دیدہ بکھریں گے اُڑتے نہ بہار آئے گی، پھر ہوگا نہ گلشن پیدا
باپ کے خون سے ہو گی جو حمیت زائل ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا
کاہ کی طرح سے اڑ جائیں گے دینی اعمال اختلافات کے ہو جائیں گے خرمن پیدا
ظلمتِ جہل سے گھر جائیں گے دل کے اطراف سینوں میں ہو نہ سکیں گے دلِ روشن پیدا
کون کہتا ہے کہ انگلش کا نہ ہو دل سے مطیع کون کہتا ہے، نہ کر اُلفتِ وِلسن[2] پیدا
کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جوبن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ، عقل نہ سیکھ کون کہتا ہے، نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
قوم قوم اٹھ کے پھر سنتے ہیں ہم، قوم کہاں تار باقی نہیں، تُو کرتا ہے دامن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی یہ جو ٹوٹی، تو نہیں کوئی نشیمن پیدا
کچھ گھروندا نہیں نیشن[3] کہ بنا لیں لڑکے فطرتی طور پہ خود ہوتی ہے نیشن پیدا
سلف ریسپکٹ[4] کا پھر یاد رہے گا نہ سبق پھر نہیں ہونے کی یہ بحثِ تو و من پیدا

---

۱ NATIONAL FEELING ۲ O LORD، یا خدا

۱ اگرچہ اختلافِ حرکت قافیہ اساتذہ کے یہاں ہے مگر یہاں میں سرسید سے قافیہ نہیں ملا سکا ۔
۲ WILSON ۳ NATION، قوم ۴ SELF-RESPECT، عزتِ نفس

بزمِ تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج جس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

بے شک نئی روشنی ہے بہتر ہے کہیں انسان کے لیے کرسچین[1] ہو جانا
یزداں کا خیال تو دلاتا ہے وہ دیں ہے کفرِ صریح، اہرمن ہو جانا
مرشد کہتے ہیں تو ہے ناداں اے دوست بات اور ہے صاحبِ سخن ہو جانا
میری چالیں بھی ہیں اسی کی تمہید سکھلاتے ہیں پہلے بے دہن ہو جانا
ساکت کر دے گی ان کو جب بے علمی آسان ہو گا اُدھر وطن ہو جانا

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا چرچا ہے جا بجا ترے حالِ تباہ کا[2]
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا دل میں ذرا اثر نہ رہا لَا اِلٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطاں نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر بندہ بنا دیا ہے تجھے حُبِّ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج راحت میں جو مخل ہو، وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر کیا جانیے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی وہ حاکموں کی شان، وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی جس سے تجمل ہو نورِ رخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا، چاہ کا
نوخیز، دلفریب، گل اندام، نازنیں عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُکیے اگر، تو ہنس کے کہے اک بتِ حسیں دل مولوی، یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھن بندھے سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا
منبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشہ میں اے جناب سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

گرمیِ بحث میں انور نے یہ اکبر سے کہا کر رہے احمدِ مرسل پہ تو قائم نہ رہا
رہ گئی سب ہے فقط اوہام پرستی تجھ میں بادۂ جہل کی لبس آ گئی مستی تجھ میں
نہ مقاصد میں بلندی، نہ خیالات صحیح بحرِ عصیان و تعصب میں تو ڈوبا ہے صریح
سخت ناعاقبت اندیش ہیں شیخ و ملّا قوم برباد ہوئی جاتی ہے کھُلّم کھُلّا
کہا اکبر نے، یہ الزام ہے بے شبہ درست تو ہے مجھ سے بھی زیادہ مگر اس راہ میں سُست
کبر و تزئین و تجمل سے تجھے ہے بس کام دل میں انکار ہے، اور لب پہ ہے نامِ اسلام
طاعتِ حق کی ترے قلب میں گرد نہیں نفسِ سرد نہیں ہے، دلِ پُر درد نہیں
ہم اگر پختگی سے جاتے ہیں خامی کی طرف تیرا میلان ہے الحاد و غلامی کی طرف
تو بھی اس رنگ سے محروم ہے، ہم بھی محروم صادق آتا ہے یہی قولِ شہیدِ مرحوم
اے صبا مایۂ سودا نہ تو داری و نہ من بُوئے آں زُلفِ چلیپا نہ تو داری و نہ من

نامہ بنام اودھ پنچ ۱۸۷۷ء

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت وے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت عنوانِ صحیفۂ بلاغت
خلّاقِ معانیِ طرب خیز کشّافِ رموزِ عشرت انگیز
ہادی و ادیب و دانش آموز گوہر افشاں و گوہر اندوز
زینت دہِ شاہدِ تکلّم آئینۂ خندہ و تبسّم
سرچشمۂ قول و وعظ و گفتار گنجینۂ وعظ و پند و اسرار
اے فخر دہِ زبانِ اُردو وے اوج دہِ نشانِ اُردو
رنگینی میں غیرتِ گلستاں شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
دن رات یہی ہیں اب تو چرچے پڑھتے ہیں دل کو اس کے پرچے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی حاسد کا حسد، دلیل اس کی
معقول مزاح ہے تو یہ ہے شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے
ہرچند کہ زہر بیشتر ہے گو فقرۂ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھُلا ہے یہ آبِ حیات میں بجھا ہے
وہ شربتِ حفظِ عقل و ایماں یہ مُردہ دلوں کو ہے رگِ جاں
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں
ہر کس کہ بدید، گفت خوب است باللہ مفرّحِ القلوب است
رندوں کی زباں میں پسندِ دل خواہ سبحان اللہ، واہ وا واہ
ہرچند کہ طرزِ پنچ لندن بے شبہ ہے دل پسند و پُرفن
لیکن وہ نقشِ اوّلیں ہے نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاء اللہ یہ نقشِ ثانی بہتر ہے بصورتِ معانی
وہ پیرِ معمّر و کہن سال یہ خیر سے نونہالِ اقبال
وہ اک گلِ صد بہار دیدہ یہ غنچۂ تازہ، نو دمیدہ
مولودِ سعیدِ مریم طبع عیسیٰ دم و گوہرِ یم طبع
لطفِ شامِ اودھ ہے اس سے روشن نامِ اودھ ہے اس سے
اک نور ہے مہرِ لکھنؤ کا اختر ہے سپہرِ لکھنؤ کا
وہ سرد برنگِ آتشِ گل یہ گرم بسانِ آہِ بلبل
بحثِ مضموں میں وہ اگر پیچ یہ حلِ نکات میں ہے سرپیچ
واں بازوئے تازِ سست بنیاد یہاں خامۂ نسترۂ چمن زاد
کیسا خامہ، زبانِ معنی کیا ذکرِ زباں کہ جانِ معنی
اُٹھنے میں نگاہِ چشمِ جادو چلنے میں حریفِ تیغِ ابرو
مفتاحِ خزینۂ تصوّر نقّاشِ نگینۂ تصوّر
کتنا اسے شمع کب روا ہے اوصاف میں شمع سے سوا ہے
وہ چہرہ نمائے بزمِ صورت یہ پردہ برافگنِ حقیقت
ہرچند کہ سرمہ در گلو ہے تاہم سرگرمِ گفتگو ہے
رعنا و لطیف و شوخ و بیباک سرگرم و حریف و چُست و چالاک
شاطرِ شاہدِ معانی بانیِ بنائے خوش بیانی
پیچیدگیوں میں حرف زن ہے شانہ کشِ گیسوئے سخن ہے
آزادی کا فخر اسے اگر ہے یاں فخر اس سے زیادہ تر ہے

---

[1] CHRISTIAN، عیسائی [2] یہ قطعہ ۱۸۷۷ء میں لکھا گیا تھا۔

یعنی کہ وہ مطلق العناں ہے
بے قید ہر ایک سو رواں ہے

واں طبع کو زورِ لاتخف ہے
دقت تو جو ہے وہ اس طرف ہے

زنجیرِ حسد کی پائے بندی
باقاعدہ شرحِ دردمندی

تا نظرِ حسودِ بدکیش
ہر گام پہ مثلِ دام در پیش

کوتہ نظرانِ پست فطرت
سرگرمِ شرارت و عداوت

واں شاخِ شجر پہ ہے ترانہ
یاں دیدۂ دامِ آشیانہ

کیونکر نہ ہو ادعائے اعجاز
کھولے ہیں قفس میں بالِ پرواز

کی سیرِ دو عالم اک نفس میں
پھر دیکھیے تو اسی قفس میں

دریا قطرے میں موجزن ہے
غنچے میں بہارِ صد چمن ہے

ہے نوکِ سناں پہ نقشِ پرواز
رقصاں دمِ تیغ پہ بصد ناز

شعلوں کے ہجوم میں سمندر
امواج میں ماہیِ قوی پر

کیا کثرتِ خار سے خطر ہے
یاں دوشِ نسیم پر سفر ہے

پابندی کا کب ہے یاں تاسف
یوسف زنداں میں بھی ہے یوسف

جلوہ ہے وہی، وہی تجلی
شوکت ہے وہی، وہی تعلی

پابند جو یوسفِ سخن ہے
پھیلی ہوئی بوئے پیرہن ہے

ہر رنگ میں ہے بہارِ معنی
ہر لفظ ہے پردہ دارِ معنی

ہر نقطہ ہے نکتۂ بصیرت
ہر حرف ہے کاشفِ حقیقت

صرصر کے جور سے بری ہے
یہ شاخ خزاں میں بھی ہری ہے

وہ مہرِ فلک سے منفعل ہے
یاں روشنیِ دماغ و دل ہے

دریوزہ گری پہ اس کی اوقات
یاں قطب صفت ثبات دن رات

جن سے آسیب کا تھا کھٹکا
ان دیووں نے خوب سر کو پٹکا

غالب تھا اثر میں اسم اس کا
ٹوٹا نہ کبھی طلسم اس کا

ہوتے نہ جو رشک سے وہ بے چین
حسّاد بھی صاد کرتے بالعین

سنیے اک اور نکتۂ خوب
آزادیِ گفتگو ہے معیوب

لاتا ہوں دلیلِ شاعرانہ
دیکھو قدرت کا کارخانہ

منہ کے اندر زباں جڑی ہے
دانتوں کے حصار میں پڑی ہے

بتیس جوانِ سخت طینت
استادہ ہیں مائلِ اذیت

ہیں مثلِ سفید دیو بیباک
طامع، جابر، حریص، سفاک

حد سے جو بڑھے زبانِ گفتار
دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار

پہلو میں جو ان کے ہم نشیں ہو
وہ نوکِ خلال سے حزیں ہو

کتنا ہی وہ ہو ملائم و تر
دانہ پستا ہے ان میں آکر

لوہے کے چنے کہاں سے لائیں
سختی کا انہیں مزا چکھائیں

اس قید میں جب کہ یہ زباں ہے
آزادیِ گفتگو کہاں ہے

باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل
لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل

مرضی تھی خدائے جسم و جاں کی
محدود ہوں شوخیاں زباں کی

دل میں جو آئے بک نہ جاؤ
ہشیار چلو، بہک نہ جاؤ

دریائے خیال موج زن ہے
وقفِ یزداں و اہرمن ہے

ہے شارعِ عام حق و باطل
ناظر اس کی ہے فکرِ عاقل

گذرے جو خیالِ بد بلا کد
بازوئے خرد سے بس کرو رد

باطل پہ نہ جاؤ، حق کو سن لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

خاموش بس اے زبانِ خامہ
منظورِ نظر ہے ختمِ نامہ

ہرچند یہ عالمِ سخن ہے
یاں فیضِ ازل ضیا فگن ہے

ہر گوشے میں وسعتِ فلک ہے
ہر ذرہ میں مہر کی چمک ہے

ہر گام پہ ہیں چمن ہزاروں
اک اک میں گلِ سخن ہزاروں

ہر برگِ گلِ سخن میں سو رنگ
ہر رنگ میں لاکھ لاکھ نیرنگ

نیرنگ ایسے کہ عقل حیراں
حیرت ایسی کہ نورِ عرفاں

ہر سمت ہزار میکدے ہیں
ہر ایک میں لاکھ خم بھرے ہیں

ہر خم میں شرابِ ارغوانی
یعنی رنگینیِ معانی

اک قطرے سے طبع ہو جو ممتاز
سینہ بن جائے مخزنِ راز

وہ راز کہ دل ہو محوِ مستی
مائل ہو سوئے سخن پرستی

ہو طول جو سلسلۂ سخن کا
ہمسر ہو زلفِ پُر شکن کا

پر طولِ بیاں سے فائدہ کیا
اس صرفِ زباں سے فائدہ کیا

بس بس اب روک لے زباں کو
کافی ہے اشارہ نکتہ داں کو

ہو کر آمادہ جان و دل سے
ہو محوِ دعا زبان و دل سے

جب تک ہے رباعیِ عناصر
رنگینیِ نقشِ لوحِ خاطر

جب تک کہ یہ نظمِ بیت ہستی
موزوں ہے برائے خود پرستی

جب تک ہے مُسَدّسِ جوانب
برہانِ مشارق و مغارب

جب تک کہ ہے روح کا لطیفہ
انفاس کا ہر نفس وظیفہ

یہ پیچ دل فریب و زیبا
ہو مونس و جانِ ناشکیبا

تحریک سے مس کو زر بنائے
ٹھہرے تو دل کو گھر بنائے

ہر جامے میں لاجواب نکلے
ہر رنگ میں انتخاب نکلے

ہو سوزِ دلِ یگانہ و غیر
بن جائے چراغِ کعبہ و دیر

جب تک کہ اثر ہے کاف و نوں کا
مفتوں ہو ہر ایک اس فسوں کا

پروانہ اسے چراغ سمجھے
بلبل دیکھے تو باغ سمجھے

خورشید کا نور ہر طرف ہو
ذروں کی کشش اسی طرف ہو

اے حافظ و خالقِ اودھ پنچ
خوش دل رہیں عاشقِ اودھ پنچ

اپنی اپنی مراد پائیں
دیکھیں جب دل کو شاد پائیں

ہر مشتریِ بلند فطرت
پائے دورِ قمر میں رفعت

محتاج ہو سیم کا نہ زر کا
مورد ہو بلندیِ نظر کا

احباب جو اس کے ہیں معاون
عالی منشاں، نیک باطن

ظرّاف و مصنفِ لطائف
طبّاع و مصوّرِ کوائف

سرسبز ہوں گلشنِ جہاں میں
خرّم پھریں باغ و بوستاں میں

رنگیں طبعی سے گل کھلائیں
چشمِ بدبیں کو خوں رلائیں

پیدا ہو وہ گوہرِ مضامیں
دریا سے ہو لب پہ شورِ تحسیں

بیساختہ بول اٹھیں سخنور
اللہ رے طبع و فکرِ اکبر

اودھ پنچ کے نام

گفتش تارکِ مذہب شوم وخوش باشم
منصبے چند ہوس دارم و انعامے چند

خلق را فائدہ نیست ازیں جنگ و جدال
یک دعا ہست دریں محفل و دشنامے چند

گفت خاموش کہ دین است مدارِ ملت
ترک ایں را مکن از پئے خود کامے چند

عیبِ مذہب ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو
نفیِ حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند

برقِ کلیسا

(یہ نظم ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی)

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسنِ بیاں شوخیِ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا، لوٹ گیا، دل میں سکت ہی نہ رہی
سر تھے تمکین کے جس گت میں، وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا وِرد، مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں، میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِؓ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر، نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں، کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے، ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ، یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

ڈال دے جان معانی میں، وہ اردو یہ ہے
کروٹیں لینے لگے طبع، وہ پہلو یہ ہے

ایک بوڑھا نحیف و خستہ و زار
اک ضرورت سے جاتا تھا بازار

ضعفِ پیری سے خم ہوئی تھی کمر
راہ بیچارہ چلتا تھا جھک کر

چند لڑکوں کو اس پہ آئی ہنسی
قد پہ پھبتی کمان کی سوجھی

کہا اک لڑکے نے یہ اس سے کہ بول
تو نے کتنے کو لی کمان یہ مول

پیرِ مردِ لطیف و دانشمند
ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند

پہنچو گے میری عمر کو جس آن
مفت مل جائے گی تمھیں یہ کمان

میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسبِ دستور

چھوڑیئے آپ یہ ہنگامۂ تعلیمِ جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خداوندِ غفور

بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

انگلش ڈریس[1] انور کا جو کل بزم میں دیکھا
اکبر نے کہا، یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر
تبدیلیِ صورت کے رہے گر یہی اطوار

خالق کی عبادت سے حجاب آنے لگے گا
شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

بیگانہ و وحشی ہو گی عزیزانِ وطن سے
بنگلے میں نہاں ہو گے کہیں چھوڑ کے گھر بار

فاتح سے مساوات کی اٹھیں گی امنگیں
وہ زیست جو آسان تھی، ہو جائے گی دشوار

آپس میں بھی تم لوگ موافق نہ رہو گے
ایک ایک کو دیکھے گا بہ اکراہ و بہ انکار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے، نہ اُدھر کے
انگریز بھی کھنچتے رہیں گے، قوم بھی بیزار

انور نے کہا صلِّ علیٰ، واہ، بہت خوب!
شک اس میں نہیں، مدح کے قابل ہے یہ گفتار

لیکن جو یہ تعمیم ہے حضرت کے سخن میں
اس کو تو نہ تسلیم کرے گا یہ گنہگار

ہر مذہب و ملت میں ہیں اچھے بھی، بُرے بھی
وہ کون سا فرقہ ہے کہ سب جس میں ہوں ابرار

ملبوس و مکاں کا جو کیا آپ نے مذکور
اس کے بھی بجا ہونے کا مجھ کو نہیں اقرار

باطن سے ہے اخلاقِ حمیدہ کا تعلق
فطرت میں جو ہے نیک، وہ بد ہوگا نہ زنہار

اوضاعِ زمانہ تو بدلتے ہی رہیں گے
رکتی نظر آتی نہیں دنیا کی یہ رفتار

ہے جس کو ضرورت، وہ ضرورت سے ہے مجبور
ہے شوق جسے، کیوں نہ کیا جائے وہ مختار

مقصود جو اصلی ہے وہ ہے دل کی درستی
یا ہیٹ و اورکوٹ[2] ہو یا جبّہ و دستار

شبہ مرے اس قول کی صحت میں اگر ہو
سن لیجئے سعدی کا یہ ارشادِ گہربار

حاجت بہ کلاہِ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار

یہ قطعہ ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا

بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر

بچھا فرشِ زمرد اہتمامِ سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر

عروجِ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر

بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہو کر

جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہو کر، کسی نے ارغواں ہو کر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگِ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر

زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

---

[1] ENGLISH DRESS
[2] OVERCOAT

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانہ میں کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہو کر

میں نے کہا، بہت سی زبانیں ہوں جانتا مُدت تک امتحان دیئے امتحان پر
جرمن، فرنچ، لیٹن[1] و انگلش پہ ہے عبور ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر
ایک شوخ طبع مس نے دکھائی زباں مجھے بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہو گے زیست کی لذت سے بیخبر قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر

ہوئی جو مجھ سے یہ فرمائش بتِ طنّاز کہ فن شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگا دے اس پہ کوئی مصرعِ حسین و نفیس زمانہ با تو نہ سازد: تو با زمانہ بساز
کہا یہ میں نے کہ ہے قیدِ حسن و خوبی کی تو سُن یہ شعرِ نشاط آور و نگاہ نواز
پھبن ہے سایہ مری جاں، آثار کرشمہ ناز زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز
ناخوش جو ہوا میں اپنی بے قدری پر اِک ناز سے مُسکرا کے بولی وہ مس
عزت کا تو کچھ بھی تجھ میں باقی نہیں وصف افسوس کہ رہ گیا ہے تحقیر کا حس

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ کیا ہے میں نے جس کو زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے، یہ اچھی سنائی کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ تو استعفا مرا باحسرت و یاس

اگرچہ پولیٹکل[2] بحث میں ہوئے ہیں شریک جناب پنڈت جے چند و بابو آشتوتوش
مگر یہاں تو ہے بالکل سکوت اس مد میں سمجھا گئے ہیں یہ مضمون سیدِ ذی ہوش
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشینی، تو حافظا مخروش

اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد اس خطا پر سُن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید، لندن جاؤ، انگریزی پڑھو قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو سوپ کاری کے مزے لو، چھوڑ کر یخنی و آش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادہ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خُم کے خُم ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا، پریوں کا سایہ ہو گیا جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیانِ زہرہ وش جادو نظر یاں جوانی کی امنگ اور اُن کو عاشق کی تلاش
اس کی چتون سحر آگیں اس کی باتیں دل ربا چال اس کی فتنہ خیز، اس کی نگاہیں برق پاش
وہ فروغِ آتشِ رخ جس کے آگے آفتاب اس طرح جیسے کہ پیشِ شمع پروانے کی لاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا اک برقِ بلا دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دُور باش
دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش
بار بار آتا ہے اکبرؔ میرے دل میں یہ خیال حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش

یہ قطعہ ۲۷ اگست ۱۸۹۱ء کو بمقام کانپور لکھا گیا

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک
میاں سے بی بی ہیں، پردا ہے ان کو فرض مگر میاں کا علم ہی اٹھا تو پھر میاں کب تک
طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں یہ غیرتیں، یہ حرارت، یہ گرمیاں، کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک
جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مُصر ابلیس چھپیں گی حضرتِ حوا کی بیٹیاں کب تک
جناب حضرتِ اکبرؔ ہیں حامیٔ پردہ مگر وہ کب تک اور اُن کی رباعیاں کب تک

وہ سودیؔ سخن گوئے شیریں مقال جو انگریز شاعر تھا اک بے مثال
بفرمائش دخترِ باتمیز کہ رکھتا تھا جس کو وہ دل سے عزیز
لکھی اس نے نظم اک لاجواب دکھائی ہے شکلِ روانیٔ آب
جو بہتا ہے پانی میانِ لوڈور اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور
مناسب جو انگلش مصادر ملے مقفّیٰ کیے ان کے سب سلسلے
یہ جمعیت افعال کی خوب کی کہ درسی بھی ہے اور دلچسپ بھی
یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن کہیں میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن
دکھاؤں روانیٔ دریائے فکر کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر
عجب ہے نہیں ان کی اس پر نظر کہاں میں، کجا سودیٔ نامور
سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں نہیں سہل اس راہ کی منزلیں
مرے پاس سرمایہ کافی نہیں وہ مصدر نہیں، وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت، نہ ویسا مذاق اِدھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق
اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط
موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں
جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا
اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
یہ بہتا ہوا اور وہ تنتا ہوا ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا رُکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں کے روزن، زمیں کے مسام یہ ہے کر رہا ہر طرف اپنا کام
اِدھر چھوٹتا اور پھسکتا اُدھر رُخ اس سمت کرتا، کھسکتا اُدھر
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا

---

[1] LATIN ، لاطینی [2] POLITICAL ، سیاسی

وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا   یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
جھٹکتا ہوا، غل مچاتا ہوا   وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا   یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا   اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا، جوش کھاتا ہوا   بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا
وہ اونچے سروں میں تموج کا راگ   وہ خود جوش میں آکے لاتا یہ جھاگ
سُدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا   تھرکتا ہوا، رقص کرتا ہوا
ادھر گونجتا گنگناتا ہوا   اُدھر خود بخود جھنجھناتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا   یہ پھٹتا ہوا، وہ سمٹتا ہوا
سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا   سرکتا ہوا اور ملتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور بڑھتا ہوا   اُترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا   دباتا ہوا اور لچتا ہوا
پھسلتا ہوا، ڈگمگاتا ہوا   لچکتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا
وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا   وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا   ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا   ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
لرزتا ہوا، تلملاتا ہوا   بلکتا ہوا، بلبلاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا   نشیبوں میں بھرتا بھراتا ہوا
اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا   ٹھٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا   زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا   وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گچھے بہاتا ہوا   وہ جکڑ میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا، دندناتا ہوا   اُمنڈتا ہوا، سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا   سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا   حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا، جگمگاتا ہوا   شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہیں الغرض ہے یہ پانی رواں   بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں
وہ سودے کا سیلانِ آب لوڈور   یہ بحرِ خیالاتِ اکبر کا زور

برق و بخارات کا زور اے حکیم   کب ہے پئے رُوحِ رہِ مستقیم
تار پہ جاتے نہیں اہلِ نظر   دل سے کھنچتا نہیں قلبِ سلیم

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی روح   بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم   نیچر کا اقتضا ہے، رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسبِ حال   پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا   ڈالی بنائے مدرسے کر کے خدا کا نام
صدمے اٹھائے، رنج سہے، گالیاں سہیں   لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

دکھلا دیا زمانہ کو زورِ دل و دماغ   بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی   کالج ہوا درست بصد شان و احتشام
سرمایہ میں کمی تھی، سہارا کوئی نہ تھا   سید کا دل تھا در پئے تکمیلِ انتظام
آخر اٹھا سفر کو وہ مردِ خجستہ پے   احباب چند ساتھ تھے ذی علم و خوش کلام
قسمت کی رہبری سے ملی منزلِ مراد   فرمانروائے ملکِ دکن کو کیا سلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیان کی   خوبی سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آگیا حضور کو حالت پہ قوم کی   پھر کیا تھا موجزن ہوا دریائے فیضِ عام
ماہانہ دو ہزار کیا ایک ہزار سے   اُمید سے زیادہ عطا تھی یہ لاکلام
اکبر کی یہ دعا ہے خدا کی جناب میں   تا حشر اس رئیس و ریاست کو ہو قیام
کیا وقت پر ہوئی ہے کہ بے احتیاجِ فکر   تاریخ اپنی آپ ہے فیاضئ نظام[1]

کہا کسی نے یہ سید سے، آپ اے حضرت   نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
نہ آپ عالمِ برزخ سے مانگتے ہیں مدد   نہ فاتحے کے طریقِ ادا کو مانتے ہیں
نظر تو کیجیے اس بات پہ، جو ہیں ہندو   بصد خلوص ہر اک دیوتا کو مانتے ہیں
بہت وہ ہیں جو عناصر پرست ہیں دل سے   وہ آگ پوجتے ہیں یا ہوا کو مانتے ہیں
کرسچین بھی خدائی میں نام مریمؑ کے   بدل مسیح علیہ الثنا کو مانتے ہیں
خود آپ ہی میں جو ہیں شیعیانِ با تمکین   وہ اہلِ بیت کو، آلِ عبا کو مانتے ہیں
وہ لوگ جو ہیں ملقب بہ صوفیانِ کرام   خدا قبور پہ ہیں، اولیا کو مانتے ہیں
مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے   کسی بزرگ کو یا مقتدا کو مانتے ہیں
پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ   نہ دستگیر نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں
جواب انہوں نے دیا ہم ہیں پیروِ قرآں   ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
سند ہماری ہے ایاک نستعین اے دوست   اُسی یگانہ حاجت روا کو مانتے ہیں
اُسی کا نام زباں پر ہے حیّ و قیوم   اُسی کی قدرتِ بے انتہا کو مانتے ہیں
یہ بوئے شرک ہی ہے جنگ و اختلاف کی جڑ   تو عقلمند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں
جواب حضرتِ سید کا خوب ہے اکبر   ہم ان کے قولِ درست و بجا کو مانتے ہیں
ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر   خدا کو اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں
زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں   وہ صرف قوتِ فرماں روا کو مانتے ہیں

پوچھا پروانہ سے کہ اے ناداں   آگ میں گر کے کیوں گنواتا ہے جاں
جل کے بولا کہ اے خرد دشمن   سن لے مجھ سے یہ معنیٔ روشن
شعلے سے طالبِ وصال اچھا   یا اندھیرے میں پائمال اچھا

کیا وجہ ہے قومی جو ترقی نہیں ہوتی   ہر چند کہ ہے شورِ ترقی کی صدا میں
یہ مسئلہ مشکل ہے، وہی سمجھیں گے جن کو   ہے نشو و نما پولیٹیکل آب و ہوا میں
اک بات تعجب سے مگر میں نے سنی تھی   کل رات کو اک انجمنِ ذکرِ خدا میں
اسپیچ ترقی میں تو آندھی ہے یہ فرقہ
لگتا نہیں دل ان کا ترقی کی دعا میں

---

[1] سید صاحب نے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں نظم مندرجہ بالا کی تعریف چھاپی ہے ۔

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان، مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں، گویا ابھر رہے ہیں

اِدھر ہے قوم ضعیف و مسکیں، اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، وہ نام پہ اپنے مر رہے ہیں

کٹی رگِ اتحادِ ملّت، رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھیں ہیں آبِ صافی، نہا رہے ہیں، نکھر رہے ہیں

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے، خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دیں سے ہم گذر رہے ہیں

قفس ہے کم ہمتی کا سیمیں، پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں، نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے، وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیالِ میٹر[1] کا بڑھ چلا ہے، خدا کا انکار کر رہے ہیں

مگر وہاں کی بنا ہے نیشن، رُکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن[2] خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں

یہاں بجائے نماز گپ ہے، وہاں وہی عزتِ بشپ ہے
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں، وہاں کلیسا سنور رہے ہیں

جنابِ اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں، یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں

چو اشارہ کرد ناصح کہ بیا و بشنو از من   ہمہ طرزِ حیلہ جستن، ہمہ فنِ ساز کردن
گہ امیر گبر بودہ بہ یہود عہد یاری   گہ اینِ دیر بودہ بہ حرم نماز کردن
بخدائی عزیزاں ہمہ امتیاز جستن   بمرادِ غیر بودہ ہمہ عیش و ناز کردن
نظرے فگندہ چشمم بہ حقارتے بدویش   کہ حرام باد دستے سوئے تو دراز کردن
ہمہ اول تو دیدم، ہمہ آخر تو دیدم   نہ خوش است شرحِ احوال و بیانِ راز کردن
تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری   بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

کیا شک ہے آفتاب کے شان و جلال میں   روشن تر اس سے کونسی شے ہے خیال میں
لیکن نہیں وہ کچھ بھی موثر پس از غروب   لازم ہے غور کیجیے اس مسئلہ پہ خوب
ہر چند تم خیال کرو آفتاب کا   گوشہ بھی اٹھ سکے گا نہ شب کی نقاب کا
پوجو گے اس کو تب بھی وہ پھیرا نہ جائے گا   اس کو پکارنے سے اندھیرا نہ جائے گا
انساں کا حال بھی مرے نزدیک ہے یہی   تحقیق کی نظر جو کرو، ٹھیک ہے یہی
کتنا ہی کوئی صاحبِ اوجِ کمال ہو   کتنا ہی با اثر ہو کہ عالی خیال ہو
جب کر گیا جہاں سے وہ ملکِ عدم کو کوچ   پھر اس سے کچھ مدد کا تصور ہے ہیچ در ہیچ
قیوم و حی ذات ہے اللہ کی فقط   زندہ ہمیشہ بات ہے اللہ کی فقط
سن لو کہ اتباع و ادب اور چیز ہے   مطلب کی لیکن ان سے طلب اور چیز ہے
آزردہ کوئی شیخ ہو یا برہمن خفا
حقانیت یہی ہے، یہی ٹھیک فلسفا

کر چکا کالج میں جب تکمیلِ فن   تب یہ بولے مجھ سے مسٹر ماریسن[1]
گو کہ شہرت ہے تمہاری دور دور   مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور
عرض کی میں نے کہ اے روشن ضمیر   ہے یہی تو جس کو روتا ہے بشیر[2]
آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے   اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

یہ طفلِ ناداں غریقِ غفلت، ہوائے ذلّت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے، نظر نہیں ہے، بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

بہار ہی سے نہیں ہیں واقف، خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہیں انہیں کے دل پہ، جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں

نیا فلک ہے، نئے ستارے، یہ شوق سے کرتے ہیں نظارے
انہیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیرِ چرخِ کہن رہے ہیں

یہ آخری صف میں اُگنے والے، بہشت سمجھے ہیں اپنے تھالے
محلِ حسرت ہیں ان کے سینے جو زینتِ انجمن رہے ہیں

رہے ہیں جو برگ و خس کے خوگر، انہیں ہو کیوں خاراں کا منظر
نگاہ تو ہے انہیں کی مضطر جو مستِ سرو و سمن رہے ہیں

بہت خفا تھے مسائلِ دیں کہ ہو رہی ہے ہماری توہیں
اب ان کو منطق منا رہی ہے، وہ سر جھکائے ہیں، من رہے ہیں

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

مزے کا جشن تھا کل اِک شراب خانے میں   کسی نے خوب یہ گایا کسی ترانے میں
خدا کے فضل سے ہم نام کے مسلماں ہیں   وگرنہ چین سے رہتے نہ اس زمانے میں

ہستی کے شجر میں جو یہ چاہو کہ چمک جاؤ   کچے نہ رہو بلکہ کسی رنگ میں پک جاؤ
میں نے کہا، قائل میں تصوف کا نہیں ہوں   کہنے لگے، اس بزم میں آؤ تو تھرک جاؤ
میں نے کہا، کچھ خوف کلکٹر کا نہیں ہے   کہنے لگے آجائیں ابھی وہ تو دبک جاؤ
میں نے کہا، ورزش کی کوئی حد بھی ہے آخر   کہنے لگے بس اس کی یہی حد ہے کہ تھک جاؤ
میں نے کہا، افکار سے پیچھا نہیں چھٹتا   کہنے لگے، تم جانبِ میخانہ لپک جاؤ
میں نے کہا اکبر میں کوئی رنگ نہیں ہے   کہنے لگے، شعر اس کے جو سن لو تو پھڑک جاؤ

کر چکا ختم جب میں اسپنسر   مجھ پہ پڑنے لگی ہر اک کی نگاہ
پوچھا استاد نے کہ سمجھے بھی   ان دقائق نے دل میں کی کچھ رہ
کہہ دیا میں نے اس کا کل مطلب   صاف ہے لا الٰہ الا اللہ
ماسٹر نے کہا، تو کودن ہے   حق پکارا کہ واہ، اکبر واہ

سنا کہ چند مسلمان جمع تھے یک جا   خدا پرست، خوش اخلاق اور بلند نگاہ
کہا کسی نے یہ ان سے کہ یہ تو بتلاؤ   تمہاری عزت و وقعت کا کس طرح ہے نباہ

---

[1] MATTER، مادہ   [2] SALVATION، نجات

[1] MORRISON   [2] ایڈیٹر اخبار البشیر نے لکھا تھا کہ مسلمان پروفیسر مقرر ہو۔

نظر کر وطرف اقتدار اہل فرنگ   کہ اُن کے قبضہ میں ہے ملک و مال و گنج و سپاہ
انہیں کا سکہ ہے جاری یہاں سے لندن تک   انہیں کی زیر نگیں ہے ہر اک سفید و سیاہ
کلیں بنائی ہیں وہ وہ کہ دیکھ کر جن کو   زبانِ خلق سے بے ساختہ نکلتی ہے واہ
تمہارے پاس بھی کچھ ہے کہ جس پہ تم کو ہے ناز   کہا انہوں نے کہ ہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

نہ وہ یک رہ گئے نہ سر سیدؒ   دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ محمود سے تسلّی تھی   لی انہوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی حیرت کہ ہوش میں آؤ   اے حریصانِ شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود   رہ گیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

بنام ایڈیٹر رسالہ ید بیضا

علم اسرار دل و حل معمّا داری   بر تر از نظم دکن نظم ثریّا داری
تو چہ حاجت بہ جمال سخن ما داری   حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مسلمانوں میں اب تعلیمِ انگلش رُک نہیں سکتی   کسی سے مشرق و مغرب کی سازش رک نہیں سکتی
وہ تنزل رک نہیں سکتا، یہ پیچش[1] رک نہیں سکتی   بگڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی
مذاقِ قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے   یہ نقشِ جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

اہلِ یورپ کے ساتھ ہوٹل میں   تھی کھی سیّد نے ایک دن کاری
خانساماں نے کان میں یہ کہا   آپ تو علم سے نہیں عاری
پڑھئے کوئی دعائے اکلِ طعام   دین سے بھی رہے وفاداری
تب یہ اشعار حضرت سعدیؒ   ہوتے ان کی زبان پر جاری
اے کریمے کہ از خزانۂ غیب   گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

نیشنل انتھم[2]

(یہ قومی ترانہ ایڈیٹر دکن ریویو، مولانا ظفر علی خاں کی فرمائش پر شروع ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا تھا)

جو دل کرتے ہیں حق کی پاسبانی   خدا کا ان پہ ہے لطفِ نہانی
سمجھتے ہیں جو قرآں کے معانی   سُنا ہے میں نے یہ ان کی زبانی
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
سرورِ قلب و حرزِ جاں ہے اسلام   معینِ شاہی و شاہاں ہے اسلام
جہاں میں باسر و ساماں ہے اسلام   ابھی تک حافظِ ایماں ہے اسلام
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
مساجد میں وہی شورِ اذاں ہے   وہی اللہ اکبر بر زباں ہے
وہی جوشِ دلِ اسلامیاں ہے   وہی عزت ہے، وہی ابتک سماں ہے
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
دلوں میں ہے خدا کی یاد اب تک   طبیعت ذکر سے ہے شاداب تک
بہت ہیں صاحبِ ارشاد اب تک   بہت ہیں باغِ دیں آباد اب تک
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
عیاں ہے پرتوِ روئے محمدؐ   مشامِ جاں میں ہے بوئے محمدؐ
رواں ہیں قافلے سوئے محمدؐ   وہی ہے رونقِ کوئے محمدؐ
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
دلوں میں کیوں تمہارے ہے یہ خامی   نہیں فطرت میں کچھ بد انتظامی
ابھی تک یادِ حق ہے دل کی حامی   سنو یہ نغمۂ استاد جامی
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
یہ برٹش سلطنت کے ہیں عواطف   کہ مذہب کی نہیں ہے وہ مخالف
تو کیوں ہوتے نہیں تم اس سے واقف   کہ کہتی ہے نگاہِ چشمِ عارف
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
رسول اللہ کو دنیا نے مانا   زبانوں پہ ہے اب تک وہ فسانہ
نہیں اسلام سے خالی زمانہ   سنو اکبر کا یہ قومی ترانہ
ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے   بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے، شریف زادے
لطیف و خوش وضع چست و چالاک و صاف و پاکیزہ شاد و خرم   طبیعتوں میں ہے انکی جودت، دلوں میں انکے ہیں نیک ارادے
کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں، کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں   سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے
ہر اک ہے ان میں کا بیشک ایسا کہ آپ اسے جانتے ہیں جیسا   دکھائے محفل میں قدِ رعنا، جو آپ آئیں تو سر جھکا دے
فقیر مانگے تو صاف کہدیں کہ تو ہے مضبوط، جا کما کھا   قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے
بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ، مسوں کی لیتے نہیں بلائیں   تمام قوت ہے صرف خواندن، نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے
نظر بھی آئے جو زلفِ پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالیسی ہے   الکٹرک لائٹ[3] اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنامِ تہذیب و دردمندی   یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے ہمیں جو تم دو تمہیں خدا دے
انہیں اسی بات پر یقیں ہے کہ بس یہی اصل کارِ دیں ہے   اسی سے ہوگا فروغِ قومی، اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکانِ کالج کے سب مکیں ہیں، ابھی انہیں تجربے نہیں ہیں   خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نورِ ایماں، قوی نہیں ہے مگر نگہباں   ہوائے منطق، ادائے طفلی، یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب، سکھائے تحقیرِ دین و مذہب   مٹا دے آخر کو وضعِ ملت، نمودِ ذاتی کو گر بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جنابِ باری میں یہ دعا ہے   علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

سنہ ۱۸۹۰ء

ترجمہ قول یکے از اکابر یورپ

یہ شیخ اکبر سے اتنا کیوں خفا ہے   یہ کیوں غیظ و غضب، جور و جفا ہے
نہیں ہے اس میں جھگڑے کی کوئی بات   یہ اک قولِ حکیمِ با صفا ہے
نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت   تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

بلبل ہیں آج ہم چمنستان کمپ کے   پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے

---

[1] مطلب یہ کہ ہم کیوں پُڈنگ اور کاری وغیرہ نعمتیں ہوٹل میں کھائیں ۱۲

[2] NATIONAL ANTHEM

[3] ELECTRIC LIGHT برقی روشنی

فکرِ بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی　　اب پارک کا خیال ہے جیسے ہیں پیٹ کے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کر　　خوگر ہوئے ہیں لیپ کے، اسکپ کے، جمپ کے[1]

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے　　تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے
جو خیال ہیں نرالے، تو مذاق ہیں انوکھے　　نہ وہ وضع قوم کی ہے نہ وہ شان ہے نہ دھج ہے
کوئی ان میں سے جو السا کو جو دوان کا ہے لیتا　　جو اسے بھی چھیڑ دیکھا تو وہ کمتر از کھرچ ہے
جو کر آئے سر لنڈن ہیں اسیرِ لیبر و فیشن　　جو ہیں سکے ہیں کن کھن انہیں انبذ سے گریز ہے
نہیں کوئی صاف سینہ، بہم ان میں بھی ہے کینہ　　یہ انہیں کہیں کمینہ، وہ انہیں کہیں ایچ ہے
کہیں میم کا ہے پھندہ کوئی دخترِ رز کا بندہ　　ہے پھر اس پہ ناز و خندہ کہ دل اس میں کیا حرج ہے

پائی ہیں قومیں تجارت سے عروج　　بس یہی ان کے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت　　زورِ یورپ کو اسی کا آج ہے
لفظِ تاجر خود ہے اس کا اکبر ثبوت　　دیکھ لو تاجر کے سر پہ تاج ہے

تمہاری اصل خدا کا کلام واضح ہے　　عبث ہے یہ ولولۂ نقلِ قومِ فاتح ہے
سنو یہ بات جو مجموعۂ نصائح ہے　　وہی ہے باعثِ عزت عمل جو صالح ہے

نہ ہو جو مذہب و ملت کے ساتھ ہمدردی　　زمانہ صاف کہے گا کہ ہے یہ نامردی

انہیں کے واسطے مے کا سرور زیبا ہے　　انہیں کے دل میں طرب کا وفور زیبا ہے
انہیں کو رُوئے زمیں پر غرور زیبا ہے　　مرے لئے فقط اُمیدِ حور زیبا ہے

اسی اُمید میں ساری ترقیاں سمجھیں　　جو آپ حور کے معنی کی خوبیاں سمجھیں

کرزن سبھا

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے　　گلوں میں غیرتِ گلشن کی آمد آمد ہے
رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بشوق　　کہ نائبِ شہِ لندن کی آمد آمد ہے
وہ ہو کے آتے ہیں قائم مقامِ قیصرِ ہند　　ستاروں میں مہِ روشن کی آمد آمد ہے
ہیں اُن کے ساتھ میں آئے اکابرِ یورپ　　کہ گویا دہلی میں لندن کی آمد آمد ہے
غرض یہ ہے کہ ہو تکمیلِ زینت و رونق　　ہر ایک علم کی ہر فن کی آمد آمد ہے
کمر بندھی نظر آتی ہے آب و آتش کی　　ادھر سے کل ادھر انجن کی آمد آمد ہے
دکھا رہے ہیں ہنر مندِ خوابِ مقناطیس　　دلوں میں حالتِ روشن کی آمد آمد ہے
اُمنڈ رہی ہے ہر اک سمت سے فراوانی　　ہر ایک جنس کے خرمن کی آمد آمد ہے
ورودِ فوج سے ہے زرق برق کا عالم　　جدھر کو دیکھئے پلٹن کی آمد آمد ہے
چمک ہے کرچوں کی ہر سو، گمک ہے توپوں کی　　چھما چھم اور دنا دن کی آمد آمد ہے
چہل پہل ہے، اُمنگیں ہیں، جوشِ مستی ہے　　بہارِ عیش پہ جوبن کی آمد آمد ہے
جو پیر ہیں انہیں ہیں ولولے جوانی کے　　جوان ہیں تو لڑکپن کی آمد آمد ہے

تو ہم مذہب و ملت میں ہے کشش پیدا　　مغان و شیخ و برہمن کی آمد آمد ہے
زرہ میں زر نہیں اور ٹیم ٹام لازم و فرض　　اسی سبب سے مہاجن کی آمد آمد ہے
اُچھالے رکھتا ہے اکبر کے دل کو فیضِ سخن　　اگرچہ پیری و پنشن کی آمد آمد ہے

آمد اقبال پری

اقبال پری آئی جو انداز بدل کر　　دنیا کی ہوا ساتھ ہوئی ساز بدل کر

غزل اقبال پری کی زبانی

ہوں ناز سے معمورۂ حکومت سے بھری ہوں　　زریں مرا دامن ہے، میں اقبال پری ہوں
ہر شعلہ مقابل مرے چہرے کے ہے بے نور　　کہتا ہے کہ ہوں بھی تو چراغِ سحری ہوں
ہر ڈھنگ سے دکھلاتی ہوں شان اپنی جہاں کو　　ہر رنگ میں ہیں مستِ مئے جلوہ گری ہوں
انگلینڈ پہ ہوں سایہ فگن حکمِ خدا سے　　شاہنشہِ اڈورڈ کی صورت پہ مری ہوں

مبارک باد پنچ کی طرف سے

قومِ انگلش کو یہ دربار مبارک ہووے　　لارڈ کرزن سا یہ سردار مبارک ہووے
ہو مبارک شہِ انگلینڈ کو تخت و دیہیم　　مجھ کو یہ طبعِ گہربار مبارک ہووے

نصیحتِ اخلاقی

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے　　ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے
گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی　　نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے
خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں!　　کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق　　اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے
البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار　　مائل ہے نیکیوں پہ، برائی سے دور ہے
سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کی پند کو　　وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا　　اس میں نہ ہے فریب، نہ ہی مکر و زور ہے
افکارِ والدین میں ہے دل سے وہ شریک　　ہمدرد ہے، معین ہے، اہلِ شعور ہے
راضی ہے اُس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت　　صابر ہے، با ادب ہے، عقیل و غیور ہے
رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال　　نیکوں کا دوست، صحبتِ بد سے نفور ہے
کسبِ کمال کی ہے شب و روز اس کو دھن　　علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے
لیکن جوان صفات کا مطلق نہیں پتہ　　اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

نظم قومی حسبِ فرمائش نواب محسن الملک بہادر

مسلمانو بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے؟　　تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے؟
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے؟　　حریفوں کی تعلّی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے؟
تمہیں معلوم ہے کچھ، رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر　　کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر
کوئی آگے نہ تھا تم سے ترقی کی تگ و دو میں　　کوئی دس میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں
تمہیں نے فرق بتلایا تھا سب کو گندم و جو میں　　تمہیں سے سیکھ کر بنتی تھیں عالم مغربی قومیں
شرف پایا تھا تم نے امتیازِ حق و باطل سے　　مخالف بھی تمہاری قدر دانی کرتے تھے دل سے
تمہاری عزتیں تھیں، اوج تھا، رتبہ تھا، شانیں تھیں　　تمہاری بات بھی، احکام تھے، کہنا تھا ...

---

[1] LEAP، SKIP، JUMP ـ سب کے معنی اُچھل، کود، پھاند کے ہیں۔

تمہارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں — تمہیں تم تھے، زمانہ میں تمہاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو — سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
تمہارا اتفاقِ باہمی دیوارِ آہن تھا! — مخالف ایک کا جو تھا، وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمہاری ہمتوں کا عرشِ اعظم پر نشیمن تھا — تمہارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم و ہر فن تھا
تم اپنی حق پرستی سے دبا لیتے تھے دنیا کو — خدا کے سامنے جھک کر جھکا دیتے تھے اعدا کو
نہ آپس کے جھگڑے تھے، نہ یہ ناحق پرستی تھی — طبیعت پر نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی، نہ ہمت میں یہ پستی تھی — نظر میں منظرِ نورِ حقیقت ساری ہستی تھی
تمہاری وضع دلکش تھی، تمہاری شان عالی تھی — خوش اخلاقی تمہاری مظہرِ شانِ جمالی تھی
نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی — نہ وہ حسنِ عمل باقی، نہ اب وہ حسنِ ظن باقی
نہ وہ ذوقِ ہنرمندی، نہ شوقِ علم و فن باقی — نہ دل میں ہے وہ جوشِ حبِّ یاران وطن باقی
جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی — توقع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی
غضب ہے حبِّ اسلامی سے خالی سب کا سینہ ہے — حسد ہے، ناتواں بینی ہے، بےمہری ہے، کینہ ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے — یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینہ ہے
کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت — جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک مرضِ الفت
میں تم سے کیا کہوں اس وقت دل پر کیا گزرتی ہے — تصور دل میں آتا ہے تو آنکھ اشکوں سے بھرتی ہے
طبیعت بات کرنے کو بھی مشکل سے ٹھہرتی ہے — خلش سینے میں ایسی ہے کہ وہ بےچین کرتی ہے
مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد — وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد
وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو — اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو — خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ — دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ
سخن معقول و موزوں ہو تو سب کا دل بہلتا ہے — کلام خوش کلاماں، رنگِ بامعنی بدلتا ہے
زباں سے نعرۂ مدح و ثنا ہر دم نکلتا ہے — مگر شوقِ عمل ہو واقعی، تب کام چلتا ہے
توجہ گر نہیں دل سے تو پھر تاثیر کیوں کر ہو — کلام دلکش اکبر ہو یا مہدی کا لکچر ہو

ڈارون[1] صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے
اپنی حالت کے مطابق چاہیے طرزِ عمل — اس سے کیا ہوتا ہے دادا قیصر و فغفور تھے
اس تقرب پر نہیں کچھ فخر کا موقع نہیں — پاس گو بیٹھے تھے لیکن ان کے دل سے دور تھے

ہوائے الحاد رنگِ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے — جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے
ہمیں نے در اس ہوا پہ کھولا، کیا اسے چپ جو کوئی بولا — ہمیں ہے خود آب ترددِ اس کا طبیعت اب ہاتھ مل رہی ہے
نہ عاقبت کا کسی کو ڈر ہے نہ عزت و قوم پر نظر ہے — سروں میں سودا سما رہا ہے، دلوں سے غیرت نکل رہی ہے
جو پیشوا خود ہوں رندِ مشرب تو کیا عجب رنگِ حفظِ مذہب — قلوبِ شیطاں کے متبع ہیں، زبان قرآں پہ چل رہی ہے!
کریں جو تبیین باخبر ہیں ہر جا نہیں ہے جو چوں ہیں اسکا چرچا — ہمیں نے سمجھا ہے مہد اس کو اسی میں اب نسل پل رہی ہے
جو قوم ہمسایہ ہے ہماری نہیں ہے اس پر بلا یہ طاری — ہم اپنی مستی میں گر رہے ہیں، وہ ہوش میں ہے سنبھل رہی ہے
ہم اپنی صورت بگاڑتے ہیں، بنا رہی ہے وہ اپنے گھر کو — ہم اپنا نقشہ مٹا رہے ہیں، وہ اپنے سانچے میں ڈھل رہی ہے
زبانِ اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت — وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو گورِ سید پہ جل رہی ہے
خدا کی ساعت میں ہاں کی صدیاں چھپی نہیں ہیں ہماری بدلی — بلائیں آتی ہیں اور آ رہی ہیں کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے

چاہا جو میں نے ان سے طریقِ عمل ہو دخنط — بولے کہ نظمِ ذیل کو ارقام کیجیے!

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے!
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم — تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے
یورپ میں پھریے، پیرس و لندن کو دیکھیے — تحقیقِ ملک کا شغر و شام کیجیے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن — خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے
پیرانِ سلف و فروغ کا گل ہو چکا چراغ — ناحق نہ دل کو تابعِ اوہام کیجیے
رکھیے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف — متروک قیدِ جامۂ احرام کیجیے
الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جائیے — ہر ملت و طریق کا اکرام کیجیے
یہ ہے جہاں میں وسعتِ مشرب سے نیک نام — مجھ کو مرید، ہندوؤں کو رام کیجیے
رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر — دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے
ساماں جمع کیجیے، کوٹھی بنائیے — باصد خلوص دعوتِ حکام کیجیے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے — تزئینِ طاق و سقف و در و بام کیجیے
یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے — موقع ملے تو شغلِ مے و جام کیجیے
چشم و لبِ بتاں سے بھی غافل نہ ہو جیے — تکمیلِ شوق بستر و بادام کیجیے
نظارۂ بتاں سے تر و تازہ رکھیے آنکھ — تفریح پارک میں سحر و شام کیجیے
مذہب کا نام لیجیے، عامل نہ ہو جیے — جو متفق نہ ہو اسے بدنام کیجیے
طرزِ قدیم پر جو نظر آئیں مولوی — پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجیے
زنجیرِ فقہ توڑ دیجیے کہہ کر خلافِ شرع — مضمون لکھیے، دعوئے الہام کیجیے
ممنوع ہے تعددِ ازواج خاص کر — یوں گھوم پھر کے تنقیۂ عام کیجیے
قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور — اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجیے
لڑکے نہ ہوں تو ہو نہیں سکتی چہل پہل — فکریں لیے وظیفہ و انعام کیجیے
تحصیل چندہ کیجیے، لڑکوں کو بھیج کر — سارا علاقۂ ہند کا اب خام کیجیے
بے رونقی سے کاٹیے کیوں اپنی عمر کا — کیوں انتظارِ گردشِ ایام کیجیے
جو چاہیے وہ کیجیے، بس یہ ضرور ہے — ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجیے
لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے — مردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی — ہر دل ہے، ہر گروہ سے، ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ — یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب — گورنمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے
اسے کیوں ہوئی اس قدر کامیابی — کہ ہر بزم میں بس یہی داستاں ہے
کبھی لاٹ صاحب ہیں مہمان اس کے — کبھی لاٹ صاحب کا وہ میہماں ہے
نہیں ہے ہمارے برابر وہ ہرگز — دیا ہم نے ہر صیغے کا امتحاں ہے
وہ انگریزی سے کچھ بھی واقف نہیں ہے — یہاں جتنی انگلش ہے سب بر زباں ہے
کہا ہنس کے اکبر نے اے بابو صاحب — سنو مجھ سے جو رمز اس میں نہاں ہے
نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت — تم انگریزی داں ہو، وہ انگریز داں ہے

طبع[1] سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے! — زلف[2] خوش ہے کہ یہ پھانسی پہ چڑھی جاتی ہے
وہ ہے نافہم، یہ عیار، محل ہے نازک! — اہلِ بینش میں یہ اک نظم پڑھی جاتی ہے

---

[1] حال کی تحقیق و تصنیف علمائے یورپ بالخصوص انسان کے باب میں لائق ملاحظہ ہے جس میں ڈارون کی غلطی پیش کی گئی ہے۔ (مصنف)

[1] قوم [2] چرخ

دارد آں آفتِ جاں حسن و جمالِ عجبے   چشمِ مست عجبے دارد و خالِ عجبے
اُو بتاراجِ دلم مائل و من مائلِ او   اُو بہ فکر عجبے، من بہ خیالِ عجبے

۱۸۷۸ء کے ایک گم شدہ مضمون کے چند اشعار

اک رنگ پہ پھریاں کوئی شے رہ نہیں جاتی   وہ شوکت و شان جم و کے رہ نہیں جاتی
یورپ کی ترقی کا چمکتا ہے ستارہ   توقیرِ عرب عظمتِ کے رہ نہیں جاتی
دلکش نظر آتا ہے بہت مُفطرِ نومبر   تزئینِ رُخِ بہمن و دے رہ نہیں جاتی
گُڈبائی[1] کا گُل مچتا ہے اطرافِ جہاں میں   تسلیم نہیں رہتی ہے، بجے رہ نہیں جاتی
عالم کو لبھاتی ہیں پپیا نو کی صدائیں   بلبل کے ترانوں میں وہ لے رہ نہیں جاتی
آہنگِ طرب کے لیے چھڑتے ہیں نئے ساز   دمسازیٔ احباب کو نے رہ نہیں جاتی
رندوں سے بدل جاتی ہیں ساقی کی نگاہیں   وہ گردشِ پیمانہ، وہ مے رہ نہیں جاتی
ہوتی ہے بہت سخت یہ منزل مگر اکبر   ہمت ہو تو پھر نا شدہ طے رہ نہیں جاتی

یہ قطعہ ۱۹۰۷ء میں حسب فرمائش پنچ لکھا گیا

زمزمہ آج فلک پہ ہے یہی ہر بَرڈ[2] کا   ہے یہی مفہوم روئے ارض پہ ہر وَرڈ[3] کا
زینت ہستی ہے ملکِ اعظم برطانیہ   سکہ بیٹھا ہے دلوں میں حضرتِ اڈورڈ کا

راجہ صاحب سے شیخ جی نے کہا   اب بھروسہ حضور پر نہ رہا
مجھ کو چھوڑا امام باڑے میں   پہنچے خود نیچری اکھاڑے میں
جیب خالی پھرا کیا بندہ   لے گئے غیر اس قدر چندہ
راجہ صاحب نے ہنس کے فرمایا   کیوں مزاج آپ کا ہے گرمایا
بزمِ قومی میں، میں شریک ہوا   جو ہُوا، ہر طرح سے ٹھیک ہُوا
آپ پہ بار صرف ڈاڑھی ہے   یاں ریاست کی فکر گاڑھی ہے
جب حکومت کرے خود اس کا ڈفنس[4]   کیوں نہ ہوں میں شریکِ کانفرنس
مجھ کو ہے شوقِ علم و دانش سے   کیوں میں رُکتا پھر اپنی خواہش سے
نہ ہو تسکین وہ جو یہ توضیح   تو میں کردوں گا دوسری تشریح
مجھ پہ کرتا تھا اعتراض حریف   دل میں آیا مرے یہ شعر لطیف
دفترِ اعتراض سوختہ بہ   دہنِ اُو بہ چندہ دوختہ بہ

سُن رہے تھے سماع مولانا[5]   اسی حالت میں انتقال ہوا
واہ کیا خوش نصیب تھے حضرت   عالمِ وجد میں وصال ہوا

حضرت کی وفات سے ہے ہر اک دل ریش   رکھتے تھے عزیز اُن کو بیگانہ و خویش
کیا کیا صفتیں تھیں جمع ان میں اکبر   حافظ، حاجی، طبیب، عالم، درویش

ہزار و نہ صد و شش از جہاں رفت   بیامد یک ہزار و نہ صد و ہفت

---

[1] GOODBYE [2] BIRD [3] طائر، WORD [4] DEFENCE
[5] مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی۔ ۱۹۰۴ء میں حضرت نے حالتِ وجد میں انتقال فرمایا تھا۔ مولانا محمد حسین الٰہ آبادی۔

ممدوحِ خاص و عام ہیں لالہ نہال چند   در اُن کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند
چندے وصول کرنے کو ہیں پیشوا بہت   سب کرتے ہیں مباحثِ قرآن و وید و ژند
لیکن دُشتیق و سخت جو ہوتا ہے کوئی کام   اس وقت میں جناب ہی ہوتے ہیں دردمند
حکام کے حضور میں کرتے ہیں التماس   قانون سے جو ہوتا ہے کچھ شبۂ گزند
تقریرِ رنٹ بل[1] پہ جو کی، ملک بول اٹھا   ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۱۹۰۷ء آغاز تشریف آوری امیر حبیب اللہ خاں میں کہا گیا

۱۹۰۱ء

خلافِ حق چو حریفاں ز راہ میگردند   ز فیضِ حکمت او رُو براہ میگردند
مُکرّم است بہ ہندوستاں شہِ کامل   بُتاں بہ گردِ حبیب اللہ میگردند

بعلالت ۱۹۰۵ء

موت چل دی میری مشتِ استخواں کو سونگھ کر   چونک اٹھا اکبر غرض، خوابِ گراں سے اونگھ کر
یہ سمجھنا چاہیے خالق نے جو صحت یہ دی   بہرِ استغفار اپنے فضل سے مہلت یہ دی

سید جلال الدین طہرانی ایڈیٹر حبل المتین[2]

تلغراف چو فرستادی ز راہ لطف و مہر   جوش زد از دل، سرود نُطقہا اندوختم
بسکہ شوقِ دعوت و اسپیچ در دل داشتم   محفلے ترتیب دادم، شمعہا افروختم
خادمِ خاص از پے آوردنت رفتہ بہ ریل   نصفِ شب در انتظارت دیدہ بر در دوختم
چوں شنیدم فسخ کردی عزم و رفتی بید ریغ   شمع را خاموش کردم، خود سراپا سوختم

تھا باعثِ الم مرضِ جانگزائے قوم   مدت سے سُن رہے تھے علی گڑھ میں ہائے قوم
آخر ادھر نے کالج طبی بنا لیا   شکرِ خدا کہ ہو گئی پیدا دوائے قوم

ملال کا تو محل اے حضور، کچھ بھی نہیں   خدا گواہ ہے میرا قصور، کچھ بھی نہیں
برائے لطف و کرم لائیے یہاں تشریف   الٰہ آباد علی گڑھ سے دُور کچھ بھی نہیں
محبت آپ کی ہے میرے دل میں مستحکم   میں صاف لکھتا ہوں، یہ مکر و زور کچھ بھی نہیں
وہ امر آپ کی جانب سے میں نہ سمجھا تھا   یہ چاہیے کہ کہ تجھ کو شعور کچھ بھی نہیں

بعد پنشن کے تصنع سے مجھے ساز نہیں   ہوں جو بے شغل تو اکبر یہ کوئی راز نہیں
گو اب آزاد ہوں لیکن مری صحت ہے خراب   پر کھلے ہیں مگر اب طاقتِ پرواز نہیں

ڈلہوزیشن کی سر سبزی جو دیکھی اس نے شملے میں   برہمن نے کہا یہ شاخ بید اور ایسے گملے میں
کہا مہدی نے، بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے   تمہارے واسطے یہ کیا محلِ رشک و غیرت ہے
تعجب کیا ہے ہم اس بت کے پہلو میں جو لیٹے ہیں   حرم کے محترم کیا دیر کے خادم سے بیٹھے ہیں
برہمن نے کہا، بس آپ کی باتیں ہی باتیں ہیں   ابھی یہ وصل کی راتیں نہیں ہیں اُن کی گھاتیں ہیں
کہا مہدی نے، ہم کو تو مزے سے اپنے مطلب ہے   محبت ہو نہ ہو اُن کو، امید اس کی یہاں کب ہے
برہمن نے کہا، ایسا مزا اعضا کا مُضعِف ہے   کہا مہدی نے ہاں اس بات سے بندہ بھی واقف ہے

---

[1] RENT BILL [2] سید جلال الدین طہرانی ایڈیٹر حبل المتین کے نام دعوت نامہ ہے۔

وفات سر سیّد مرحوم پر

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا   نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ   خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہ قطعہ ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا:

دیکھی جو نمائشِ چکاگو[1]   دل نے کہا دین سے بھاگو
اتنے میں اجل پکاری سر پہ   بس ہو چکا خواب زیست، جاگو

شروع سنہ میں میں آؤں کا وا، تم اپنی ماں کو یہ لکھ چکے ہو[2]
تو دیر پھر کیوں لگا رہے ہو، یہ کیا تامل ہے، کیوں رُکے ہو
مجھی کو سمجھو تم اپنا قبلہ، سرِ ادب کو یہیں کرو خم
دہاں کے چرچلں میں لُطف کیا ہے جسے اٹھانے کو تم سب جھکے ہو

علمِ باری میں یہ تپ موت[3] کی تمہید نہ تھی   ورنہ ظاہر میں تو کچھ زیست کی امید نہ تھی

یہ قطعہ مولوی محمد کریم صاحب تحصیلدار میجا ضلع الٰہ آباد کے نام ۳ دسمبر ۱۹۰۵ء کو لکھا گیا تھا۔

عمدہ مچھلی مسلّم و خام ملی   تحفہ پایا، مراد خوش انجام ملی
ممنونِ کریم کیوں نہ ہوں اے اکبرؔ   وہ دام میں لائے، مجھ کو بے دام ملی

اک دوست ہمارے ہیں، تپ ان کو شدید آئی   جھیلا کیے بیماری، مدت میں شفا پائی
لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے   حالانکہ ابھی قوت پاؤں میں نہیں پاتے
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت   وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ
یہ میری غلط بندش، وہ اُن کی غلط فہمی   میں حد سے بڑا شاعر، وہ حد سے سوا وہمی

دعوت نامہ بنام علّامہ شبلی نعمانی

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی   بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات   کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا   سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

شبلی کا قلم علم کی منزل پہ جما ہے   رفتار پہ آنر[4] کی قدم اس کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزمِ سلف اس کے بیاں سے   روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلما ہے

یہ کیا سبب ہے جو رہ رہ کے جی بھر آتا ہے   یہ کیا ہوا جو مجھے شہر کاٹے کھاتا ہے
یہ خون ہو گئی کیوں میرے دل کی رنگینی   یہ داغ دینے لگی کیوں چمن کی گل چینی
اداس ہو گئی کیوں روح خانۂ تن سے
اُچاٹ ہو گئیں کیوں بلبلیں یہ گلشن سے

بحمد اللہ کہ حاصل آپ کو ہر ایک نعمت ہے   ذہانت ہے، سعادت ہے، شرافت ہے، لیاقت ہے
علومِ مغربی میں نمبر اوّل آپ کا آیا   عزیز و دوست جو ہیں سب کو اس سے اک مسرت ہے
گورنمنٹ آپ کی مداح ہے اس قابلیت پر   اکابر قوم کے خوش ہیں، ہر اک کو فخر و عزت ہے
پئے تکمیلِ دانش قصد ہے اب ملکِ مغرب کا   مبارک ہو کہ لندن کا سفر ہے، وقت رخصت ہے
مبارک آپ کے احباب کو یہ جلسۂ رخصت   حقیقت میں مبارک وقت ہے اور عمدہ ساعت ہے
بخیر و کامیابی آپ واپس آئیں لندن سے   یہی سب کی دُعا اس دم بصد جوشِ طبیعت ہے
زباں پر سب کے جاری ہے یہ شعرِ حضرت اکبرؔ   کہ جن کی نظم پر نظمِ ثریا کو بھی حسرت ہے
عطا کر قسمتِ تصنیفِ سعدی یا رب اس گل کو   پھلے پھولے زمانہ میں گلستاں بوستاں ہو کر

گو دلِ بیتاب اُمیدِ وطن پر شاد ہے   ستاں بین فرقتِ منشی جگن پرشاد ہے

یہ قطعہ ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا۔

خوش پھر رہی ہے خلقِ خدا، صبحِ عید ہے   ہر سمت زیب و زینتِ دنیا کی دید ہے
ہے جشنِ تاج پوشیٔ قیصر بھی آج ہی   یہ اتفاق باعثِ لُطفِ مزید ہے
بازار دہر پُر ہے متاعِ سرور سے   با منفعت فروخت ہے، دلکش خرید ہے
گُشتہ ہے کوئی طرزِ مسِ خوش خرام کا   کوئی نگاہِ نازِ بُتاں کا شہید ہے
صوفی کی انجمن میں بھی شاہی کا ہے سماں   لُطفِ نوائے مُطرب و نذرِ مُرید ہے
مست اپنے رنگ میں ہیں نئی روشنی کے دوست   اظہارِ جوشِ طبع بہ طرزِ جدید ہے
ڈالی کسی نے بھیجی ہے حُکام کے حضور   بیتاب دل میں شوقِ صدورِ رسید ہے
جن نے سبوے دل میں ہے کچھ مایۂ نشاط   اس سے شرابِ طولِ امل کی کشید ہے
مجھ کو خموش دیکھ کے پوچھا یہ چرخ نے   تو بھی اس آب و رنگ سے کچھ مستفید ہے
میں نے کہا کہ حالتِ عشاق ہے کچھ اور   پروا نہ ہو وفا کی، یہ ان سے بعید ہے
پیشِ نظر ہمارے ہے شامِ شبِ فراق   اس کی جو ہو سحر، تو ہماری بھی عید ہے

لندن کو چھوڑ لڑکے[3] اب ہند کی خبر لے   مٹتی رہیں گی باتیں، آباد گھر تو کر لے
رہ اپنی اب بدل دے، اب پاس کر کے چل دے   اپنے وطن کا رُخ کر اور رخصتِ سفر لے
انگلش کی کر کے کاپی، دنیا کی راہ ناپی   دینی طریق میں بھی اپنے قدم کو دھر لے
نیچر پکارتا ہے، بیٹے اصل نسل تیری   کہتی ہے ہسٹری بھی، بس جا اور اپنا گھر لے
واپس نہیں جو آتا کیا منتظر ہے اس کا   ماں خستہ حال ہو لے، بیچارہ باپ مر لے
مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ   پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر لے
میں بھی ہوں اک سخنور آسُن کلامِ اکبرؔ   ان موتیوں سے آ کر دامن کو اپنے بھر لے

کانفرنس حباب سے پُر ہے   جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یاد اُستاد کا گُر ہے   دلکش ہر اسپیچ کا سُر ہے

قومی ترقی کی رادھا پیاری   بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری   چندے کی تحصیل ہے جاری

---

۱ CHICAGO   ۲ سیّد عشرت حسین سے خطاب ہے۔
۳ ۱۹۰۵ء میں مصنف کو باری سے تپ آئی تھی   ۴ HONOUR

۱ یہ قطعہ ڈاکٹر سلیمان جونپوری، بیرسٹرایٹ لا کے متعلق ہے جو آخر میں سر سلیمان تھے۔
۲ آگرہ سے تبدیلی کے وقت۔ ۳ عشرت حسین سے خطاب ہے۔

قوم پہ غالب کورٹ کے شملے
شملے ٹھہرے پارک کے گملے
پھر یہ چندہ کیوں کر دم لے
کتنا ہی دے کوئی پھر بھی کم ہے

لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی
خوب کھِلی ہے برج میں ہولی
رنگ میں ڈوبی ہے سب کی چولی
سب نے زباں اس گیت پہ کھولی

شیخ کو الفت ہو گئی مِس کی
خوب پیے اب شوق سے وہسکی
اگلی دنیا دھر سے کھسکی!
بیٹھا کون ہے، شرم ہے کس کی؟

جمع ہیں ممبر بھولے بھالے
جاڑوں کا موسم بھورے پیالے
آنکھیں پھاڑے، دانت نکالے
چندہ دے کر پھنسنے والے

بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں
بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں
کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

مدعیانِ رونقِ دیں ہیں
لیکن باہم برسرِ کیں ہیں
واقف فن و ہنر سے نہیں ہیں
کم ہیں ان میں جو [illegible] ہیں

ہر دم قوم کا رونا کیا ہے
ان باتوں سے ہونا کیا ہے
مفت میں روپیہ کھونا کیا ہے
شور زمیں میں بونا کیا ہے

دیکھ کے اک ضابطہ بھپکی
دنیا آپ کی جانب لپکی
آپ نے سب کی دولت ہپ کی
بزم جما لی خالی گپ کی

یہ وادی ہے طور سے خالی
یہ محفل ہے نور سے خالی
یہ جنت ہے حور سے خالی
پاس سے خالی، دور سے خالی

دیکھتا ہے اک عمر سے بندا
بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا
لاؤ چندہ، لاؤ چندہ

سید کا جو عہدِ مشن تھا
اس سکے کا ٹھیک چلن تھا
حسبِ ضرورت طرزِ سخن تھا
وقت وہ اور تھا، اور ہی سن تھا

بگڑا دیکھا بیٹا بھتیجا
ایک کا چہلم ایک کا تیجا
دل کہتا ہے بات کو پی جا
ساکت ہو دکھلا کے نتیجا

بھائیوں پر منہ آئے جانا
گائے گیت کو گائے جانا
اگلا قصہ سنائے جانا
اترا ڈھول بجائے جانا

۱؎ میں نے قصداً اصل تلفظ سے رجوع کیا ہے۔

بیٹھے روتے ہیں جن کے لڑکے
دوڑتے ہیں بنگلوں پر تڑکے
دل میں یہی رہتے ہیں دھڑکے
مار نہ بیٹھے کوئی بگڑ کے

کیوں رنگِ حق پوشش میں آؤ
سنیت پکڑو، جوشش میں آؤ
مذہب کے آغوشش میں آؤ
غافل بندو، ہوشش میں آؤ

ایک انگریز نے بات یہ کہہ دی
جس نے ترقی وہ دی، یہ دی
اس بازی کی ہمیں نے شہ دی
کیسے سید، کیسے مہدی

گرمیوں میں بچوں کو تھکانا
شہروں شہروں بھیک منگانا
اور اس پر یہ بات بنانا
مفلس لڑکوں کا ہوگا ٹھکانا

آپ کہیں معیوب نہیں ہے
ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے
ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے

اس سے بگڑتی ہے قومی حالت
جاتی رہتی ہے شرم کی خصلت
کہتے ہو، ہوگی جو یہ جمعیت
ہوگا میل، بڑھے گی الفت

تڑپو گے جتنا جال کے اندر
جال گھٹے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر
غور کرو اس حال کے اندر

کام بہت ہیں لوکل[۱] و ذاتی
ان کی فکر تو کی نہیں جاتی
مفت میں بچوں کو کرکے براتی
قوم کی گاتے ہیں بھائی وفاتی

کینہ ہم کو ہے، نہ حسد ہے
دل میں ضد ہے، نہ کوئی کد ہے
لیکن یہ ارشادِ خرد ہے
بھائی ہر شے کی اک حد ہے

آزادی کی پی کے برانڈی
آپ چلاتے ہیں ڈنڈا بانڈی
گاتا ہے قومی کشتی کا ڈانڈی
مکتب گرم ہے، سرد ہے ہانڈی

بزمِ عزا میں کیوں نہ ہو شرکت
جس سے ہو دل میں پیدا عبرت
صوفیوں کی کیوں ڈھونڈیں نہ صحبت
قلب کو جس سے پہنچے فرحت

یہ بے معنی مجلس کیسی
یہ ناحق کی گھِس گھِس کیسی
یہ بے حکم کی آفس[۲] کیسی
بات یہ سٹرم پوئیس کیسی

ہوگیا عقل میں کون اضافہ
خوشبو پھیلی، نہ دیکھا نافہ
دیکھ لیا یاروں کا قیافہ
پایا بس خوش رنگ لفافہ

۱؎ LOCAL، مقامی ۲؎ OFFICE

قوم سے اُس کی گاڑھی کمائی   آپ نے نقرہ دے کے اُڑائی
اور وہ یوں بے سُود گنوائی   شاہ لندن، تیری دُھائی

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے   قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے پھیلاؤ تیشے   تاکہ کٹیں اِفلاس کے بیشے

تم ہو فکرِ جاہ میں اُلجھے   شہرت و شان کی چاہ میں اُلجھے
ناقصوں کی واہ میں اُلجھے   دل کیوں کر اللہ میں اُلجھے

خالق کی توحید سکھاؤ   تحقیقی کی تمہید سکھاؤ
مُلحد کی تردید سکھاؤ   روحانی امید سکھاؤ

مذہب کی تعلیم زبانی   طوطا مینا کی ہے کہانی
مُلّا جو خود نہ ہو حقانی   پھر تو مکتب ہے شیطانی

جب ہوں گرو جی خود البیلے   خوب رچائیں میلے ٹھیلے
راہ پر آئیں کیوں کر چیلے   مندر میں کیوں جائیں اکیلے

اگرا خود جب حق سے ہو غافل   دنیا ہی دنیا دل میں ہو داخل
ساتھی کیوں نہ چلیں رہِ باطل   کیوں کر دین ہو اُن کو حاصل

جس نے خیمہ یہاں پر گاڑا   اس کو مبارک ہو یہ اکھاڑا
لیکن قوم کو کیوں ہے پچھاڑا   اس نغمے پر گلا کیوں پھاڑا

عشرتی[1] گھر کی محبت کا مزا بھول گئے   کھا کے لندن کی ہوا، عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی   کیک کو چکھ کے سوّیوں کا مزا بھول گئے
بھولے ماں باپ کو، اغیار کے چرچوں میں وہاں   سایۂ کفر پڑا، نورِ خدا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی   چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا تم نے   خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے
بُخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو   کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں   اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا، بھول گئے
کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو   جب کہ بُوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

بنام منشی نثار حسین صاحب مہتمم پیامِ یار لکھنؤ

نامہ کوئی، نہ یار کا پیغام بھیجیے   اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسے ضرور ہوں کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں   پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجیے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس   سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں   تعمیل ہو گی پہلے مگر دام بھیجیے

مرثیہ کنور عبدالعزیز

دھرم پور آج کیوں اس درجہ وقفِ حسرت و غم ہے   یہ کیا باعث کہ برپا ہر طرف اِک شورِ ماتم ہے
الٰہی کیا قیامت آ گئی ہے، کیا یہ عالم ہے   کہ جس کو دیکھیے مغموم ہے، با چشمِ پُرنم ہے
یہ ماتم ہو رہا ہے کس کی مرگِ ناگہانی پر   گری برقِ اجل بے وقت کس کی نوجوانی پر
کنور عبدالعزیز، اِک نوجواں ماں باپ کا پیارا   گُلِ باغِ ریاست، اور ہر اِک کی آنکھ کا تارا
اسے دورِ فلک نے ناگہاں تیرِ اجل مارا   کسی کا بس نہیں، اللہ کی مرضی میں کیا چارا
تلاطم ہے ریاست میں، عزیزوں کا جگر خوں ہے   ہوا خواہوں کو صدمہ ہے، دلِ احباب محزوں ہے
تماشے دیکھتے ہیں آپ اس دنیائے فانی کے   ابھی ہے بات کل کی، غلغلے تھے شادمانی کے
اُمنگیں تھیں، مزے تھے، ولولے تھے نوجوانی کے   عیاں تھے ہر طرف اسباب عیش و کامرانی کے
ابھی یہ دیکھیے آہ و بُکا ہے، شور و شیون ہے   جنازہ اٹھ رہا ہے، اہتمامِ گور و مدفن ہے
رہو خاموش اکبر شور و فریاد و فغاں تا کے   یہ آہِ آتشیں، یہ قصۂ سوزِ نہاں تا کے
سمجھ لو خود تمہیں کب تک یہ غم کی داستاں تا کے   اگر سارا جہاں بھی ہو تو پھر سارا جہاں تا کے
اگر تاریخِ رحلت تم کو لکھنی ہے صفائی سے   رہو ساکت بِلا دو صبر کو داغِ جدائی سے

۲۹۲   ۱۰۲۳   ۱۳۱۵ھ

قصیدہ مبارک بادِ جشنِ جوبلی ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند

حسبِ ایماء مسٹر ہاول صاحب جج ۱۸۷۷ء

زمانے میں خوشی کا دور ہے، عشرت کا ساماں ہے   برنگِ گُل، ہر اِک باغِ جہاں میں آج خنداں ہے
کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کی دھوم ہے ہر سُو   اِدھر ہے نغمۂ عشرت، اُدھر نورِ چراغاں ہے
جدھر دیکھو کھلی پڑتی ہیں کلیاں صحنِ گلشن میں   بھرا جوشِ مسرت سے ہر اِک مرغِ خوش الحاں ہے
بسانِ بوئے گُل ہر اِک ہے باہر اپنے جامے سے   نسیمِ گلشنِ عیش و مسرت عطر افشاں ہے
چمک کر ہو گیا زیرِ فلک رشکِ قمر ہر گھر   یہی شب ہے کہ جس کا نور رشکِ مہرِ تاباں ہے
فروغ اپنا جو دکھلاتی ہیں آتش بازیاں ہر سُو   کواکب منفعل ہیں، دیدۂ افلاک حیراں ہے
کہیں ہے رقص کی محفل، کہیں ہے جلسۂ دعوت   کہیں تصویر کھنچتی ہے، کہیں سرو چراغاں ہے
کہیں خیرات خانے جاری ہوتے ہیں، کہیں مکتب   کہیں تقسیم کپڑوں کی پئے فصلِ زمستاں ہے
اثر جوشِ مسرت کا ہے ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر   کوئی فرماں روا ہے یا کوئی کم مایہ دہقاں ہے
کوئی ہے محوِ آسائش، کوئی مصروفِ آرائش   شگفتہ مثلِ گُل چہرہ ہے، دل شاداں و نازاں ہے
تعجب کیا اگر ایسی خوشی ہے اہلِ عالم کو   یہ حیرت کیا جو قیصر کا ہر اِک دل سے ثنا خواں ہے
سریر آرائی پنجاہ سالہ خیر و خوبی سے   محقق لطفِ باری ہے، مقامِ شکرِ یزداں ہے
یہی ہندوستاں سب کہتے ہیں جنت نشاں جس کو   کوئن وکٹوریہ کے عہد میں رشکِ گلستاں ہے
رئیس امن و اماں سے ناظرِ حالِ ریاست ہیں   ہری کھیتی زمینداروں کی ہے، ہر سبز دہقاں ہے
کمی بدلی کرے گر قطرہ افشانی میں کیا پروا   کہ فیضِ نہر امانِ زمیں پر گوہر افشاں ہے
نظر سلطان کی ہے خاص تعلیمِ رعایا پر   اشاعت علم کی یہ ہے کہ سب کی عقل حیراں ہے
ہزاروں مدرسے قائم ہوئے ہیں، سینکڑوں کالج   جہاں فکرِ ارسطو بھی بس اِک طفلِ دبستاں ہے
جہاں چلتا نہ تھا کچھ زور، واں اب ریل چلتی ہے   میسر خاکساروں کو بھی اب تختِ سلیماں ہے
نہ کچھ کھٹکا ہے چوروں کا، نہ قزاقوں کی ہے دہشت   رواں بے زحمت و خوف و خطر ہر سمت انساں ہے
تجارت کی بھی ایسی ہو رہی ہے گرم بازاری   کہ سامانِ معیشت جنسِ دل سے بھی اب ارزاں ہے

---

[1] سید عشرت حسین

طلسمِ تازہ دیکھا کارخانہ تار برقی کا   زبانِ تار پر وہ بات ہے جو دل میں پنہاں ہے
شبِ تیرہ میں بھی وہ نور ہے اقبالِ قیصر کا   کہ ہر ذرہ نگاہِ دُردیں مہرِ درخشاں ہے
رعایا کے حقوق اب ہر طرح محفوظ رہتے ہیں   اِدھر قانون حامی ہے، اُدھر حاکم نگہباں ہے
محبت بڑھ رہی ہے فاتح و مفتوح میں باہم   گرہ جو دل میں تھی، وہ اب مثالِ دُرِّ غلطاں ہے
پریس کو بھی ہے عہد امپرس میں کامل آزادی   زبانِ خامۂ مضموں نگاراں سیفِ بُرّاں ہے
توجہ ہے مفیدِ عام کاموں کی طرف سب کی   کوئی ہے علم کا طالب، ہنر کا کوئی خواہاں ہے
شفا خانوں نے ثابت کر دیا ہے اس مقولے کو   پئے ہر رنج راحت ہے، پئے ہر درد درماں ہے
خلوص و صدق دل سے ہے دعا ہندو مسلماں کی   کہ یا رب جب تلک یہ گردشِ گردونِ گرداں ہے
فروغِ مہر و مہ سے جب تلک ہے زینتِ عالم   نشاط انگیز جب تک انتظامِ باد و باراں ہے
دلِ اہلِ جہاں ہے جب تلک مرکز تمنّا کا   ہوائے آرزو جب تک محیطِ قلبِ انساں ہے
خدا کے نام کی عزت ہے جب تک اہلِ دانش میں   تجلّی علم کی جب تک چراغِ راہِ عرفاں ہے
ہماری حضرتِ قیصر رہیں اقبال و صحت سے   کہ جن کا آفتابِ عدل اس کشور پہ تاباں ہے

خدا، اے عشرتی[1] تم کو ہمیشہ شادماں رکھے   خلائق سے تمہیں خوش، ان کو تم پر مہرباں رکھے
کرے مملو تمہاری طبع کو نقشِ خیالی سے   تمہارے دفترِ دل کو گلستاں بوستاں رکھے

ہند میں میں ہوں مرا نورِ نظر[2] لندن میں ہے   سینہ پُر غم ہے یہاں، لختِ جگر لندن میں ہے
دفترِ تدبیر کھولا گیا ہے ہند میں   فیصلہ قسمت کا اے اکبرؔ مگر لندن میں ہے

آں نونہالِ خوبی ماہ دو ہفتہ من   در نو بہارِ عمرش رفت از فنائے ہستی
پیمانۂ مئے غم سرشار دیدہ گشتم کرد   رفتم سرِ مزارش در بیخودی و مستی
آہے زدل کشیدم، گفتم کہ اے مہِ من   با ایں کمال و رفعت، حیف است میلِ پستی
آخر چہ پیشت آمد اے شمعِ محفلِ من   در گوشۂ نشستی وز انجمن گسستی
آخر چہ شد کہ رفتی اے رونقِ گلستاں   در موسمِ بہاراں، رنگِ چمن شکستی
اے برق وش چہ داری نسبت بگورِ تیرہ   اے شعلہ رُو بخاکِ تربت چرا نشستی
اے خوش نگاہ، وا کن چشمانِ سحر آگیں   چیزے بگو بہ عاشق بہا چرا بہ بستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوشِ جانم   کاے بیخبر ز ایماں، اے محوِ بت پرستی
آنرا کہ شعلہ خوانی و آنرا کہ برق دانی   آں جملہ بود رنگِ نقشِ طلسمِ ہستی
آں رنگہا پرید و بویش بماند رازے   رازے کہ کس نداند در بندِ خود پرستی
عبرت کشود چشم حیرت بہ ہوشم آورد   در سینہ دفن کردم جوش و خروشِ ہستی
تاریخِ فوت گفتم در صنعتِ عجیبے   بوٹا بروں شد اکبرؔ از گردِ باغِ ہستی

۴۰۹   ۱۲۰۲ / ۲۰۹   ۱۲۹۳ھ

بیکار جسم ہے مضمحل گردہ ہے   جس دوست کو دیکھیے، وہ افسردہ ہے
گو نبضِ زباں سے زندگی ہے ظاہر   دل کو جو ٹٹولیے تو وہ مردہ ہے

بہتر یہی ہے کہ اب علیگڑھ چلیے   رُکیے نہ کسی کے واسطے، بڑھ چلیے
جس فن کا ہو درس، ہو جیے اس میں شریک   جو پیش آئے سبق، اُسے پڑھ چلیے

---

[1] بہ تخفیف یا   [2] سید عشرت حسین

مہدی سا بزرگ صاحبِ جاہ تو ہے   سنجیدہ کلام کے لیے واہ تو ہے
منزل کا اگر پتا نہیں ہے، نہ سہی   دلکش روشیں ہیں، دلکشا راہ تو ہے
(مندرجہ بالا اشعار ایک لمبی تمہید و تحسین کے ساتھ ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھاپے گئے تھے)

مولانا سے گڑوی

پھرے اک مولوی صاحب جو کل دربارِ دہلی سے   یہ پوچھا میں نے، کچھ لائے بھی تم سرکارِ دہلی سے
وہ بولے ہنس کے اے اکبرؔ کہوں کیا تجھ سے حال اپنا   اسی مطلع سے بس کرتا ہوں اظہارِ خیال اپنا
اُدھر سرخی مئے گلگوں کی تھی، انڈے کی زردی تھی   ادھر ریشِ سپید اپنی تھی اور شدت سے سردی تھی

مولانا[1] محوِ عشقِ یزدانی تھے   بے شک اس عہد میں وہ لاثانی تھے
بھولیں نہ کبھی انھیں محبانِ رسولؐ   یعنی رجبی شریف کے بانی تھے
(یہ قطعہ آگرہ میں لکھا گیا تھا)

ڈپٹی صاحب جو یہ ہیں زینتِ عُبّادِ جہاں   پختہ وضعی کے ہیں انداز دکھانے والے
لکّو پتّو سے الگ اور زوائد سے بری   بس مصلّے ہی پہ ہیں چھاؤنی چھانے والے
ساز پہ ہاتھ پڑا اور ہوئے رخصت آپ   رہ گئے کھول کے مُنہ، بین بجانے والے
انسپکٹر ہیں جو یہ خان بہادر صاحب   رُعبِ حاکم، دلِ دنیا پہ بٹھانے والے
بزم کے جلسوں میں بھی تہذیب کی تصویر ہیں آپ   اگلے اسلام کی ہیں یاد دلانے والے
دوستوں کے لیے بازو کا ہیں تعویذ جناب   رہزنوں کو ہیں یہ سُولی پہ چڑھانے والے
شان اللہ کی ہیں برکت[2] و اسرار[3] و مجید[4]   ان کے اخلاق کے قائل ہیں زمانے والے
فیض اُن کا سببِ رونقِ عیشِ احباب   تاجِ زریں سرِ عشرت[5] پہ اُڑھانے والے

متفرقات

ترے پرتو سے اے جانِ جہاں ظلمت میں نور آیا   ترے فیضِ تجلّی سے یہ ذرّوں میں شعور آیا

لطافت کو نہ چھوڑے رنگ تیری شادی و غم کا   ہنسی آئے تو پھولوں کی، جو رونا ہو تو شبنم کا

ترا چہرہ ہے منظرِ چشمِ شوقِ نورِ عرفاں کا   ترا عشوہ ہے مصدر جلوہ ہائے فیضِ یزداں کا

شباب عمر نے کھویا، طمع نے دین لیا   فلک نے ہم سے بڑی نعمتوں کو چھین لیا

ہوائے دشت بھی ہے عنبر افشاں، عروج بھی ہے مہِ مبیں کا   نثار ہونے کی دو اجازت، محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

تا چند پُرسی اے خرد ایں از کجا و ایں از کجا   تو از کجائی ایں بگو تا گو یمت ایں از کجا

مزے سے زندگی کٹتی جو دل قابو میں آ جاتا   مگر ایسا تو جب ہوتا کہ وہ پہلو میں آ جاتا

---

[1] حضرت مولانا شاہ محمد حسین صاحب۔ [2] مولوی برکت اللہ صاحب رئیس غازی پور۔
[3] سر اسرار حسن خاں صاحب مدار المہام ریاست بھوپال [4] خان بہادر عبدالمجید خاں صاحب مرحوم
[5] سید عشرت حسین [6] دے نام ماہ فارسی

مرتبہ اس سے بھی دنیا میں سوا ہو آپ کا — یاد رکھیے گا کہ میں بھی ہوں دعا گو آپ کا

* * *

نہ ہو یادِ خدا تو نورِ باطن ہو نہیں سکتا — نہ ہو طالع اگر خورشید تو دن ہو نہیں سکتا

* * *

بنگالی ہاتھ میں قلم لے تو کیا — مسلم جو شالِ بزمِ جم لے تو کیا
ہندی کی نجات ہے نہایت مشکل — سو مرتبہ مر کے وہ جنم لے تو کیا

* * *

نہیں ہے رحم قاتل میں، یہی ہوتا تو پھر کیا تھا — کہاں ہے صبر یاں دل میں، یہی ہوتا تو پھر کیا تھا

* * *

ہجومِ بلبل ہوا چمن میں، کیا جو گل نے جمال پیدا — کمی نہیں قدرداں کی اکبر، کرے تو کوئی کمال پیدا

آپ کا برتاؤ موسم کے موافق تھا حضور — واقعی اس کے اثر سے دل بخوبی پک گیا

* * *

کدھر ہے رنگِ مخالفت اب زمانہ بالاتفاق بدلا — خود اپنے نورِ نظر کو دیکھو، نگاہ بدلی، مذاق بدلا

* * *

تری ترچھی نظر سے ہم کو ڈر کیا — محبت کی تو پھر دل کیا، جگر کیا

* * *

اک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا — باقی جو ہے، وہ تار ہے اک عنکبوت کا
باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں — مجھ کو پری کا شبہ ہوا ان کو بھوت کا

* * *

ہنگامِ نزع، ہوش جو غائب ہوئے تو کیا — اس وقت وہ غرور سے تائب ہوئے تو کیا

* * *

مناسب ہے یہی دل پر جو کچھ گذرے اسے سہنا — نہ کچھ قصہ، نہ کچھ جھگڑا، نہ کچھ سننا، نہ کچھ کہنا

* * *

تماشا دیکھ اکبر دیدۂ عبرت سے دنیا کا — اجل کی نیند جب آئے لحد میں جا کے سو رہنا

* * *

بت نہ کہتے ہوں جسے ہے یہ ہمارا بندا — ہے بھی ایسا کوئی اللہ کا پیارا بندا

* * *

انہیں غمزوں میں آساں ہے معانی کا ادا کرنا — مجھے لفظوں میں مشکل ہے بیانِ مدعا کرنا

* * *

عشوہ و ناز و ادا سے مسکرانا آ گیا — چشمِ بد دور، آپ کو بجلی گرانا آ گیا

* * *

سراسر جلوۂ حسنِ مستانۂ زلفِ لیلیٰ تھا — محلِ رشک اس بازار میں مجنوں کا سودا تھا

* * *

سمجھے تھے لوگ جس کو ہمارا، انہیں کا تھا — کچھ غُل مچا، تو یہ بھی اشارا انہیں کا تھا
اب سانس بھی نہ لیں گے دبائیں گلا وہ کیوں — ہم کو تو زندگی میں سہارا انہیں کا تھا
اٹھنے دیا نہ کیوں مرے ذراتِ خاک کو — اے چرخ، اوج پہ تو ستارا انہیں کا تھا
آزادیوں کے شوق میں ابھرا تھا دل اگر — اس کی خطا نہ تھی، وہ ابھارا انہیں کا تھا

* * *

خضر سمجھے ہو جسے، غولِ بیابانی ہے — غلط امید کے جنگل میں تھکا مارے گا
جاں ستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی — دل ستانی کے لئے لافِ وفا مارے گا

* * *

کفر ہے معنی میں تیرے، لفظ ہے اسلام کا — نفس نے اک حیلہ پایا ہے خدا کے نام کا

* * *

کہتے ہیں مغلوب ہے اکبر خیالِ حور سے — کہہ دو یہ بہتر ہے جھوٹے بسکٹوں کے چور سے

* * *

راہِ وحشت سے اگر قیس سے لغزش ہو جائے — حیف لیلیٰ پہ جو آمادۂ کاوش ہو جائے

* * *

وہ دست درازیوں سے کب ہیں تائب — ہے حافظِ دیں یہ شمعِ فکرِ صائب

* * *

رخصت ہو جو علمِ دیں تو پھر دیں بھی جائے — گل ہو جو چراغ، ابھی ہو کوٹھڑی غائب

* * *

عفو کن یارب اگر تقویٰ نہ ماند برقرار — دل بہ پہلو ہست و کارم با شباب افتادہ است

* * *

چراغِ دیر بھی دلکش، حرم کی شمع بھی درست — اسی سے چشمِ بصیرت نے کہہ دیا، ہمہ اوست

* * *

ہیں توسنِ دماغ میں مرے سہم بہت — سنیے یہ خیال جس میں ہے وہم بہت
قومی مجلس میں اب سخن فہم ہیں کم — دربار میں گو کہ ہیں گزٹ فہم بہت

* * *

دیکھ کاری گریِ حضرتِ سید اے شیخ — دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح
بحرِ ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے — برف کی طرح جمے، بہہ گئے پانی کی طرح

* * *

بھروسہ ان پہ کر کے مجھ کو پچھتانا پڑا آخر — بڑا دعویٰ کیا تھا میں نے، شرمانا پڑا آخر

* * *

ولولے اٹھتے ہیں دل میں، دیکھ کر ان کا جمال — حوصلے ہوتے ہیں پست ان کی نظر کو دیکھ کر

* * *

مقابل کفر کے تھی وہ نمودِ اسلام کی اکبر — مگر اب انقلابِ دہر سے باقی کہاں کافر
نصاریٰ قبلۂ مقصود ہیں، ہندو "برادر" ہیں — زمینِ شعر ہی میں رہ گئی زلفِ بتاں کافر

زن، زمیں، زر تو ہے فساد کا گھر — لیکن اتنا کہوں گا اے اکبر
زنِ منکوحہ و شریف و غریب — کیا عجب ہے کرے جو امن نصیب
ہو جو بس آمدِ زرِ تنخواہ — تو نہیں حاجتِ وکیل و گواہ
ہو جو تھوڑی سی باغ ہی کی زمیں — تو کلکٹر کا ڈر زیادہ نہیں

* * *

شرابِ دولت سے مست ہیں وہ، مئے قناعت سے ہم ہیں سرخوش — نہیں ہے کچھ باہمی تعلق، وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش

* * *

سخن شناس سے میں چاہتا ہوں دادِ سخن — خوشی کے واسطے کافی ہے مجھ کو واہ فقط
سوسائٹی نہیں ملتی کہ جس سے دل بہلے — جو کوئی مونس و ہمدم ہے اب، تو واہ فقط

شرف ہے جبۂ بیرسٹری سے جن کو یہاں   مقدموں ہی کی وہ دیکھتے ہیں راہ فقط
بیاضِ شعر سے مطلب نہیں کلرکوں کو   رجسٹروں ہی کو کرتے ہیں وہ سیاہ فقط

رزق کا محتاج جب دے دے تجھے اللہ پاک   کر عبادت میں بسر اور سر کو رکھ بالائے خاک
پالسی مسلم کی دیکھی اور ہندو کی ترنگ   اُس میں ہے اکثر رکاکت یہ ہے اکثر خوفناک

بیٹھا رہا میں صبح سے اُس در پہ شام تک   افسوس ہے ہوا نہ میسر سلام تک

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپہ شیکسپیئر   پڑھو گے حضرتِ سعدیؒ کی بوستاں کب تک
تمہیں سے اٹھ گیا مردی کی شرم کا پردہ   تو پھر بقائے حجابِ رُخِ زناں کب تک
اس انقلاب کا اب انقلاب ہے دشوار   رہو گے منتظرِ مہرِ آسماں کب تک

نہ نرے اُونٹ ہو نہ ہو بُلڈاگ[1]   نہ تو مٹی ہی ہو، نہ تم ہو آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی   سازِ حکمت کا جوڑ ہے یہ راگ

جس نے دیکھا، ہو گیا عاشق   واہ رے صورت، واہ رے خالق

فیضِ کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق   امتحاں پیشِ نظر اور عاشقی بالائے طاق
وہ چراغوں سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر   کہتے ہیں رکھیے پرانی روشنی بالائے طاق

اپنی زباں میں شمع یہ کہتی ہے رازِ دل   روشن نفس نہیں، نہ ہو جس میں گدازِ دل

کیوں کرنے لگے وہ مجھ گدا سے باتیں   زوروں پہ ہیں، کرتے ہیں ہوا سے باتیں
میں سجدہ میں کہہ رہا ہوں سبحان اللہ   بیلوُن[2] میں وہ کریں خدا سے باتیں

یہی کافی ہے مجھ کو اہلِ ایماں باصفا سمجھیں!   نہیں پروا، منافق بد کہیں، مرتد بُرا سمجھیں!

رقیبوں نے بہت نظمیں پڑھیں اور دُر فشانی کی   میں اشک آنکھوں میں بھر لایا، بلاغت اس کو کہتے ہیں

کوئی کہتا نہیں سیّاح ہوں، فطرت کا ماہر ہوں   یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں، میں ناظر ہوں
میں اپنے نوکروں کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں بنگلے میں   "کوئی ہے" لاکھ کہیے، کون کہتا ہے کہ حاضر ہوں

جو محو ہیں کبر و زینت کے عقبیٰ و خدا سے غافل ہیں   اربابِ بصیرت کے آگے حشرات الارض میں داخل ہیں

ممکن نہیں ہم ان کی کوئی بات ٹال دیں   دیں حکم اگر تو سینہ سے دل کو نکال دیں

طاعتِ حق پر وہ میلانِ دلِ قوم اب کہاں   وہ نمازِ صبحدم خیرٌ من النوم اب کہاں

پتا میرا یہی ہے منزلِ ہستی میں اے اکبرؔ   مُریدِ حضرتِ دل ہوں، مقیمِ خانۂ تن ہوں

بصارت نے کمی کی انحطاطِ عمر میں اکبرؔ   بصیرت ہے تو آنکھیں مجھ سے اب آنکھیں چراتی ہیں

مرے سازِ سخن سے پست فطرت کو تنغص ہے   پیانو ہے بُرا سمجھا گیا بزمِ شغالاں میں

جو بات مناسب ہے، وہ حاصل نہیں کرتے   جو اپنی گرہ میں ہے، اُسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں، غفلت بھی ہے طاری   افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں   اُس کی ہر اک بات کا دیوانہ ہوں
شب میں پیدائش ہوئی ہے پیشِ شمع!   جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

جو حسرتِ دل ہے، وہ نکلنے کی نہیں   جو بات ہے کام کی، وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت کہ دل سنبھالے رہیے   قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

حواس و فہم میں اُلجھے ہوئے ہیں   برات و سہم میں اُلجھے ہوئے ہیں
خدا تک ہے رسائی سخت دشوار   سب اپنے وہم میں اُلجھے ہوئے ہیں

۱۸۷۵ء

دینی پہلو کو اے برادر دیکھو!   کانٹوں سے ہو محترز، گُلِ تر کو دیکھو
نظمِ اکبرؔ ہوئی ہے منقوشِ قلوب   آنکھیں ہوں اگر، خدا کا دفتر دیکھو

قرآن سے واقف ہیں نہ انجیل کے پیرو   با ایں ہمہ، ہے شوقِ ترقی میں تگ و دو

ادبار کے ہیں یہ دن، اولوالعزم نہ ہو   ہونی ہے شکست، مائلِ رزم نہ ہو
رونق محفل کی اب نہیں ہے تجھ سے   گوشے ہی میں بیٹھ، عازمِ بزم نہ ہو

خدا رکھے سلامت اُس نظر کو   کہ جس نے سیم کو چھوڑا نہ زر کو

مرشد نے کہا، لیجیے حضرتِ معنی نہ سہی صورت تو وہ ہو   گھر چھوڑ کے بسیے بنگلے میں طاقت نہ سہی زینت تو وہ ہو
اس نقش کی کر دو خانہ پُری تقدیر یہ ہے گی پھر نہ بُری   راس آئے گی تم کو بادہ خوری مجلس تو وہاں صحبت تو وہ ہو

تصدیق اِدھر بشوق، اُدھر بالارادہ جھوٹ   اس سے زیادہ مکر، نہ اس سے زیادہ جھوٹ
عارض نہ ان کا گُل ہے، نہ دل میرا آئینہ   رنگین جھوٹ وہ ہے اگر یہ ہے سادہ جھوٹ

ہُوا ہوں میں منحنی نہایت، دبا رہا ہے فلک کا غمزہ   عرب تصرف کرے تو شاید الف کی صورت میں آئے ہمزہ

ملکی ترقیوں میں دِوالے نکالیے   پلٹن نہیں تو خیر، رسالے نکالیے
کافی ہے بہرِ شغل، کلیسائے فکرِ رزق   اب دل سے مسجد اور شوالے نکالیے

---

[1] BULLDOG   [2] BALLOON غبارہ

سراسر نورِ تقویٰ سایہ پہ قربان کر آئے
یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مس لائے

فرق کیا واعظ و عاشق میں بتائیں تم سے
اُس کی حجت میں کٹی، اُس کی محبت میں کٹی

یہی فتوائے نیچر ہے کہ ہم بھی ہو رہیں اُن کے
زر اُن کا، زور اُن کا، علم اُن کا، سلطنت اُن کی

ملائیں کس طرح سُر، صدر پر نزلہ ہے مذہب کا
بہت اُونچے سُروں میں تن گئی ہے اب تو گت اُن کی

مگر قومی اطبّا دور ہی کر دیں گے یہ نزلہ
قوی اطفال کو کر دے گی آخر تربیت اُن کی

تھا شوقِ ادائے مطلب اِک حسن کے ساتھ
اکبر نے جو فکر کی تو وہ بات بنی

دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں کے
پکڑی گئی اور غلامِ جنات بنی

جب تک ہم میں ہے قومی خصلت باقی
بے شک پردے کی ہے ضرورت باقی

چالیس برس کی بات ہے یہ شاید
بعد اُس کے رہے گی پھر نہ حجت باقی

زاہد کی طبع دیکھ کے اُس بت کو مچ گئی
وہ کیا، تمام ملک میں اک دھوم مچ گئی

اکبر ہی تھا کہ دین میں دل کو چھپا لیا
وہ بھی کہاں بچا، یہ کہو جان بچ گئی

شیخ و سید سے تو خالی نہیں ذکرِ شاعر
ذات سے اُن کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر

طبعِ مجنوں مری ہے عاشقِ ملت، اے دوست
کیوں روا رکھتا ہے ناحق مری ذلت اے دوست

رہ گئے کم عربی شعر سمجھنے والے
چل بسے گیسوئے لیلیٰ میں اُلجھنے والے

فتوائے کفرِ دنیا، واعظ کی بے حسی ہے
یہ عشقِ بت نہیں ہے، اکبر کی پالسی ہے

یہ بزمِ ساقی عجب جگہ ہے کہ روح بیخود پڑی ہوئی ہے
حواس و منطق کی عقل گم ہے دلیل حیراں کھڑی ہوئی ہے

خبر دل کی مسِ دلخواہ جانے
خبر ایماں کی حُبِّ جاہ جانے

رہی اب عاقبت کی بحث اکبر
سو اُس کا حال تو اللہ جانے

شوقِ شہرت بھی بُرا، زر کی بُری چاہ بھی ہے
نفرت انگیز نظر میں ہوسِ جاہ بھی ہے

ہاں مگر حسنِ بتاں، زُہرہ جبیں، آفتِ دیں
اس سے مجبور تو یہ بندۂ درگاہ بھی ہے

کمالِ شوق میں صرف اِک نظارہ کافی ہے
کہ حسن خود ہی ہے عاقل، اشارہ کافی ہے

حسنِ نورِ شمع ہر محفل میں ہر شب ہے وہی
موسمِ باراں میں لیکن کثرتِ پروانہ ہے

بہ چشمِ غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ اسپیچیں دیا کرتی ہے اور وہ جان دیتا ہے

وہ پھنستی ہے قفس میں اور اس کا نام روشن ہے
ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

حالت پہلی سی اب کہاں میری ہے
حیرت انگیز داستاں میری ہے

سینہ میرا ہے، دل نہیں ہے میرا
میری نہیں بات، گو زباں میری ہے

واعظ کا دل بھی سوزِ محبت سے گرم ہے
چپ رہنے پر نہ جاؤ، یہ دنیا کی شرم ہے

اترائی خود نمائی میں اگر دولت تو کیا اکبر
خدا کو مان کر جو دیں، وہی اہلِ کرم اچھے

فیضِ حضرت بہر نمط ہوتا ہے
دل کو مرے حفظ نہیں فقط ہوتا ہے

ہر امرِ غلط کی ہوتی ہے یاں تصحیح!
اور لطف یہ ہے کہ علم غلط ہوتا ہے

میں نے اکبر سا بھی وہمی نہیں دیکھا کوئی
کہتا ہے ان کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے

مایوس کر رہا ہے نئی روشنی کا رنگ
اُس کا نہ کچھ ادب ہے، نہ کچھ اعتبار ہے

تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ
یعنی نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے

بوڑھے ہوئے، کتاب سے بوس و کنار ہے
اپنے لیے الف ہی بس اب قدِ یار ہے

اپنی جبیں سے چین کے مالک اگر ہو تم
میں بھی ہوں شاہِ روس کہ دل میرا زار ہے

زندگی سے اب طبیعت سیر ہے
موت کیوں آتی نہیں کیا دیر ہے

کون و مکاں ظہورِ جمالِ حضور ہے
غافل اسیرِ دامِ فریبِ شعور ہے

یا امیٹیشن[2] کے صدقے، چاہیے دودھ اور کھانڈ لے
یا ایجی ٹیشن[1] کے بدلے تو چلا جا مانڈ لے

یا قناعت اور طاعت میں بسر کر زندگی
رزق کی کشتی کو کھے، پتوار لے اور ڈانڈ لے

دنیا کی حرص و آز کا واعظ شہید ہے
گو پیر ہو گیا ہے مگر زن مرید ہے

جب تک ہے زندہ، آرزو مند رہے
جب مر گئے ہم تو قبر میں بند رہے

اب حشر میں خلد و نار کا ہے جھگڑا
دیکھیں یہ امید و بیم تا چند رہے

حاصل ہو کچھ معاش، یہ محنت کی بات ہے
لیکن سرورِ قلب، یہ قسمت کی بات ہے

آپس کی واہ واہ، لیاقت کی بات ہے
سرکار کی قبول، یہ حکمت کی بات ہے

وہ مخبرِ رقیب ہے، میں ہوں شہیدِ عشق!
یہ اپنی اپنی ہمت و غیرت کی بات ہے

جاپان و روس سے نہیں کچھ واسطہ ہمیں
خرچے کی یاں تو بحث ہے، تبت کی بات ہے

بی اے بھی پاس ہوں، ملے بی بی بھی دل پسند
محنت کی ہے وہ بات، یہ قسمت کی بات ہے

تہذیبِ مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

بچانا نشۂ طولِ امل سے دل کا مشکل ہے
سرورِ بادۂ امیدِ فردا آ ہی جاتا ہے

[1] مخالفانہ جوش، AGITATION [2] نقل اتارنا، IMITATION

تان اُس بُت نے اُڑائی، ہمیں بلما بھُوے　　ہم تو کیا شیخ بھی توحید کا کلمہ بھُوے
صنمِ ہند کو ہم یاد رہیں، اے اکبرؔ　　غم نہیں ہے جو عرب میں ہمیں سلما بھُوے

جان آچکی ہے لب پر، ہیں منتظر فنا کے　　اب تک ہے واں تغافل، قرباں ہیں اس ادا کے

فغاں کرنے کا بھی یارا نہیں ہے　　سوا افسوس کے چارہ نہیں ہے

ہم نشیں ظلمِ بتاں پر چُپ نہ رہنا چاہیئے　　بات جب کچھ بن نہ آئے شعر کہنا چاہیئے

ہوا بدل گئی ہے ایسی کچھ زمانے کی　　دُعائیں مانگتا ہوں ہوش میں نہ آنے کی

مجنوں کی پیاس کو بجھاتی　　لیلی کچھ باؤلی نہیں تھی

بائیس سال عمر کے متفرق اشعار

طے ہوئی بات، نہ قیمت ابھی اس کی ٹھہری　　دل مرا لے کے چلے آپ، یہ اچھی ٹھہری

مشتاق تو ہستم کہ عزیزی و حبیبی!　　لیکن چہ تواں کرد کہ مہمانِ رقیبی

دستِ فلک سے ہند کی خلقت بہت پِٹی　　جو کچھ تھی اُس کی عظمت و وقعت وہ سب مٹی
اس کی دوا قناعت و نیکی ہے بس فقط　　ہاں مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی

باقی نہیں رہی وہ دنیا سے گرم جوشی　　اب میں ہوں اور عزلت اور عالمِ خموشی
اپنے ہی دل کے ہاتھ اب میں بک گیا ہوں اکبرؔ　　سر میں نہیں رہا وہ سودائے خود فروشی

حسبِ فرمائش عالی جناب خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب مذاق
تعلقہ دار پریاواں ضلع پرتاب گڑھ

کچھ اپنا سوچا نہ کام آیا، وہی ہُوا جو خدا نے چاہا　　عجب ہے تسلیم و صبر کی خُو، اگر نہ پیدا ہو دل میں اب بھی
خدا سے بیگانہ تھی طبیعت، دلی ارادوں پہ تھا بھروسا　　عزیمتیں فسخ ہو گئیں جب عَرَفْتُ رَبِّیْ عَرَفْتُ رَبِّیْ

تاثیرِ ہوائے باغِ ہستی نہ گئی　　صورت کی ادا، نظر کی مستی نہ گئی
ہوتے ہی رہے جمالِ دلکش پیدا　　طبعِ انساں سے بت پرستی نہ گئی

نہ گئی دل سے مرے حُسن پرستی نہ گئی　　بجھ گیا خُون مگر رُوح کی مستی نہ گئی

شاخ میں پھل کا لگا رہنا ہے خامی کی دلیل　　عقل پختہ ہو کے میرے سر سے زائل ہو گئی

ہوئی جو عمر اُن کی مجھ سے بیٹے کہ پندرہ میں ہے ایک باقی　　عجب ہے نیچر کے اقتضا سے جو رکھے نیت کو نیک باقی

موت کو دیکھا تو دنیا سے طبیعت پھر گئی　　اُٹھ گیا دل دہر سے، دولت نظر سے گر گئی

---

[1] عمداً بلما کے ساتھ قافیہ ملایا گیا ہے۔

دنیا سے تعلق رکھنے میں ہرگز نہیں یہ تمہید بُری　　کیا خوب کہا ہے اکبرؔ نے احسان اچھا، امید بُری

فلسفہ حریف کا ہے دیں کا عُدو بنا　　اُس طرف سے کید سخت، اور ترا بے بچنا
صبح و شام صِدق سے کر دعا کہ رَبَّنَا　　لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا

متعلق ٹرکی

متضاد گئے جو دو طرف سے دو تار　　کیا جانیے کس کو اُس نے اچھا سمجھا
لیکن اس بات کا سمجھنا تو ہے سہل　　سرکار نے کس کو اُن میں سچا سمجھا

بدبو مرے گھر میں نہ اے شرابی پھیلا　　ہے تیرا دہن نجاستوں کا تھیلا
ہر لحظہ طلب شراب کی ہے تجھ کو　　ہر دم ترے منہ سے نکلتا ہے اسے لا

مصحف مسلم نے کھولنا چھوڑ دیا　　بنیے نے ٹھیک تولنا چھوڑ دیا
حاکم نے کہا، نہ بولو ان سے ہرگز　　ہم نے بھی سب سے بولنا چھوڑ دیا

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا　　سادہ طبعوں کو بھی بالآخر رنگیلا کر دیا
شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا　　وہ مثل ہے، مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا
تھا بنارس پہلے ہی سے اے صنم رس میں بھرا　　چشمِ مس اینی[1] نے اور اس کو رسیلا کر دیا

مرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی بُرا　　ساتھ ہی اس کے علی گڑھ کا یہ حلوا بھی بُرا
آپ اظہارِ وفا کیجیے تمکین کے ساتھ　　لیٹ جانا بھی بُرا، ناز کا جلوا بھی بُرا

جب اپنے ہاتھ میں لی غیر نے عنانِ سمند　　تو پھر سوار سے اکبرؔ پیادہ پا اچھا

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھُوٹا　　آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لُوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لیے　　ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

یہ قومی ترقی بھی ہے پریوں کا فسانہ　　کانوں سے سُنا سب، مگر آنکھوں سے نہ دیکھا

اٹھانا پڑتا تھا دن رات بارِ اُلفتِ خُوباں　　جوانی کیا تھی، نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

اب ان قصّوں کا کیا حاصل، اب ان باتوں کا کیا رونا　　یہی مرضی خدا کی تھی، یہی قسمت میں تھا ہونا
کہاں کی دولت و ثروت، کہاں کی عزت و حشمت　　میسر ہیں مجھے دو روٹیاں، بس گھر کا اک کونا

ہنگامۂ ترقیٔ قومی کو دیکھ کر　　ادراکِ حال کے لیے میں ہو گیا کھڑا
کوئی ہُوا نہ مجھ سے مخاطب وہاں مگر　　چپکے سے میرے کان میں اِک غیر نے کہا
اکثر وہی بزرگ ہیں، جو ہیں پیے ہوئے　　باہوش کم ہیں، اُن کے بھی مُنہ میں ہیں بیسے ہوئے

---

[1] یعنی مسز اینی بسنٹ صاحبہ

ہرگز کوئی کہے گا نہ اس انجمن کا راز | کیوں اپنے آپ کو ہے پریشاں کئے ہوئے

پہلے تھا قوم میں سب کچھ، مگر اب کچھ نہ رہا | کسی شاعر نے ہے واللہ یہ کیا خوب کہا
شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلّیٰ باقی | اور مرے پاس ہے اُردوئے معلّیٰ باقی

معانیِ قرآں کا تو کچھ مزا | پڑھو لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذٰی

نہ حرفِ شکوہ بہتر ہے، نہ اچھا اشک کا بہنا | ہمارے دن یہی ہیں، رنج سہنا اور چُپ رہنا
خدا کے واسطے اکبرؔ کوئی ذکر اور ہی چھیڑو | سُنی باتوں کا کیا سُننا، کہی باتوں کا کیا کہنا

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا | قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایا
کہتے تھے وَلد کو لوگ سِرُّہٗ لابیہ | سِرُّہٗ للماسٹر کا اب وقت آیا

بڑھا پاتا ہوں بنگالی کا درجہ برطرف صاحب | زمانے میں نیا یہ دَور ہے ماہی مراتب کا

تیروں نے غم کے، قلب کو کم بخت کر دیا | سوزِ دروں نے سینہ کو دم پخت کر دیا

طفلِ دل، محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا | ذہن کو تپ آ گئی، مذہب کو فالج ہو گیا

سعادت روح کو کس بات میں ہے آپ کیا جانیں | کہ کالج میں کوئی اس بات کا ماہر نہیں ہوتا

واہ اے سیّدِ پاکیزہ گہر کیا کہنا | یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا | ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

قوم کا اوج ہو منظور، خدا خواہ نہ ہو | غیر ممکن ہے کہ دنیا میں تری واہ نہ ہو

قوم کی تاریخ سے جو بے خبر ہو جائے گا | رفتہ رفتہ آدمیت کھو کے خر ہو جائے گا

بھائے جو نگاہ کو وہی رنگ اچھا | لائے جو راہ پہ، وہی ڈھنگ اچھا
قرآن و نماز سے اگر دل نہ ہو گرم | ہنگامۂ رقص و مطرب و چنگ اچھا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال | بیج مغرب نے جو بویا، وہ اُگا اور پھل گیا
بُوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا | ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ساتھ اُن کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا | بندر کی طرح اونٹ اُچھل ہی نہیں سکتا

پوچھا کہ شغل کیا ہے، کہنے لگے گرو جی | بس رام رام جپنا، چیلوں کا مال اپنا

کیا شور و فغاں نے میری اُس کو مضمحل کتنا | بہت شوخی شرارت تھی مگر عورت کا دل کتنا

خواہشِ ایراں نہ شد واعظِ اسلام را | حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را

جو پاس بھی ہو بہ صد مصیبت تو نفس میں کچھ نہیں فضیلت | اگر ہو طالبِ کمال کے تم تو چھوڑ دو امتحان ایسا

پیری سے کمر خم ہے، وہ فرماتے ہیں تن جب | قابو میں نہیں ہاتھ تو کیا ہو سکے یخب

وسعت ہے درِ علم میں، ہے راہِ عمل بند | ہے صاف سڑک، پاؤں پہ سیکن ہے شکنجا

کیا کہوں اس کو میں بدبختیِ نیشن[1] کے سوا | اس کو آتا نہیں اب کچھ امیٹیشن[2] کے سوا

اس قدر تھا کھٹملوں کا چارپائی میں ہجوم | وصل کا دل سے مرے ارمان رخصت ہو گیا
لات دنیا نے جو ماری، بن گیا دیندار وہ | تھی بُری ٹھوکر مگر شیطان رخصت ہو گیا

مری تقدیر کا اُس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا | جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا
کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہِ حُبِّ قومی میں | وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر | یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا
لطیف الطبع ساقی چاہیے فیاض طینت کا | چمن سے بے ہوا کے کاروانِ بُو نہیں چلتا

درس تھا یکساں مگر وہ تو مسیحی ہی رہے | تجھ پہ مذہب کے عوض شیطاں کا قابو ہو گیا
ایک ہی بوتل سے پی ہوٹل میں دونوں نے شراب | لطفِ مستی اُن کو آیا اور تو اُلّو ہو گیا

ہر قدم اُن کا شہیدِ لغزشِ مستانہ تھا | سر میں تھا سیّد کے قرآں، زیرِ پا مے خانہ تھا

تجھے انگلش سے جب موقع نہیں ہے گرم جوشی کا | تو پھر کیا لطف ہے اے ہم نفس اس بادہ نوشی کا
تکلّف سے جواب اُس نے دیا سُن کر کہ اے اکبرؔ | ادا کرتا ہوں میں یہ حق فقط پتلون پوشی کا

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا | منتظر ہوں اب اُنکے پٹنے کا

سرسیّد کو فلک نے تھمنے نہ دیا | تہذیب کو پھر دوبارہ جمنے نہ دیا
ملّت کی شکست میں مدد دی کالج | بننے لگی قوم جب تو بننے نہ دیا

گھر میں ہمیں چرخ نے ٹہلنے نہ دیا | باہر کی طرف چلے تو چلنے نہ دیا
کالج نے بٹھا دیا جو مانندِ شمع | کچھ پھول چلے تھے، اس نے پھلنے نہ دیا

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا | اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہے ہر اک، نہیں ہے بلبل کوئی | اس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

اُپج ہے یہ رئیسوں[3] کی، ترانہ ہے نہ غلغلے کا | نہ یہ پودا ہے گلشن کا، نہ یہ بوٹا ہے گملے کا

[1] NATION قوم [2] IMITATION، نقل، [3] یعنی رقیبوں کے۔

ہمارے حضرتِ شیخِ مہذّب کی ذہانت ہے
خدا اس میں چمک دے، یہ بھی اِک طرّہ ہے شملے کا

دل چھوڑ کر زبان کے پہلو پہ آ پڑے
ہم لوگ شاعری سے بہت دُور جا پڑے

معنی کے ساتھ ہو تو مزہ ہے زبان کا
انجم نہ ہوں تو لُطف نہیں آسمان کا

ہے صاف عیاں حرم سرا کا مطلب
بیگانوں کے واسطے ہے اِک حدِّ ادب
ممکن ہو اگر تو اُس کو قائم رکھو
عزت کے نشان اور تو مٹ گئے سب

پنڈت نے خوب بات کہی جوشِ طبع میں
ناحق گزشتہ عہد پہ یوں طعنہ زن ہیں آپ
پتھر کے بدلے اب تو دھرم[1] ٹوٹنے لگا
محمود بُت شکن تھا، برہمن شکن ہیں آپ

محتاجِ درِ وکیل و مختار ہیں آپ
سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ
آوارہ و منتشر ہیں مانندِ غبار
معلوم ہُوا مجھے زمیندار ہیں آپ

جاتی رہی وعظِ مذہبی کی قوت
ہر سر میں سمائی خودسری کی قوت
اطفال کو ناز ہے، مگر قومی آنکھ
روتی ہے کہ ہے یہ خودکشی کی قوت

حاضر ہوا میں خدمتِ سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے آداب عرض ہے

مہماں آئے تو اُس کو گھیرو نہ بہت
اُس کی راہوں سے اُس کو پھیرو نہ بہت
مجلس ہوئی ختم اب میں گھر جاتا ہوں
بھائی مجھے میرا حصّہ دے، رو نہ بہت

عینک آنکھوں پہ، مُنہ میں مصنوعی دانت
نیچر نے تھکا کے کر دیا جسم کو تانت
اب تک ہے مگر وہی ہوس حضرت کی
ہے طولِ اَمل ہنوز شیطان کی آنت

عزیزوں کی اعانت گم، بزرگوں کا ادب رخصت
جو دل بدلا تو سب بدلا، خدا رخصت تو سب رخصت

ڈیلی گیٹوں نے جو شملے میں بہم کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ڈکاریں ہیں مباح
سنٹرل بھی ہو کمیٹی اور پراونشل بھی ہو
حامیِ پبلک بھی ہو، رخ جانبِ کونسل بھی ہو
بابوؤں کی طرح لیکن غل سے کچھ مطلب نہ ہو
کر دیں بس توضیح، جزو و کل سے کچھ مطلب ہو
ولولے ایسے نہیں محتاج کچھ تصریح کے
کیوں نہ ہو، دانے تو ہیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے
گندھ کے اب قومی گلے کا ہار ہو جائیں گے یہ
پالسی کے طرۂ دستار ہو جائیں گے یہ
بحثِ ملکی میں تو پڑنا ہے نری دیوانگی
پالسی ان کی رہے قائم، ہماری دل لگی
ہم یہ کہتے ہیں کرو جو استخارہ راہ دے
تم فقط پُتلے بنا سکتے ہو، جان اللہ دے

طفلِ مکتب کہ سخن باز زباں می گوید
شکوہ کم کن کہ چنیں گفت و چناں می گوید

طبع او فوٹوگراف است و سرودش سبقش
آں چہ بستند بر او، نقش ہماں می گوید

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

گفتم ایراں را سرِ جنگ نہ ماند
آں مردی و آں ہوا و آں رنگ نہ ماند
آغا خندید و گفت رنجے دگر است
کامروز برائے ساغرم بنگ نہ ماند

شکرِ چشم و گوش کرتا ہوں مگر یا رب یہ کیا
آنکھ بُھنگے کے حوالے، کان جھینگر کے سپرد

افسوس ہے بدگماں کی آزادی پر
خالق کبھی خوش نہ ہوگا بربادی پر
طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبرؔ
یہ تو اک ٹیکس ہے اس آبادی پر

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر
بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر
سودا اُس کا ہے جو سدھار النّدن
وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی، لے کر

یہ وقتِ شکستِ قوم کا ہے بخدا
کرتا ہوں میں تجھ کو اس کی تنبیہ اکبرؔ
ایسی مسجد ہو جس پہ اطلاقِ ضرار
قرآں کو مان لاتقم فیہ اکبر

کر دو تعمیرِ گھر کی اکبرؔ حدودِ میونسپل[1] کے اندر
یہ اہل کارانِ بددیانت بنیں گے پھوڑا جنگل کے اندر

ہوئے اس قدر مہذّب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر

میں رعیت ہوں، وہ شاہانہ دلیری ہے کہاں
مجھ کو کیوں رشک آئے وضعِ ملّت انگیز پر
کانٹے بچھ جاتے ہیں اُن لوگوں کی راہِ رزق میں
خوف آتا ہے چھُری چلتی ہے اُن کی میز پر

مُعمّا

ممکن نہیں عبور مرا اُن کے ناز پر
بالفعل ہے مقامِ عدالت جہاز پر

کیا اس کی خوشی کہ تم کو ہے عقلِ کثیر
ہم کو تو اسی سے کر دیا تم نے فقیر
ہرگز یہ نہیں ہے حسنِ قانونِ خدا
کہتے ہیں حضور اس کو حُسنِ تدبیر

تہذیبِ نو کے رنگ پہ بلبل بنے ہیں سب
واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ پر

شیخ ملتے ہی رہیں گے تجھ سے بہرِ اغذیہ
دین خود تجھ کو نہ چھوڑے گا جو تو دنیا نہ چھوڑ

جس طرح ہے تجھے الم جسم کی تمیز
دیکھے گا دردِ جاں کو بھی اک دن تو اے عزیز

---

[1] یہاں ٹوٹنے لگے۔

[1] MUNICIPAL

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس — ہے ابتریِ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا — ہے اپنے ہی میلِ معصیت کا افسوس

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل — تمہارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

یار نے پوچھا کدھر جاتا ہے تو — عرض کی میں نے ہلاکت کی طرف
پوچھا اُس جانب لیے جاتا ہے کون — میں نے دیکھا اُس کی صورت کی طرف

بن گئی ہے خضرِ راہ دوستاں کیدِ حریف — ہے نمازِ گریۂ زاہد سے خوش کیکِ نحیف
ہم کو یہ سجدہ ملایا چاہتا ہے خاک میں — کون سمجھے شاعروں کے یہ اشاراتِ لطیف

ہم کو نہیں اُن کے عیش و راحت پر رشک — بے غیرت و کودن اس پہ برساتے ہیں اشک
کافی ہے ہمیں عبادتِ حق کے لیے — ایک اونٹنی، ایک پال، پانی اک مشک

کونسل میں شریک ہو گا کل ملک — اب تفنیکش کا باندھ دے گا پُل ملک
یارب کل سلطنت ہے تیری — تو ہی الملک اور تنزع الملک
اونچا سستی سے ہے کیا گورنمنٹ — کیوں کرتا ہے اتنا شور و غل ملک؟
گائیں ناحق بھڑک رہی ہیں — ویراں نہ کریں گے جان، بل ملک
ہوتی ہے روش جو سلطنت کی — جاتا ہے اُسی طرف کو ڈھل ملک
زندہ جس سے ہے بزمِ قومی — وہ کون ہے، صرف محسن الملک
غنچے کی طرح سمٹ کے اُبھرو — اُس وقت کھلے گا مثلِ گُل ملک

اکبر اس اندیشہ میں رہتا ہے غرق — کافر و نیٹو میں ہے تھوڑا ہی فرق
کافری کا ہے علاج ایمان سے — نیٹویت تو ہے لپٹی جان سے

بنام خیالاتِ پاٹ آفریں — زبانوں پہ بسکٹ کی چاٹ آفریں

اس قوم کو یک دلی کی رغبت ہی نہیں — جو ایک کرے، اُدھر طبیعت ہی نہیں
اکبر کہتا ہے میل رکھو باہم — وہ کہتے ہیں میل کی ضرورت ہی نہیں

کیسا اسلام، ان میں غیرت ہی نہیں — ایماں کہاں کہ جب بصیرت ہی نہیں
طرزِ تعلیم پہ ہے لیکن الزام — وہ علم نہیں تو وہ طبیعت ہی نہیں

واں شوکت و زینت کے جو اسباب بہت ہیں — معنی کے یہاں گوہرِ نایاب بہت ہیں
صاحب کی سی محفل تو میسر نہیں لیکن — صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہمارے نورِ دیں کھو کر — یہ کیا اندھیر ہے بجھ لیتے ہیں، یہ تب چمکتے ہیں

دنیا میں ضرورت زور کی ہے اور آپ میں مطلق زور نہیں — یہ صورتِ حال یہی قائم تو امن کی جا جُز گور نہیں

ط THANKS

تاریخ ہم اپنی جانتے ہیں اور آپ کو پہچانتے ہیں — کب آپ کی باتیں مانتے ہیں، کچھ فہم تو ہے گو زور نہیں
اے بھائیو بابو صاحب سے کھنچنے کا نہیں ہے کوئی محل — گو نسلِ علاؤ الدین میں ہو مسکن تو تمہارا طور نہیں

مشتاقِ لعنت ہوں، در پہ حاضر ہوں میں — دق، منظور نہیں کہ بارِ خاطر ہوں میں
حضرت کو جو فرصتِ ملاقات نہ ہو — بوسے پہ آستاں کے شاکر ہوں میں

ہوائے طوطی ہے اب سر میں، نہ موجِ کوثر ہے اب نظر میں — ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں

دلچسپ ہوائیں سوئے گلشن پہنچیں — زلفیں شملے سے تا بہ دامن پہنچیں
دُرگا بائی سے راجہ جی جب رُوٹھے — صدقے ہونے کو بی نصیبن پہنچیں

جھنجلا کے بولے اُن سے جو لپٹا اندھیرے میں — اندھیر اس طرح کا تو دیکھا کہیں نہیں

داخل میری دانست میں یہ کام ہے پُن میں — پہنچائے گا قوّتِ شجرِ ملک کی بُن میں
تحریکِ سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر — کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں — موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں
ترانے میرے ہم آہنگِ دیر و کعبہ ہیں یکساں — زباں پر میری موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں
مجھے الفت ہے سُنّی سے بھی، شیعہ سے بھی یاری ہے — اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دلکش بانکپن دونوں
مجھے تو گُل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی — تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

ایک سید کیا کریں، یا بیٹھ کر درس کیا کریں — حضرتِ حالی کے اشعارِ مسدس کیا کریں
سچ تو یہ ہے، مہربانی آپ کی درکار ہے — ہم غریب و ناتوان و زار و بیکس کیا کریں

بدمستی سر میں، گدازِ غم دلِ مایوس میں — شمع ساں ہم جل رہے ہیں مغربی فانوس میں
دو کہتا ندرو ریا سے ہوں، تو فرماتے ہیں وہ — آج کل برکت بڑی ہے خرقۂ رسالوس میں

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم — اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

ہم نیک خصال ہیں، یہ تسلیم نہیں — دنیا میں اس روش کی تکریم نہیں
لیکن یہ ہیں طریق و عاداتِ عجم — واللہ کہ یہ عرب کی تعلیم نہیں

چو مسٹر نہ باشد ترا میہماں — چہ پرہیز خوردن، چہ بردے خواں

مہندی نے گھر کیا ہے دلِ شیخ و رند میں — سید کا جانشیں ہے وہ آج ہند میں

یہ بولے رو کے پیرو اور گیا دین — دھرم دنیا سے اٹھا اور گیا دین

ط MUTTON

ڈکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں   مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل و تمیز   اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں، جو ہیں ناداں

نیچریت چیست از دیں گم شدن   نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

بھوک زائد ہو جس کے پاس کھانا، اُس کے پاس   اتنی دولت ہے کہ رکھنے کی جگہ مطلق نہیں

ناصح نے کہا کہ جلد مذہب چھوڑو   ورنہ سائنس پیس ڈالے گا تمہیں
مذہب نے کہا کہ مجھ کو چھوڑو گے تو وہ   کیا گود میں اک طرف بٹھالے گا تمہیں؟

پورا سائنس تم کو آنے کا نہیں   کچھ آیا تو پیشوا بنانے کا نہیں
وہ کمپنیاں ہیں، یہ ہے کونے کی دکان   بے ختم ہوئے یہ دَور جانے کا نہیں

سوچا نہیں خود غرض کو آئینِ صواب   جتنا چھوڑو گے ہم کو تم، ہو گے خراب
واللہ یہی نتیجہ ہو گا پیدا   دنیا میں حقارت اور عقبیٰ میں عذاب

اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں   جو اہلِ نظر ہیں، اس سے شرمندہ ہیں
حکام کی ہے یہ صرف عیسیٰ نفسی   اعضا کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں

حدیں قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ قائم   زمانہ دیکھ کر چلیے طریقِ زندگانی میں
محبت کس طرح اس قوم میں باہم رہے قائم   زباں میں حرفِ غیبت، دل میں ڈھبے بدگمانی ہیں

میں نے کہا کہ اپنا سمجھیے مجھے غلام   بولا وہ بُت یہ ہنس کے، فرنگی نہیں ہوں میں

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں   یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن، ہم زبان و ہم قسمت   کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

پڑھتے نہیں نماز یہ خود، رائے کیا کروں   قوم نہیں تو قوم نہیں، ہائے کیا کروں

باپ سے مانگو نہ عشرت، نہ چچا سے مانگو   سعیِ بازو پہ کرو تکیہ، خدا سے مانگو
حسنِ تدبیر بڑی چیز ہے اس دنیا میں   مدد اس کام میں تم عقلِ رسا سے مانگو

دل سے دھرم اٹھا ہے تو اب ذات بھی توڑو   ویراں ہوئی کھیتی تو عمارات بھی توڑو
برباد کرو خوب منوجی کے چمن کو   باقی نہ رہے پھول تو اب پات بھی توڑو

یا کس کے کمر پہ خوشامد باندھو   یا حجرے میں گھس کے بیٹھو، تہمد باندھو
کیا فائدہ بے قرینگی سے اے شیخ   بہتر ہے یہی کہ اپنی اک حد باندھو

---

۱ سید عشرت حسین

پانیر کے صفحۂ اوّل میں جس کا ذکر ہو   میں ولی سمجھوں، جو اُس کو عاقبت کی فکر ہو

شملہ بمقدارِ علم

افسوس ہے کہ مر گئے بکٹؔ اب نہیں کوئی   اس درجہ جس میں علم ہو، اس درجہ علم ہو
شملے پہ جان دی تو تعجب ہے اس میں کیا   لازم تھی وہ جگہ جو بہ مقدارِ علم ہو

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو   اس کو کالج اور اسے کانووکیشن سمجھو
جو جنہیں مقدرتِ وضع و نفاذِ قانون   بس انہیں کو صفِ اقوام میں نیشن سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار   تپشِ قلب کو بنگال ایجی ٹیشن سمجھو

دیں دار بنو، درست دیں ہو کہ نہ ہو   قدر اس کی زمانے میں کہیں ہو کہ نہ ہو
مذہب پہ جمے رہو، یہ ہے شیخ کا قول   کر دو کہ یقین ہے، یقیں ہو کہ نہ ہو

افسوس اُن پہ فلک نے پایا قابو   مطلق نہیں ان میں، رنگ ڈھونڈو یا بُو
شیخی کو چھوڑ میرزا سے پہلے   بنتے جاتے ہیں اب یہ مسلم بابو

لطفِ سخن تو ہے یہی، ٹرس بھی ہو، شوخی بھی ہو   ذہن کا وصف ہے یہی اوریجنلٹی بھی ہو

مرشد نئی روشنی کا ہے قابلِ قدر   تزئین بھی خوشنما ہے تنویر کے ساتھ
طالب جمعہ کا لیکن اُس سے ہے دُور   اقوار بنگا ہوا ہے اس پیر کے ساتھ

عقلِ سید بود از انوارِ حکمت یافتہ   زورِ بازو دیش، عُدو را پنجہا برتافتہ
مشکلے در پیش ہست اورا اگر گویم نبی   ز انبیا ہرگز کسے نگذشت پنشن یافتہ

پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی!   جو سمجھتے ہیں، یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سن چکا ہوں میں کہ کچھ بڈھے بھی ہیں اس میں شریک   یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیرِ نابالغ ہیں وہ

اکبر کو ہے اُلفتِ بتانِ گمراہ   کرتا ہے انہیں کے وصف میں نامہ سیاہ
احباب جنہیں جدا اس سے ایسے اشعار   تردید کریں، کہیں کہ سبحان اللہ

بے بے تکے قلم کے لوگ بھاگے نکلے   ہر طرف سے بیسیوں رسالے نکلے
افسوس کہ مفلسی نے چھاپہ مارا   آخر احباب کے دوالے نکلے

سچ ہے کہ انہوں نے ملک لے رکھا ہے   ہم لوگوں سے کمپ کو پرے رکھا ہے

---

۲ سابق پرنسپل علی گڑھ کالج   ۳ RELATION یعنی رشتہ
۴ CONVOCATION   ۵ NATION
۶ AGITATION یعنی پرجوش مخالفت   ۷ TERSE، لطیف
۸ WITTY، ظریف   ۹ ORIGINALITY، جدت

لیکن ہے ادائے شکر ہم پر لازم
کھانے بھر کو ہمیں بھی دے رکھا ہے

پوچھتے کیا ہو مسلمانوں کا حال!
منتشر اجزا سب اُن کے ہو گئے
معتصم کب ہیں یہ حبل اللہ سے
دیکھ لو جھاڑو سے تنکے ہو گئے

غضب ہے وہ ضدی بڑے ہو گئے
میں لیٹا تو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے
نہیں اُن کو کچھ شرم لاحولِ قوم
یہ مُلحد تو چکنے گھڑے ہو گئے

ہر ایک کو ایک دن اجل آنی ہے
دنیا گذراں ہے، ہیچ ہے، فانی ہے
لیکن مرنا جو عالمِ وجد میں ہو
گویا کہ شعاعِ نورِ یزدانی ہے

تم کتنے ہی محوِ کج ادائی رہتے
تم پر دل و جاں سے ہم فدائی رہتے
صد شکر تم آئے، بڑھ گئی لذتِ طبع
لیکن جو نہ ملتے تب بھی بھائی رہتے

مسلمانوں نے کالج کی بُری کیا راہ پکڑی ہے!
وہی تو اک ٹھکانا ہے، وہی اندھے کی لکڑی ہے

نہ گئی دل سے مرے حُسن پرستی نہ گئی
بجھ گیا خون مگر روح کی مستی نہ گئی

مجھ کو کچھ حیرت نہ ہوگی تم کو ہو جائے گا فخر
کہہ دو اک بدمست گویے کو کہ بندہ زادہ ہے
مغربی تہذیب میں کس کو میں سمجھوں مستند
اس تماشا گاہ میں جو ہے وہ صاحبزادہ ہے

اسیرِ دامِ زُلفِ پالسی مدت سے بندہ ہے
فصاحت نذرِ لکچر ہے، ریاست نذرِ چندہ ہے

ان کی سب باتوں کو اکبر سیکھ لے
خود وہ فرمائیں گے پھر آ بھیک لے

جو لوگ طرفدار علی گڑھ کے رہیں گے
اس دور میں بے شک وہی بڑھ چڑھ کے رہیں گے
مفلس رہیں، گمنام رہیں نصیبہ جو کچھ ہو
کالج کے یہ سب علم تو ہم پڑھ کے رہیں گے

دادِ قرآں کی نہ دو، بھائی عمل اُس پہ کرو
پیشِ درگاہِ خدا، واہ کی حاجت کیا ہے

ظاہر میں اگرچہ رازِ سربستہ ہے
مضمونِ لطیف و خوب برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علی گڑھ کالج
گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہے

سرحد پہ باغیوں کو سکھ ماریں گے
گردن اُردو کی رام رکھ ماریں گے
قائم رہے البشیر کا یہ پرچہ
ہم بھی مضمون کوئی لکھ ماریں گے

کونسل سے ہر طرح کا قانون آ رہا ہے
مطبع سے ہر طرح کا مضمون آ رہا ہے

لیکن پڑھوں میں کیونکر آنکھوں کی یہ ہے حالت
اشک آ رہے تھے پہلے، اب خون آ رہا ہے

باغوں میں تو بہارِ درختوں کی دیکھ لی
کالج میں آ کے کانوکیشن کو دیکھیے
لیموئے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے
اب کاغذی ترقیِ نیشن کو دیکھیے

اپنے بھائی کے مقابل کمر بستہ تن جائیے
غیر کا جب سامنا ہو، بس تتلی بن جائیے
فلسفۂ الحاد کا کیجیے فوراً قبول
دین کی ہو بات تو ابطال پر ٹھن جائیے
چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قرآنِ مجید
مذہبی محفل میں لیکن مثلِ دشمن جائیے
شیخ صاحب! ہے یہی قومی ترقی کی شناخت
روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ، من جائیے

پڑا ہے قحط، بشر مر رہے ہیں فاقوں سے
خوشی ہو کیا مجھے شبرات کے پٹاقوں سے
بجھی ہوئی ہے طبیعت، یہ روشنی ہے فضول
اتار لیجیے صاحب چراغ طاقوں سے

دنیا ہی اب درست ہے، قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے
اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

گذرے مری نگاہ سے یاروں کے جھگڑے
مطلب یہ تھا سرور بڑھے اور غم گھٹے
کھانے بھی خوب کھلائے، اُڑیں گلچھریں بھی خوب
لیکن ہُوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے
ہم تو اسی کو بات سمجھتے ہیں کام کی
عشقِ صمد زیادہ ہو، عشقِ صنم گھٹے

جس سے جو بن پڑے، وہی کام کرے
صاحب بنے، کھائے کھیلے آرام کرے
لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد
ہر حال میں ادعائے اسلام کرے

چرچے ہیں نہ مذہب کے، نہ وہ قصۂ دل ہے
پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل[1] ہے
اس عہد میں مائل سوئے الحاد جو دل ہے
اس کی تو گورنمنٹ ہی رسپانسیبل ہے
تل کھیت میں مل جائے تو گودام میں لے جائیں
کیا فائدہ عارض پہ کسی بُت کے جو تل ہے
تنخواہ کے بل سے ہمیں ہوتی ہے مسرت
اور شیخ یہ کہتا ہے کہ یہ سانپ کا بل ہے
غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

سابق کے طریقوں پہ عمل کر نہیں سکتے
کل آج نہ تھا، آج کو کل کر نہیں سکتے
الزام کہیں مشقِ قواعد کا نہ لگ جائے
صوفی بھی بہت کود اچھل کر نہیں سکتے

کانفرنس

جمعیتِ عاقلانِ قوم اچھی ہے
گلہائے سخن کے باغ کھل جائیں گے
کہتا ہے یہ معترض کہ ملنا کیا ہے
کچھ اور نہیں تو دل ہی مل جائیں گے

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دور
کیوں کر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک عرض کروں گا دبی زبان
گو خوشنما بہت ہے مگر بے اصول ہے

لہ دوسرے مصرعے کے قافیے کے لئے طبع آزمائی ہوئی تھی۔

لہ RERPONSIBLE ، ذمہ دار

دنیا کی ہوا راس جو آئی، بھڑک اُٹھے   انگارے ہوئے جاتے ہیں اب کوئل کے کالے
کم زور کی ہانڈی جو زبردست نے دیکھی   دل نے کہا بے پوچھے ہوئے کھول کے کھالے
تسبیح مری تو ہے عطا کردہ مرشد   ان برہمنوں کے پاس تو ہیں مول کے مالے

ترکیب تو دیکھو یہ زمانے کے چلن کی   افسوس کہ اس سے کوئی واقف بھی نہیں ہے
گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود   مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

بزمِ اکبر دانش آموز و نشاط انگیز ہے   ہر سخن اس کا لطیف و خوب و معنی خیز ہے
بالارادہ اس سے جو کرتا ہے اعراض و گریز   ناگوار اس میں وہ ہے، یا کودن ہے یا انگریز ہے

سخن سازی کی چالوں میں تو خامہ ان کا شاطر ہے   مگر جو حالتِ اصلی ہے، وہ پبلک پہ ظاہر ہے

اس زمانے میں جو دل دہر سے پھر جاتا ہے   آدمی پایۂ تہذیب سے گر جاتا ہے

ہیں کچھ واقف نہیں آرام وہ اب کون بلا ہے   کرشمہ موہوم امیدوں کا، لفظوں کا سمندر ہے

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے   عجم نے واسطہ رکھا شرابِ شاہد سے
اُدھر تھی حمدِ خدا ہی سے آشتی دل کی   ادھر تھی بحث نزاعِ حمید و حامد سے

ہے نئی روشنی اک دلکش و ذاتی ترکیب   لفظ ہی لفظ ہیں، جتنے ہیں زوائد اس کے
لیمپ بجلی کا ہے، یہ مہرِ جہاں تاب نہیں   جب اندھیرا ہو تو ظاہر ہوں فوائد اس کے

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے   دُنیا تو گئی، دین بھی برباد کریں گے
جب خود نہیں رہنے کے کسی اصل پہ قائم   کیا خاک وہ قائم کوئی بنیاد کریں گے
بارک کوئی کر دے گی عطا اُن کو گورنمنٹ   یا کالونی اپنی کوئی آباد کریں گے

صوتِ ہزار طائرِ بدلحن نہ سن سکی   کہنے لگا کہ بھاڑ میں بلبل کی چونچ جائے
اُس نے کہا، مقابلہ کا کب تھا یاں خیال   یہ تو وہی مثل ہے کہ کانا ہو کر بچ جائے

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے   جو کچھ ہے اب تو کالج و تھیٹر میں خرچ ہے

عزت کا ہے نہ اوج، نہ نیکی کی موج ہے   حملہ ہے اپنی قوم پہ، لفظوں کی فوج ہے
اس طرزِ تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن   لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج ہے

اسلام کی بو وہاں نہیں ہے مطلق   مسجد بھی ہے، مولوی بھی ہیں، ٹھاٹ بھی ہے
دریا میں نہیں ہیں جوہرِ تیغ اکبر   گو آب بھی اس میں، دھار بھی، کاٹ بھی ہے

پیری نے دانت مجھ پہ لگایا ہے گھات سے   بائیں طرف کی ڈاڑھ میں ہے درد رات سے
بارہ مسالے ایک طرف، ورد اِک طرف   پیپل سے فائدہ ہے نہ کچھ تیج پات سے

نہ یہ قیدِ شریعت ہے، نہ یہ غفلت کا پردا ہے   رواج و مصلحت کی بات ہے، حکمت کا پردا ہے
تمہیں دھوکے میں ڈالا ہے مثالِ اہلِ یورپ نے   اُدھر سایہ حکومت کا ہے، یاں عزت کا پردا ہے

کہتے ہیں ترکِ ملت، انساں کو بات کیا ہے   تحقیق تو کرو تم، حضرت کی ذات کیا ہے

خوب فرمایا یہ شاہِ جرمنی نے پوپ سے   وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے
جدِ امجد خود ہی کرتے تھے یہ موسم بسر   ہم کو اپنے عہد میں پالا پڑا کنٹوپ سے

رہ گئے نا آشنا، احباب غائب ہو گئے   ہم نفس دو اِک جو باقی تھے، وہ صاحب بن گئے
وقتِ بد میں کون رکھتا ہے رفاقت کا خیال   ہم نشیں اپنے رقیبوں کے مصاحب ہو گئے

کدھر جاتی ہے طبعِ قوم، اس کو کوئی کیا جانے   بصیرت جن کو ہے، وہ جانیں اکبر یا خدا جانے

طریقِ حق میں بھی بہرِ خدا ذرا چلیے   فٹن کی راہ نہیں ہے پیادہ پا چلیے

کہا جب غیر کو کیوں تو نے اے گُل رُو پھنسایا ہے   تو بولا، دل لگی کے واسطے اُلّو پھنسایا ہے
اِدھر چاہِ ذقن ہے، اُس طرف ہیں جال گیسو کے   ہمارے دل کو اُس نے کر کے بے قابو پھنسایا ہے

گلوں کو دیکھ کر کہتا ہے وہ شوخ   ہمارا رنگ بھی پھیکا نہیں ہے

عاشقوں کے بھی معین ہو گئے ہیں اب حقوق   عہدِ انگریزی ہے یہ اے جانِ جاں، شاہی گئی

قوم اور سلطنت ہیں دو چیزیں   نیچرل وہ ہے، یہ ہے مصنوعی
نیچرل چیز بن نہیں سکتی   آئیں کیوں کر صفاتِ مجموعی

نہ رنگِ انجمن وہ ہے، نہ وہ مے کش، نہ وہ ساقی   یہ دعوت کیا ہے، بس ہے اک ادائے فرضِ اخلاقی
نہ وہ مکتب، نہ وہ مُلّا، نہ وہ صورت، نہ وہ سیرت   سوا نامِ خدا کے اب رہا کیا قوم میں باقی
کہاں وہ دعوتِ احباب کی طیاریاں اکبر   خوشی سے ادا کرتا ہوں بس اِک فرضِ اخلاقی

بے بصیرت ہے مگر تو، منکرِ شیخ و ولی   ناشگفتہ رہ گئی بے شک ترے دل کی کلی
چشم پیدا کن کہ بینی آشکار و ہم نہاں   در قبائے گلرخاں رنگِ نبی، بوئے علی

بلا طاقت تہِ افلاک انساں کی نہیں چلتی   وہاں تو ریل چلتی ہے، یہاں روٹی نہیں چلتی

پہلے تو دکھاتی تھی چمک اپنی گنی   اب پیشِ نگاہ ہیں پنس[1] و پینی[2]
کہتے ہیں حریف ہنس کے اب از رہِ طعن   جب دین کو کھو دیا تو دنیا بھی چھنی

ہم نے واعظ کی خوب ڈاڑھی نوچی   یہ بات مگر نہ اپنے دل میں سوچی

---

[1] PENCE، انگریزی انّی   [2] PENNY، انگریزی پیسے

مذہب کو شکست دے کے کیا پائیں گے   آخر کو رہیں گے موچی ہی کے موچی

فضلِ خدا سے عزت پائی، آج ہوئے ہم سی۔ ایس۔ آئی   شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی، بولے ہوئے ہیں یہ عیسائی

اب تک جو کہیں ہماری قسمت نہ لڑی   ناحق تجھے ہم نشیں ہے فکر اس کی پڑی
انگریز کے ملک میں لڑائی کیسی   یہ ہند ہے، یہاں خوش انتظامی ہے بڑی

روشنی جن میں نئی ہے، وہ مری سنتے نہیں   لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب! ہے یہ فانی روشنی
انجم و شمس و قمر لیکن ہیں میرے ہم طریق   وضع پہ قائم ہیں، ان میں ہے پُرانی روشنی

انگریزوں میں عادت سحر خیزی تھی   انداز و روش میں اک دلآویزی تھی!
مشرق کی ہوا سے وضع اب ہے بدلی   پہلے اچھی تھی، خالص انگریزی تھی

تھے کیک کی فکر میں، سو روٹی بھی گئی   چاہی تھی شے بڑی، سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانی آخر   پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

ضدی کو بُرا بھلا جو چاہو وہ کہو   لیکن دکھلا دی اُس نے بیوٹی اپنی
لاکھوں ہی کے ڈھیر کر دیے کالج میں   پوری کر دی یہ اُس نے ڈیوٹی اپنی

حقیقت میں تو سب جلوہ تھا اُن کا   رہی اِک حالتِ فرضی ہماری
خدا ہی سے دُعا پر تھا بھروسا   کہیں گزری نہیں عرضی ہماری
خدا سے جب کہا مرتا ہے اکبر   کہا، ہم کیا کریں مرضی ہماری

اقبال کے ساتھ اے خِرد تُو بھی گئی!   غیرت کے ساتھ مذہبی بُو بھی گئی!
سچ کہتے ہیں حضرت کرامت[1] اکبر   رُخصت ہوئی فارسی تو اُردو بھی گئی

کیا پوچھتا ہے حکمتِ مغرب کا واہ واہ   فطرت بھی اس کو دیکھ کے حیران رہ گئی
سمجھے تھے یہ کہ ایک ہیں ہم اور ہماری جان   دیکھا مگر کہ ہم نہ رہے، جان رہ گئی

قطعہ

جو پائی ترکِ عبادات میں مثال بُری   شروع ہی نے پکارا کہ ہے یہ فال بُری
جنابِ حضرتِ سید پہ کھُل گیا ہوگا   کہ ہوتی جاتی ہے بے قیدیوں سے چال بُری
یہ بحث جانے دے اکبر، کچھ اور باتیں کر   عبث ہے جب تو یقیناً یہ قیل و قال بُری

خواہانِ نوکری نہ رہیں طالبانِ علم   قائم ہوئی ہے رائے یہ اہلِ شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی   عہدوں سے آ رہی ہے صدا دُور دُور کی

پاؤں کو بہت جھٹکا پٹکا، زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی   تدبیر بہت کی اے اکبر، تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا سید کو مُرید بنا ہی لیا   سب پیروں سے تو بچ نکلے، اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

جہاں نے ساز بدلا، سازنے نغموں کی گت بدلی   گتوں نے رنگ بدلا، رنگ نے یاروں کی مت بدلی
فلک نے دَور بدلا، دَور نے انسان کو بدلا   گئے ہم تم بدل، قانون بدلا، سلطنت بدلی

عجب حیرت آگیں ہے یہ انقلاب   ہماری سمجھ کیا سے کیا ہو گئی
سمجھتے تھے سب جس کو بے جا صریح   وہی بات بالکل بجا ہو گئی

جو کام تھا گھنٹے کا نکلتا ہے وہ پل سے   خوش کیوں نہ رہیں لوگ، فرنگی کے عمل سے
تاریخ تو خالد[1] کی پڑھو رات کو گھر پر   اور دن کو کچہری میں دو بنیل کمل سے

تماشا دیکھیے بجلی کا مغرب اور مشرق میں   کلوں میں ہے وہاں داخل، یہاں مذہب پہ گرتی ہے

ایماں کی ہے تاک، کافری ہے تو یہ ہے   تقویٰ بیدم ہے، ساحری ہے تو یہ ہے
نظمِ اکبر ہے دافعِ جادو و کفر   ماشاء اللہ، شاعری ہے تو یہ ہے

حکیمانہ بزلہ سنجیاں

اَلا یا اَیُّہَا الطفلک، بجو راحت بہ نادلہا   کہ قرآں سہل بود اوّل، و لے افتاد مشکلہا
بکن تزئین پا تے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلوں   کہ سر سید خبر دارد زِ راہ و رسمِ منزلہا

دیکھیے قوال بیچارے کا اب کیا حشر ہو   شیخ صاحب کو تو لکچر پہ بھی وجد آنے لگا
کیوں کرے گا پیش ہم پر جلوہ حور بہشت   جب عقیدہ کا سماں واعظ کو تڑپانے لگا

پردے کا کیا ہے خود اثر نگا پیدا   خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی جھنڈی نے   نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

مس کو دیکھا، عاشقِ زلفِ چلیپا ہو گیا   مست تھا دِل، بھُول کر وہسکی کا بدیا ہو گیا

مخمس

بکری کو ساگ پات کا سودا نہیں رہا   بنگالیوں کو بھات کا سودا نہیں رہا
چوروں کو اپنی گھات کا سودا نہیں رہا   اور شاطروں کو مات کا سودا نہیں رہا
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

بنیوں کو اخذِ سُود کی فرصت نہیں رہی   منعم کو داد و جود کی فرصت نہیں رہی
لڑکوں کو کھیل کود کی فرصت نہیں رہی   کودن کو عزت ربُود کی فرصت نہیں رہی
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

گاہک کو مول بھاؤ کی پروا نہیں رہی   مانجھی کو اپنی ناؤ کی پروا نہیں رہی
دل کو کہیں لگاؤ کی پروا نہیں رہی   چوہوں کو نان پاؤ کی پروا نہیں رہی
اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

---

[1] عالی جناب مولوی کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا رجج ہائیکورٹ الہ آباد

[1] رئیس جائیس ملک اودھ وکیل الہ آباد

بچے فراغ طبع سے اب کھیلتے نہیں   اُبھرے ہوئے جوان بھی ڈنڈ پیلتے نہیں
عشاق زنجِ ہجرِ بتاں جھیلتے نہیں   پاپڑ فروشِ پاپڑوں کو بیلتے نہیں

اُلجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

لیتا ہے کون گرمیِ دل سے خدا کا نام   اب کون دھیان باندھ کے کرتا ہے رام رام
مذہب کو دُور ہی سے کیا جاتا ہے سلام   کوٹھی کو ہے فروغ، نہ رونق پہ ہے گودام

اُلجھا ہوا ہے چندہ و سکول میں ہر ایک

کم ہو گیا ہے لوگوں میں آپس کا میل جول   وہ ٹولیاں نظر نہیں آتیں، نہ اب وہ غول
تاشے نہ تشادیانے کے بجتے کہیں نہ ڈھول   مخبوط، بدحواس، پریشان، گول مول

الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

اسکول ہی میں علم ہے جس سے کہ ہے شرف   لڑکا نہ سیکھے علم تو کہتے ہیں ناخلف
لیکن کچھ اور دھندے بھی ہیں پیشِ صنفِ لطیف   یہ کیا کہ ساری قوم ہی جھک جائے اک طرف

اُلجھا ہوا ہے چندہ و سکول میں ہر ایک

پنڈت پراجا کے بنارس پہ آ رہے   مرکٹ کے بیتنے شہر بھی تو لیش پہ آ رہے
حالیؔ غزل کو چھوڑ مسدس پہ آ رہے   ہم منفرد تھے، سو ہم بھی مخمس پہ آ رہے

الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

کونسل میں نکتہ چینوں کی ٹولی بہت پٹی   اچھا ہوا سنبھل گئی اب یونیورسٹی
بیکار کالجوں سے بھرے گا نہ ہر بستی   اس بل سے یہ شکایتِ احباب بھی مٹی

الجھا ہوا ہے چندہ و اسکول میں ہر ایک

مری نظروں میں یکساں ہیں شتر ہوں یا گئو ماتا   مجھے کرتے جو وہ مدعو کہا میں نے میں بھی جھوم آتا

ہم میں کیوں ضعف ہو، جب دین سے یورپ پھِرا   مسجدیں کیوں چلیں، جب تو پہ سے گرجا نہ گرا

پیرِ مغاں سے رات کیا میں نے یہ گلا   مغموم ہوں، یہاں بھی مزا کچھ نہیں ملا
اس نے یہ مسکرا کے کہا از رہِ مزاح   جینے کی کس نے تم کو بڑھاپے میں دی صلاح
میں نے کہا کہ بعض نود سالہ پیر مرد   اب تک اڑا رہے ہیں درِ مے کدہ کی گرد
کہنے لگا کہ ان پہ عبث ہے تری نظر   غفلت کا ہے وہ نشہ جوانی سے تیز تر

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا   نہ مندر جا، نہ مسجد جا، نہ گرجا

ایسا شوق نہ کرنا اکبرؔ   گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا   تم بھی کالے یار بھی کالا

کرتے تھے بتوں سے خوب جوڑا ناچھا   رہتے تھے منتظر برہمن اور اوجھا
برکت ہے اُسی کی اس صدی میں حضرت   بیٹھے سونے کرتے ہیں جا چھا، جا چھا

رحمن بیکاری کو سیدھا ہوا   عجب جانور ہے یہ کاکاتوا
بتاؤ ذرا عقل ہے میری گم   کدھر چونچ ہے اور کدھر اس کی دُم

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل   وہ صنم تشریح کا طالب ہوا

COCKATOO ے   YES ے   NO ے

کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات   دیکھو تو تم، زن پہ نر غالب ہوا

بات سید کی کچھ ایسی تھی کہ جس نے اُس کو   کاٹنا چاہا زمانے میں، وہ بس آپ کٹا
کہتے پھرتے ہیں یہ اب کانگرسی ہر سو   مرگیا کول کا بوڑھا، یہ چلو پاپ کٹا

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا   حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے، آنکھ آئی ہے   شاہ ایڈورڈ کی دُہائی ہے

نیچر نے دے دیا ہے پتہ رجعیت کا   کیوں کر نہ ہوں بتوں سے طالب قبولیت کا

پرچہ رکھا جو اس نے، میں یہ سمجھا   پاکٹ میں یہ بیس روپیہ کا نوٹ گیا
گھر پہ کھولا تو بس یہی لکھا تھا   کیا شعر تھے، واہ واہ میں لوٹ گیا

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا   ہل ہونا بُرا ہے پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو، دونوں بیکار   انسان کو گریجوایٹ ہونا اچھا

بن پڑے تو جلد ہی بننا مناسب ہے تجھے   دِقتوں میں وہ پھنسا جو اسکوائر ہو گیا
دیدنی ہے یہ تماشائے مشینِ انقلاب   باپ تو قبلہ تھے، بیٹا اسکوائر ہو گیا
شیخ صاحب یہ تو اپنے اپنے موقع کی ہے بات   آپ قبلہ بن گئے میں اسکوائر ہو گیا
تخلیے میں آج میں نے اُن کا بوسہ لے لیا   دیکھیے ڈگری جو ہو، دعویٰ تو دائر ہو گیا
اب تو مجھ کو بھی مناسب ہے کہ پٹواری بنوں   یار کو شوقِ حسابِ مال و سائر ہو گیا
فکرِ دنیا نے بھلایا سب وہ قرآن و حدیث   مولوی بھی محوِ قانون و نظائر ہو گیا

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی   کہ پردہ کھل گیا اِس قوم میں زنانوں کا
پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں   دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے   خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

یہی سبب ہے، اب اُن کی باتوں پہ کان دھرتے نہیں ہیں لڑکے   کھنچا نہ ہو دستِ مولوی سے تھا یہاں کوئی کان ایسا
مچائی سینے میں اس نے شورش اٹھائے اس نے زباں کے ٹکڑے   میں جلد رخصت ہوا وہاں سے، کہ حقہ ایسا تھا، پان ایسا
وہ نبض کے برلا گا کہاں سے، دکھاؤں کاریگری جو اپنی   کہا تھا منکر سے میں نے اک دن، بنا تو لے آسمان ایسا

عہدِ اسلام و عہدِ انگلش میں   سنیے قولِ اکبرِ سخن گو کا
پہلے توحید تھی تو اب تحصیل   آگے غل ایک کا تھا اب دو کا

پسکا ہیں بیس کرو روٹیاں انگوٹھے سے جولانا   ہماری کیا ہے لے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ممکن نہیں اُن کے حکم سے سر پھیروں   دل میں مرے اب تو ان کا ڈر بیٹھ گیا

ا بالارادہ اصلی لفظ سے تجاوز کیا گیا ہے ۲ SMALL چھوٹا ۳ GREAT بڑا ۴ GRADUATE
۵ ESQUIRE ۶ عدد سے مراد نہیں ہے، لفظ سے ہے اور یہ لفظ تحصیل سے متعلق ہے۔

ان کو یہ خوشی کہ اب رہے گا یہ غلام   مجھ کو یہ خوشی کہ قافیہ تو بیٹھ گیا

سنتا نہیں کچھ کسی سے ، بڑھ ، بڑھ کے سوا   کہتا نہیں کوئی کچھ ، بڑھ ، بڑھ کے سوا
بڑھنے کا نہ ٹھیک اصل ، بڑھنے کی نہ راہ   اور قبلہ کوئی نہیں علی گڑھ کے سوا

ہر ایک کو خوش کروں میں کیوں کر صاحب   اپنی ہی طرف بلاتے ہیں ہر صاحب
آسائشِ عمر کے لئے کافی ہے   بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب
تم نے جو سنا صحیح ہے ہاں صاحب   عربی سے گریز کرتے ہیں خاں صاحب
سچ کہتے ہیں وہ کہ ہم کو اس سے کیا کام   ہیں کیمپ میں ہم تو خانساماں صاحب

اندھیر مچا ہے زیرِ فلک خلقت بھی ہے چپ اور راج بھی چپ   ہم دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے پر کل بھی تھے چپ اور آج بھی چپ
صاحب لوگ نشہ میں ہیں اور بیف[1] کنور جی کی ہے نقل   ہیں مولوی صاحب قبلہ بھی چپ اور پنڈت جی مہراج بھی چپ

سکۂ زر بابرے در دصولتِ زرتار داشت   باوجودش نالہائے زار در اخبار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست   گفت از خوفِ نیس ہر کس درایں کار داشت

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزورِ تیغ   یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزورِ موت

می دہد آں بت کنارِ گنگ ناقوسِ طرب   ندوۂ شیخم مگر در گوشۂ افتادہ است

در پسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست   بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست
یاد دار ایں قولِ مولانائے روم   مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

پشہ بیدار است و پنکھا کش بخواب افتادہ است   اکبرِ بیچارہ امشب در عذاب افتادہ است

زر قوم سے لے کے ایسا ساماں کرو   جس سے کہ تمہاری بزم بن جائے بہشت
حلوے مانڈے سے کام رکھو بھائی   مُردہ دوزخ میں جائے یا پائے بہشت

پردہ ہیں سرور ہے طوالت بے حد   انصاف پسند کو نہیں چاہیئے بحث
تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں   بیگم ہے پیچوان لیڈی سگرٹ

رینگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جھرمٹ   اجمیر میں کلچا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ
بند کسی مشرب و ملت کا نہیں ہوں   گھوڑا مری آزادی کا اب جاتا ہے بگٹٹ

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس   بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر   فوراً داغوں گا اک ڈیفیمیشن[2] سوٹ

---

[1] BEEF ، گائے کا گوشت

[2] DEFAMATION SUIT ، نالش ازالۂ حیثیتِ عرفی

شیطان کا سُنا جو شیخ صاحب نے یہ قول   بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ بھول
میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ   پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول

حضرتِ اکبر سے سُن کر یہ لطیفہ بزم میں   سب ہنسے کچھ رہ گئے خونِ جگر کے پی کے گھونٹ
شیخ جی رفرف بنے پھرتے تھے پہلے چرخ پر   چشمِ بد دور اب بنے ہیں آپ کمسریٹ[1] کے اونٹ

کودتے پھرتے ہیں یہ باغ میں آہو کی طرح   باغباں دبکے ہوئے بیٹھے ہیں اُلّو کی طرح
ان نئی روشنی والوں سے نہیں ہے کچھ فیض   شبِ تاریک میں چمکا کریں جگنو کی طرح
آگئی زلفِ مساں ، زلفِ بتاں پر غالب   پیچ ہوتے تھے بہم افعی و راسو کی طرح
اکبر اس عہد میں و صبر و تحمل سے جو کام   اس سے بہتر ہے کہ غصہ کرو بابو کی طرح

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پخ   اور شیخ کے گھر میں بیچ گانے کی ہے پخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے   گو اُس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پخ

سحر مسلم شکایت باخدا کرد   کہ ابلیسش بما دیدی چہا کرد
من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم   کہ با من آنچہ کرد ، آں آشنا کرد

اکبر اگرچہ موسمِ باراں خوش است خوب   لیکن چہ گوش و چشم دریں فصل وا کنید
مچھر رود کہ گوش بفریادِ بندہ نیز   مکھی گاہ رسد کہ گوشۂ چشمے بما کنید

بگو بہ شیخ کہ او را حرم نخواہد ماند   بگو بہ برہمن او را دھرم نخواہد ماند
من ارچہ در نظرِ یار خاکسار شدم   رقیب نیز چنیں محترم نخواہد ماند

تمہد پہ ہے شبہ و حقارت کی نظر   پیدل پہ غصہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی برہنہ پھریئے اکبر   شاید پڑ جائے اُن کی رغبت کی نظر

جو دونوں ساتھ پڑیں تو یہی مناسب ہے   کہ اپنے گھر میں کرسمس بھی کر تو عید بھی کر
خدا کرے کوئی بت آکے یہ کہے مجھ سے   بٹھا بھی لے مجھے گھر میں ، مجھے مرید بھی کر
جو سن چکے مری غزلیں تو بولے لا چندہ   جو سنہنایا ہے اتنا تو آج سید بھی کر

اس بت کے لئے ہے دہر میں فصلِ بہار   اک تختِ رواں پہ پھرتا ہے لیل و نہار
کہتا ہے اٹھاؤ اس کو یہ ہے مرا عرش   کہہ دو اکبر کہ میں فرشتہ نہ کہار

انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی   نکلتی ہیں دعائیں اُن کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر
تعلق عاشق و معشوق کا تو لطف رکھتا تھا   مزے اب وہ کہاں باقی رہے بی بی میاں ہو کر
نہ تھی مطلق توقع بل بنا کر پیش کر دو گے   مری جاں لُٹ گیا میں تو تمہارا میہماں ہو کر
حقیقت میں میں بلبل ہوں مگر چارے کی خواہش میں   بنا ہوں ممبرِ کونسل یہاں مٹھو میاں ہو کر

---

[1] COMMISSARIAT ، محکمۂ رسد ، نیولا

نکالا کرتی ہیں گھر سے یہ کہہ کر تُو تو مجنوں ہے — ستا رکھا ہے مجھ کو ساس نے لیلیٰ کی ماں ہو کر
رقیب سفلہ خو ٹھہرے نہ میری آہ کے آگے — بھگایا مچھروں کو اُن کے کمرے سے دھواں ہو کر

پائے در پتلون و دل در پیشواز — چند روزے با ہمیں حالت بساز

سنتا ہوں محال ہے خدائی سے گریز — لیکن کہتا تھا مجھ سے کل اِک انگریز
تم ہانک لو اپنے شاعروں سے گھوڑا — فطرت کے حدود سے زیادہ ہے وہ تیز

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز — بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس — اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس
دیکھ کر ہم کو ایسے دلدل میں — راہ چلتا بھی کہہ گیا افسوس

عاشق کا خیال ہے بہت نیک معاش — ہونے نہیں دیتا حسن کے راز کو فاش
کیوں وصل[۳] میں جستجو کم کی رہ کرے — حاضر میں نہ حجت اور نہ غائب کی تلاش

بی شیخانی بھی ہیں بہت ذی ہوش — کہتی ہیں شیخ سے یہ جوش و خروش
خواہ تشنگی ہو خواہ ہو تہمد — در عمل کوش، ہر چہ خواہی پوش

دل نے یہ کہا کہ دین کے جو نہ ہوں دوست — ہرگز رکھوں گا میں نہ ایسوں سے غرض
میں نے یہ کہا کہ خیر بہتر ہے مگر — اب شیخ کو بھی ہے چار پیسوں سے غرض

مذہب کے جو ہو رہیں تو سرکار کا خوف — مذہب سے اگر پھریں تو پھٹکار کا خوف
دونوں سے اگر بچیں تو احباب کو ہے — بے رونقیِ دکان و دربار کا خوف

اونچے ہیں رذیل اور ہیں زیر شریف — قسمت کا یہ دیکھتے ہیں اب پھیر شریف
اکبر یہ مجھے بھلا نے دی خوب صلاح — چل دیکھیے بھائی صاحب اجمیر شریف

پتلے نے کہا کہ سب نشینی میری — ہے قابلِ داد اگر کریں آپ انصاف
میں نے یہ کہا بجا ہے لیکن یہ نشش — ہے بارِ گرانِ دل، تقصیر معاف

فرمائیں مرا قصور حضرت جو معاف — جو امر ہے واقعی، گزارش کروں صاف
انکار نہیں نماز روزے سے مجھے — لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

عالم بنیے تو کیجیے ماتمت کا شوق — مسٹر بنیے تو ہو مساوات کا شوق
چکر ہی میں آپ کو پھنسا رکھوں گا — مجھ کو بھی ہوا ہے اب اسی بات کا شوق

شمع سے تشبیہ پا سکتے ہیں یہ عیاش امیر — رات بھر پگھلا کریں، دن بھر رہیں بالائے طاق[۴]

۳ جب معشوق پیشِ نظر ہو، وصل کے یہی معنی ہیں ۴ سبحان اللہ

ہندو تنتے ہیں تھام کر گائے کے سینگ — آغا گرمی دکھاتے ہیں بیچ کے بھنگ
لیکن حضرت کو ہے یہ کس چیز پہ ناز — کالج میں ڈٹے ہوئے اڑاتے ہیں جو ڈینگ

کیسی ترقی، کیسا میل — ہم سے سن لو اس کا کھیل
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس — فعلن، فعلن، فعلن، فعلن[۱]

اکابر سے حساب دوستانہ بن نہیں سکتا — غلط فہمی بہت ہوتی ہے، پڑ ہی جاتی ہے مشکل
یہ کہہ کر پیش کر دے فردِ اخراجات اے اکبر — حساب دوستاں در دل، حساب خادماں در بل

کہتی ہے زراہِ کبر مجھ سے وہ گرل[۲] — کیا تجھ سے ملوں، کہیں کا تو ڈیوک[۳] نہ ارل[۴]
اکبر نے کہا دکھا کے داغِ دل و اشک — ہے میری گرہ میں بھی یہ روبی[۵] یہ پرل[۶]

خوشی سے میں نے کیے یہ نفائس آم قبول — ادائے شکر میں اب ہو مرا سلام قبول
نہ میں سخن کا ہوں تاجر، نہ طالبِ شہرت — اسی سے کرتی ہے پبلک مرا کلام قبول
زمانہ دیکھیے، کہتے ہیں پنڈت از رہِ طعن — میاں ہماری بھی ہو جائے رام رام قبول
وحید صبح بنارس کی موج میں ہیں پڑے — بھلا وہ کرنے لگے کیوں اودھ کی شام قبول
سُنی جو شوں بتِ کمسن کی بول اٹھے آغا — کہ معتبر نہ شماریم ناتمام قبول
مسوں کے ہوتے ہوئے کیوں بتوں کو میں دل دوں — ملے حلال تو پھر کیوں کروں حرام قبول
منیرِ صورتِ مہرِ منیر تاباں ہوں — کریں خواص و عوام اُن کا احترام قبول
نہ ہو جو وسکی، لندن، تو گھر کا ٹھرا ہو — نہیں ہے بنگ کا مجھ کو تو کوئی جام قبول

سنہ ۱۸۹۷ء

اس قدر رنگ اڑا، ہو گئے رنگین اوراق — چوک میں پادری صاحب نے جو کھولی بیبل
ہنس کے اکبر نے کہا رنج نہیں کچھ اس کا — ہو گئی اب تو حقیقت میں یہ ہولی بیبل[۷]

شیخ صاحب کو نہیں شاعروں کی بات سے کام — حسن کی قید نہیں، بس ہے مساۃ سے کام
یاں تو بیانی کے اذانوں سے دل بریاں ہے — بابو ہی اچھے کہ اُن کو ہے فقط بھات سے کام
کہتے ہیں ہم کو جو چندہ دے، مہذب ہے وہی — اس کے افعال سے مطلب ہے، نہ عادات سے کام

ماسٹر صاحب کا علم اس وقت گو ہے نیک نام — اہلِ دانش میں مگر میرا فزوں ہے احترام
بات بالکل صاف ہے، پیچیدگی کچھ بھی نہیں — میں ہوں سعدیؒ کا بھتیجا، وہ ہیں ملٹن کے غلام

مذہب نے کر دیا تھا ہر اک کو غریقِ نوم — مجھے مبتلائے حج و صلوٰۃ و زکوٰۃ و صوم
دنیا و دیں کا فیصلہ آخر کو یہ ہوا — عشقِ بتاں شباب میں، پیری میں عشقِ قوم

مِنَ العِلمِ قَلِیلًا کو بھی دیکھو بعد اُوتِیتُم — نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم

---

۱ یہ مصرع محض اظہارِ وزن کے لیے ہے، قافیہ نہیں ہے ۲ GIRL ۳ DUKE ۴ EARL ۵ RUBY لعل
۶ PEARL موتی ۷ HOLY BIBLE انجیل مقدس

تجھ کو کیا کسی کی ہوا نے فدائے گل   مجھ کو کیا کسی کی ادا نے فدائے قوم
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے قوم

آپ کی فرقت میں، میں کل رات بھر سویا نہیں   لیکن اتنی بات تھی، گاتا رہا، رویا نہیں
نوشِ جاں فرمائیں حضرت شوق سے یہ ناشتا   چھ بجے ہیں، میں نے تو منہ بھی ابھی دھویا نہیں

بوسٹ[1] کیسا، گلوری بھی نہیں پاتا ہوں   بس کلام اپنا انہیں جا کے سنا آتا ہوں
وہ یہ فرماتے ہیں، کیا خوب کہا ہے واللہ   میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں

ہم کیا خالی ہوائی گولا چھوڑیں   کس جوگ سے بل پر اپنا جولا چھوڑیں
حضرت نے تو چھاؤنی میں رکھی ہے دکان   ہم کیوں اپنا عصا ٹولا چھوڑیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں   مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

سوپ[2] کا شائق ہوں، یخنی ہوگی کیا   چاہیے کٹلٹ[3] یہ قیمہ کیا کروں
لیتھبرج کی چاہیے ریڈر مجھے   شیخ سعدیؒ کی کریما کیا کروں
کھینچتے ہیں ہر طرف تانیں حریف   پھر میں اپنے منہ کو ڈھیلا کیا کروں
ڈاکٹر سے دوستی، لڑنے سے بیر   پھر میں اپنی جان بیجا کیا کروں
چاند میں آیا نظر غارِ مہیب   ہائے اب اے ماہ سیما کیا کروں

زور پر ہے شہر میں طاعون، بچاؤ کیا کروں   لاٹ صاحب تک ہیں چپ، پھر میں بچارا کیا کروں

نیچری واعظ مہذب کو لیے پھرتے ہیں   شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لیے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں   ہم تو اک شوخ شکر لب کو لیے پھرتے ہیں

بے سُرو اشعار اور کبت ہوتے ہیں   مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
کر پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار   یہ بت تو بزورِ زر ہی چت ہوتے ہیں

سچ کہا اکبر نے ہاتھا پائی کا ہے کیا علاج   زورِ منطق سے تو ممکن ہے انہیں ساکت کریں
بدگماں ہرگز نہ ہوں وہ، ہم جو ان کو چت کریں   ہے فقط یہ مدعا اُن کی کمر ثابت کریں
شیخ جی فربہ تھے، اُن کی طبع میں جدت کہاں   مغربی جوہر مگر بلغم کو چاہیں پت کریں

پوچھوں دنیا سے کس طرح میں ہوں؟   عورت نے کہا کہ گود میں ہوں
قومی چندے کدھر سمائیں؟   کالج نے کہا کہ توند میں ہوں

ماشاء اللہ وہ ڈنر کھاتے ہیں   بنگالی بھائی اُن کا سر کھاتے ہیں
بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکبر   اُن کی گاتے ہیں، اپنے گھر کھاتے ہیں

---

[1] اور کچھ کیا [2] SOUP انگریزی شوربا [3] CUTLET انگریزی کباب

یورپ والے جو چاہیں، دل میں بھر دیں   جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر   تم کیا ہو، خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بینک[1] میں   قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس[2] میں

لذت چاہو تو وصلِ معشوق کہاں   شوکت چاہو تو زر کا صندوق کہاں
کہتا ہے یہ دل کہ خودکشی کی ٹھہرے   خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں

شبوں میں کورس، دن میں نارملا[3] ورک کرتے ہیں   عدیم الفرصتی سے اُن کی الفت ترک کرتے ہیں

آپ کی صورت بہت اچھی ہے اس میں شک نہیں   پھر مجھے کیا، ذہن میں اس کا جواب اب تک نہیں
مجھ سے آخر آپ کو کیوں اس قدر وحشت ہے یہ خوف   آپ بنگالی نہیں ہیں، اور میں اُزبک نہیں

گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں   پھر بھی سیدھے ہیں، نہایت نیک ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ گیو می کس ڈیر[4]   سر جھکا کر کہتے یو مے ٹیک[5] ہیں

تن رہے ہیں آپ فکرِ جاہ سے پتلون میں   میں گھلا جاتا ہوں فکرِ رزق کی افیون میں

حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ   گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے   چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آ گیا غصہ   لگے کہنے یہ، پھینک کر دھتا
تم ہو شیطان کے مطیع و مرید   تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید
ہے تمہاری [illegible]   جس طرح ہو پڑی پریڈ پہ لید

کل مستِ عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں   اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
دنیا اسے قرار دو اور آخرت یہ ہے   سن لو کہ سازِ معنیٔ اکبر کی گت یہ ہے

سنا کے مصرع یہ شیخ صاحب بہت زیادہ بھنا چکے ہیں   ہماری گردن وہ کیوں نہ ناپیں جو ناک اپنی کٹا چکے ہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مے کی طرف سے معذرت

قسمت وہ کہاں کہ اب وہ تقسیم نہیں   کیوں کر وہ اثر ہو، جب وہ تعلیم نہیں
لغزش پہ مری بُرا نہ مانو اے شیخ   وہسکی کی ہے لہر، موجِ تسنیم نہیں

مچھروں نے بہت ستایا رات   میں نے کوسا کہ ہو تمہیں طاعون

---

[1] BANKS [2] THANKS [3] انگریزی حساب، کالج میں جس کی تعلیم ہوتی ہے
[4] GIVE ME KISS DEAR یعنی پیاری مجھ کو بوسہ دو [5] YOU MAY TAKE یعنی آپ لے سکتے ہیں۔

بولے، اس کا ہمارا منبع ایک
کیوں وہ کرنے لگا ہمارا خون

گئے کول حافظ محمد حسین !
تو ہدی سے بولے، یہ حاجی مدن
کو کر دیجئے اُن کی دعوت ضرور
وہ ہیں صاحبِ دانش و علم و فن
وہ ہیں مولوی، آپ بھی مولوی
ذرا دیکھ لیں رونقِ انجمن
وہ بولے، مرا اُن کا کیا جوڑ ہے
میں گلڈنگ[1] ہوں، وہ ہیں اسٹیلین[2]

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں
اغیار اُن پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث
ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں

چندوں ہی کے سوجھتے ہیں ان کو مضمون
دل شاد ہو اُس سے قوم، یا ہو محزون
لڑکے انہیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم
یہ ہیں نئی روشنی کے چندا ماموں

اعزازِ نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں
اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں
سیّد بننا ہو تو بنو سر سیّد
ہونا ہو خان تو تم ہو انگریزی خواں

متفرق شعر ہیں قطعہ نہیں ہے

پردہ اُٹھا ہے، ترقی کے یہ ساماں تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی، غلماں تو ہیں
کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
ٹھینک یو ڈیر میں سننے کے لئے کان تو ہیں
خاصدان آگے بڑھا کر مری باتوں پہ، کہا
آپ کیوں جان مری کھاتے ہیں، پان تو ہیں
اُن سے ملنے میں ہے ایمان کا نقصان اکبر
خیر جو کچھ ہو، نکلتے مرے ارمان تو ہیں

وہ ایسی ریش والے کو بھلا کب پان دیتے ہیں
جنابِ شیخ ناحق اس ہوس میں جان دیتے ہیں

کیوں کرتا ہے اعتراض بے شرم
اُس کا جو ہیں ہم زباں نہیں ہوں
گو ہوں نئی روشنی کا شیدا
گو میں شرعی جواں نہیں ہوں
کرتا نہیں لیکن اس کی عظمت
اُس کا افسانہ خواں نہیں ہوں
کرتا نہیں قوم پر اُسے پیش
عیاش ہوں، قلتباں نہیں ہوں

غزل میری سنتے نہیں شیخ جی
تقدس کی بھی انتہا ہو گئی
تکلف سے پکوان میں دن ڈھلا
ہماری تو پوری سزا ہو گئی
اضافہ ہوئی مجھ سے گندم پہ نے
یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق، ٹوٹے جو دانت
غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

پیارا ہے ہم کو، شیخ ہمارا بُرا سہی
چاقو ولایتی نہیں، دیسی چھُرا سہی
اکبر کا لغو قوم کے حق میں مفید ہے
دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ، بے مزا سہی

---

[1] GELDING آختہ گھوڑا [2] STALLION سانڈ گھوڑا

رہا کرتا ہے مُرغِ نغمہ شاکی
نئی تہذیب کے انڈے ہیں خاکی
چھُری سے اُن کی کٹوا کر فلک نے
خُدا جانے ہماری ناک کیا کی

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
نظر یورپ کی کام اپنا کیے کی

ہے عجب انقلاب دُنیا میں
کیا کہوں بات بھائی صاحب کی
اب وہ تسبیح پر بجائے درود
پڑھ رہے ہیں دُہائی صاحب کی

ہوئی جب آمدِ پیری ہوا میں سر کی پیشانی !
ترش روئی کی چٹنی جوڑ ہے ڈاڑھی ہو جب کھچڑی
سوال اب یہ عبث ہے جب کہ پتلونوں کی ارزانی
چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی

کچھ سین خوش آتے ہیں، نہ بھاتے ہیں برجی
میں زیل[1] کا طالب ہوں، نہ خواہانِ انرجی[2]
سنتا نہیں لکچر میں، پڑا رہتا ہوں دن رات
لگتا ہے فقط سیڈروں میں وقت و انرجی

کمپ میں محروم ہوں میں لطفِ خاطر خواہ سے
آ گیا ہوں تنگ مذہب کی معاذ اللہ سے

وضعِ مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی
اب میں سمجھا واقعی ڈاڑھی خُدا کا نُور تھی

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی
تخلیئے کی بات پبلک کے دلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں
یہ اثر اُس کا ہوا، اُردو سے ہندی لڑ گئی

سائنس سے زیادہ ہے مذہب کی جڑ بڑی
توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی
بابو یہ کہتے ہیں کہ دھرم جیت جائے گا
اس وقت گو ملکش نے ڈالی ہے گڑبڑی

بچھڑیوں میں ہے پرستش گئو بیٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے ٹیلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقوے کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

مقصود ہے شغل، کوئی مضموں سہی
پیمانۂ مے نہیں تو افیوں سہی
ہنگامۂ موت بھی ہے اک جشن اکبر
گر جنگ نہیں تو خیر طاعوں سہی

لذتِ نانِ جویں تجھ کو مبارک اے شیخ
مجھ گنہگار کو ہے صرف مٹن کافی
حضرتِ خضر ٹکٹ مجھ کو دلا دیں اکبر
رہنمائی کے لئے ہے مجھے انجن کافی

وحشت نئی روشنی سے آخر کو گھٹی
فکرِ روزی میں شیخ کی طبع ڈٹی
کرکٹ، جمناسٹک، ٹریننگ کالج
مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نٹی

امورِ ملکی کی بحث میں تم جو ہندوؤں کے بنو گے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے، نہ راجہ جی سے ملے گا ہاتھی

---

[1] ZEAL سعی کی کوشش [2] ENERGY طاقت

نہ اپنا مکتب وہ تم کو دینگے، نہ اپنی پوری وہ بانٹ دینگے / پڑے گا موقع جو کوئی آکر تو دونوں ہی تم کو چھانٹ دینگے
مگر وہ کہتے ہیں دور تم سے، یہ لوگ ساتھی ہیں اور پڑوسی / ملے جلے ہیں سوسائٹی میں، ایران میں تو ہم ہیں گھوسی
ہزل کو اپنی جو چھوڑ کر تم انہیں کی شرکت کرو ژٹل میں / تو یہ تو کوئی نہ کہہ سکے گا، تمہارے دشمن کہاں بغل میں
نہ ہوگی حکام کو بھی دقت، جو ہوگی اک جا ہر اک کی خواہش / ضرورت اُن کو بھی یہ نہ ہوگی کریں ہر اک سے علیحدہ غرفش
جو مانگو گے ایک جیل مسلم، وہ کاٹ کر ایک پھانک دینگے / چلاؤ گے پھر بھی مُنہ تو سب کو وہ ایک لاٹھی سے ہانک دینگے

اُن کے دستِ نازنیں سے پائی ٹی[1] / اب کہاں باقی ہے ہم میں پائیٹی[2]

آخر کو ہوئی وہ بات جو تھی ہونی / مذہب مٹی ہے یا مٹی ہے ڈھونی
جو سُست تھے، ہوگئے ہیں وہ شترِ حلیم / جو تیز تھے بن گئے ہیں پولو پونی[3]

مذہب اور مولوی پہ گالی، ہولی / اسپیچ یہ انجمن میں تالی، ہولی
دروازۂ منطقی ہے ہم پہ کیوں بند / ہر بات نوائے جنابِ عالی، ہولی

معنئ جنگِ اردو ہندی / میں یہ سمجھا بہ عالمِ رندی
یعنی ہے اس میں لطفِ وصلِ زباں / خوب مل کر لڑی زباں سے زباں

اخلاقِ نکو و خوشش تیزی نہ سہی / القاب حبیبی و عزیزی نہ سہی
میٹھے پانی سے ہے زبانِ شیریں کام / جاں بخش حرارتِ غریزی نہ سہی

بھائی مجھے کل یہ بات بلی مُنّی کی / تفریق اُڑا دو شیعہ و سُنّی کی
جیسا موقع ہو بس بٹھا دو وہ نگیں / پھیرے کی نہ شرط ہو نہ ضد چُنّی کی

ملتا نہیں گوشت، خیر ہڈی ہی سہی / کچھ کھیل ضرور ہے، گھسنڈی ہی سہی
موقع جو پریڈ پر قواعد کا نہیں / چندہ بھی کھیل کر، کبڈی ہی سہی

واہ کیا دھج ہے میم کے بھوسے کی / شکل کوے کی، ہیٹ سوے کی

مری فغاں پہ مِس ناشناس بول اُٹھی / کہ بابوؤں میں تو عادت ہے غل مچانے کی
بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر / یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی

کوئی شورش نہیں ہے، ہر طرح سے خیر سلّا ہے / نہ سرگرمی پولیس کی ہے نہ جاری مارشل لا ہے
یہ کلکتہ[4] کی شوخی اور یہ ڈھاکہ[5] کی ادا سمجھی / وہ اک فرنگی کبڈی ہے، یہ لفظی گیند بلا ہے
یہ دیسی ورزشیں ہیں، مغربی جمناسٹک ہے وہ / نئے سن کی کتابیں ہیں، کرکس کا پچھلا ہے

مہمانِ فلک کسے سکوں پاتا ہے / آسودہ جو ہیں، انہیں بھی ٹہلاتا ہے
ہے جسم کی فکر میں یہ نقل و حرکت / ظاہر ہے صریح، پیٹ دوڑاتا ہے

در پہ مظلوم اک پڑا روتا ہے / بے چارہ بلا میں مبتلا روتا ہے
کہتا ہے وہ شوخ، تال سم ٹھیک نہیں / کیا اس کی سُنوں کہ بے سُرا روتا ہے

نہ وہ قصبیں، نہ وہ رسمیں، نہ چُٹیا ہے، نہ لٹیا ہے / مگر ہیں مُفتی، کوئی تُل ہے، کوئی مٹیا ہے

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے / سو اگر یہ خیال آیا، ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے
کہاں کے قبلہ، کہاں کے قبلی، جنید کیسے، کہاں کے شبلی / عوض تصوف کے ہم نے طب لی، بنیں گے سرجن، مزا کرینگے
اجل سے بھی پھر نہ ہونگے خائف، مزاج سے اپنے ہونگے واقف / اثر کرے گی ہوا مخالف تو آپ اپنی دوا کریں گے

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے / کہنے لگا اس سے تیرا مطلب کیا ہے
میں نے یہ کہا کہ عقول ہندی کے لئے / بولا کہ شکست کھا چکے، اب کیا ہے

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے / اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے
دیکھو جسے، وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا / بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے
چشمِ جہاں سے حالتِ اصلی چھپی نہیں / اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجئے
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو / طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجئے
سُنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات / انجن کی اُن کے کان میں اب بھاپ دیجئے
اُس بُت کے در پہ غیر سے اکبر نے کہہ دیا / زر ہی میں دینے لایا ہوں، جان آپ دیجئے

شیخ صاحب دیکھ کر اُس مِس کو ساکت ہوگئے / ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے، چت ہوگئے

نہ کچھ انتظارِ گزٹ کیجئے / جو افسر کہے، بس وہ جھٹ کیجئے
بہت بھاتی ہے اُس کی چھریری مجھے / دعا ہے کہ لڑکی یہ نٹ کی بچے
کہاں کا حلال اور کیسا حرام / جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے
سکھاتے ہیں تقلیدِ انگلش جو آپ / کہیں مفلسوں کو نہ پٹ کیجئے
بگڑ جائے گا سیم سے سارا کھیل / بس ان مفلسوں پہ نہ ہٹ کیجئے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے / تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے
اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث / اب اِمنّا کیجئے اور نہ ہٹ کیجئے

نہایت حکمت آگیں آپ کی اسپیچ ہوتی ہے / مزا شربت کا دے جاتی ہے گو وہ پیچ ہوتی ہے

نبض آپ کی ہے سُست، بدن آپ کا بج ہے / شاید چلی بیگم سے کسی بات پہ پچ ہے
پہنچا ہیں فلک پر جو نظر تم نے ملائی / شاید کہ میں تنگ ہوں، نظر آپ کی کج ہے
اپنے شجرِ حسن کی وہ خیر منائیں / عُشّاق کی کثرت ہے کہ یہ فوجِ ملخ ہے
جذبے کو سدھارے ہوئے مدت ہوئی اکبر / البتہ علی گڑھ کی لگی ایک یہ پخ ہے

رندی و شراب و بزمِ شاہد بھی ہے / منطق بھی ہے، دلیلِ ملحد بھی ہے

---

[1] TEA چائے [2] PIETY تقدس [3] POLO PONY [4] کانگرس [5] کانفرنس

[1] IF اگر [2] BUT لیکن

لیکن قسریانِ حکمت پیرِ مغاں   دو مولوی بھی ہیں، ایک مسجد بھی ہے

دُھن نوکری کی ہے، نہ پرنس ہے، نہ حور ہے   اب فکر پاس کی ہے، قیامت تو دُور ہے
آئین بھی بدلتے ہیں نیت کے ساتھ روز   اُمیدِ بے اصول سے اب دل نفور ہے

دن تو جناب کی خدمت میں بسر ہوتا ہے   رات پریوں کی خوشامد میں گزر جاتی ہے
سلف ریسپکٹ کا وقت آئے کہاں سے اکبر   دیکھ تو غور سے دنیا کو، کدھر جاتی ہے

نوکروں پر جو گزرتی ہے، مجھے معلوم ہے   بس کرم کیجیے، مجھے بیکار رہنے دیجیے
راہ میں لیسنس ہی کافی ہے عزت کے لئے   بس یہی لے لیجیے، تلوار رہنے دیجیے
ڈاکٹر صاحب سے ملنا آپ کا اچھا نہیں   بیٹھیے گھر میں، مجھے بیمار رہنے دیجیے
تیزیٔ مے کا اثر تھا، نزع کی آمد نہ تھی   خیر اُٹھیے تو بر استغفار رہنے دیجیے

کامیابی کا سد لِشِپ پر ہر اک دل بستہ ہے   چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پربستہ ہے

مندرجہ ذیل اشعار آگرہ میں کہے گئے تھے

شومیکری[۳] شروع جو کی اک عزیز نے   جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی   مورث تمہارے آئے تھے غزنی و غور سے
کہنے لگے، سبب ہے اس میں بھی اک بات نوک کی   روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

موقع چھوٹے اُن کے پنجے سے جب   تو لیس قوم مرحوم کے سر ہو گئے
پپیہے پکارا کیے پی کہاں   مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

پردے کے واسطے تو عبث بیقرار ہے   پردہ وروں کا راز تو خود آشکار ہے
آغا تقی میں حسن نہ اب وہ سنگار ہے   پردہ اُٹھا کے دیکھو تو کوا گھار ہے
زاہد ایسے بے خبر ہیں ابروئے خم دار سے   جس طرح بابو کہ ہے بیگانہ تلوار سے

پریوں کا شوق ہے، نہ مجھے فکرِ حور ہے   کالج سے ہے نجات تو ذکرِ حضور ہے

بابو صاحب نے کہا اک باغ ہے میرا کلام   اس میں کیا شک ہے مگر یہ باغِ شالامار ہے

سوئے فلک چلے جو غبارے میں بیٹھ کر   منہ حاسدوں کے غصہ و غیرت سے مڑ چلے
احباب نے کہا کہ مبارک ہو یہ عروج   شکرِ خدا کہ اب تو یہ بابو بھی اُڑ چلے

سینۂ مس کا اُبھار اے دل فساد انگیز ہے   لوگ سچ کہتے ہیں، بادنجان باد انگیز ہے
عدل انگلش برنچ سے تو نیند آ رہی ہے شیخ کو   بابوؤں کی شورش البتہ جہاد انگیز ہے
علم کی حد تک عقیدے سب یقیں کے ساتھ ہیں   اس سے آگے کی ہوس صرف اعتقاد انگیز ہے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا   آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی[۱] پاس ہے

۱؎ مغربی زوجہ ۲؎ جوتا بنانے کا کام ۳؎ ENGLISH MAN

ممکن نہیں اے مِس ترا نوٹس نہ لیا جائے   گال ایسے پری زاد ہوں اور کِس[۱] نہ لیا جائے

لندن میں بگڑ جاؤ گے، وسواس یہی ہے   تم پاس رہو میرے، بڑا پاس یہی ہے

ہر اک ریمارک[۲] آپ کا عقرب کا نیش ہے   مجھ کو بھی رنج، غیر کا سینہ بھی ریش ہے

مجھ سے کہا کہ گزرِ نشتر ہے ترا سخن   اس سے یہ کہہ دیا کہ تو گوہرِ گنیش ہے

یاروں کو فکرِ روزِ جزا کچھ نہیں رہی   بس کام ہے انہیں رہ عیش و نشاط سے
کہتے ہیں، حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پل   بائیسکل پہ گذریں گے ہم پل صراط سے

خلقت اسی سمت صف بہ صف جاتی ہے   با عود و رباب و چنگ و دف جاتی ہے
بے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست   ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرتِ واعظ ہیں خوب شخص   یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

اُردو کے تین رُبع کے مالک ہیں خود ہنود   پھر کیا سبب جو اس سے اُنہیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز انہیں کے مذاق کی   اُردو کے تین جز وہی صاف صاف ہے

ذوقِ معنی نہیں تجھے اکبر   سن لے یہ بات گر تجھے شک ہے
شیخ سے چھوٹے، آ پھنسے انجن میں   اُس میں بک بک تھی، اس میں بھک بھک ہے

ہر چند کہ مجھ کو اعتقاد اب تک ہے   تاہم بہ لحاظِ وقت دل میں شک ہے
بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور   کیا جانے مراقبہ ہے، یا پینک ہے

کی ہے مدرسے نے کمیٹی پیٹ میں   بائی لاز[۳] ہر رگ کے اندر ٹھیک ہے
حضرتِ نزلہ ہیں صدرِ انجمن   دم بدم ان کی بھی اک تحریک ہے

قدموں سے تیرے رونقِ شہر پراگ ہے   یعنی ترے ہی دم سے بتوں کا سہاگ ہے
بھڑکی ہے دل کی آگ گوالن کے عشق میں   احباب ہنستے ہیں کہ یہ کنڈے کی آگ ہے

سب سمجھتے ہیں کہ یہ عشقِ بتاں اک روگ ہے   لیکن اس کو کیا کریں، ملتا جو مفت بھوگ ہے
شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قبول   ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر، آپ کالا لوگ ہے

دیکھوں عروسِ دہر کو کیوں آنکھ کھول کے   بہتر یہی ہے، کام نکالوں ٹٹول کے

جو مرد ہیں، وہ پاک ہیں دنیا کے کھیل سے   سچ ہے خبیث ملتے ہیں ایسی چڑیل سے

۱؎ KISS ۲؎ REMARK ۳؎ BYELAW قواعد

چہرے کے نیچے تھرہے ڈاڑھی کا جھول جھال اس فرد کو جب پائیے تفصیلِ ذیل سے

جب کہا گیسو کا بوسہ دیجیے دل لیجیے! ہنس کے بولے، آپ کو سودا ہے مُسہل لیجیے

دل میں جو پڑ گئی ہے گرہ، کھول ڈالیے اک دم میں کُل متاعِ سخن تول ڈالیے
ترکیب ہے ترقیٔ اُردو کی بس یہ خوب جو آپ بول سکتے ہیں، سب بول ڈالیے

وہ اکبر بس مقیمِ کول ہو کر رہ گئے خود فروشی کی نہیں، انمول ہو کر رہ گئے
عرض و طولِ ہند میں تم نے نہ دوڑائے خطوط دل کشی مرکز میں پائی، گول ہو کر رہ گئے

ہم سے شبِ وصال وہ بے میل ہو گئے افسوس انٹرنس میں ہم فیل ہو گئے
درگاہ کے چراغ کو چھوڑا برائے لیمپ سب کی نظر میں گھی سے مگر تیل ہو گئے
بوڑھوں نے پہلے لڑکوں کو خود ہی بنایا کھیل ان کی نظر میں آپ ہی اب کھیل ہو گئے
اے شیخ جب نکیل نہیں دستِ قوم میں پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے بیل ہو گئے
ہم بھی کلیل کرنے لگے گائے کی طرح اس ملک میں بھی حضرتِ گو کھیل ہو گئے

میں نے جو کہا، کُل انتظام آپ کا ہے بے فائدہ آپ کا یہ کام آپ کا ہے
کہنے لگے مسکرا کے، یہ سب ہے صحیح! لیکن کوشش یہ کیجیے کہ نام آپ کا ہے

مذہب جن کی نظر سے بالکل گُم ہے کیوں کر میں کہوں وہ داخلِ مردم ہے
شائستہ جو ہو تو اس کو پُونی[1] سمجھو! ایسا جو نہ ہو تو اک غریبِ دُم ہے

آئندہ اُردو زبان کے نمونے

بابوجی کا وہ بُت ہوا نوکر غیر اس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا سیکنڈ انڈر[2] میں کام دیتا ہے

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

اب کہاں تک بُتکدے میں صرفِ ایماں کیجیے تا کجا عشقِ بُتاں میں سُستِ پیماں کیجیے
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سیّد سے کہوں مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

جب اگلا کورس خارج ہو گیا تعلیمِ طفلاں سے تو اب اعراض ہم کیوں کر کریں تعلیمِ نسواں سے

ان کو کیا کام ہے مروّت سے اپنے رُخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

---

[1] PONY [2] UNDER تخت

نہیں کچھ گفتگو اس میں، یقیناً شیر ہیں حضرت بس اتنی بحث باقی ہے، یہ بھینسا ہے کہ انجن ہے
چمک تیغوں کی، ہاتھوں کی صفائی، واہ کیا کہنا مگر یہ دیکھ لو، گھٹا ربہ کا ہے کہ گردن ہے
مدارِ کار جب ہو اتفاق و عقل و حکمت پہ تو اس سے جو کرے غفلت، وہ اپنا آپ دشمن ہے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضرؑ نے اونٹ کا سیکن کرایہ کون دے

اب تو جاگو ایشیائی بھائیو نیند میں غفلت کی صدیوں سو لیے
ہو مبارک جستجوئے خضرؑ انہیں ہم تو اب انجن کے پیچھے ہو لیے
اب تھیٹر میں ہنسیں گے جا کے خوب خانقاہوں میں تو برسوں رو لیے

ہوتا ہے نفخِ یورپین نان پاؤ سے میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے
دھمکا کے بوسے لوں گا رُخِ رشکِ ماہ کا چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

چٹھی اُس مس کی ہے کہ یہ جادو ہے دل جوشِ مفاخرت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے! القاب میں دیکھیے ڈیر کلّو ہے

ہندی مسلم میں ہند کی نیو بھی ہے افطار میں ہے کھجور تو سیو بھی ہے
اللہ اللہ زبان پہ بے شک لیکن اک رنگِ بم مہادیو بھی ہے

بُرا ہُوا کہ رقیبوں میں بڑھ گئے بابو ذرا سی بات ہوئی اور یہ شُو کے تھانہ چلے

حریصِ زر کی میت پہ یہ بولا طالبِ قُوّت جو مل جائے تو اس کو کھاؤں یہ سونے کا کُشتہ ہے

ہیں لیمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے جلتا ہے چراغ سے، جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے لیے روشن پہ نگاہ جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

عبث اُن کا گِلہ ہے مستغیثہ بولتی کیوں ہے کوئی پوچھے تو ناحق تم نے ڈالی اولتی کیوں ہے

آپ کی انجمن کی ہے کیا بات آہ چھپتی ہے، واہ چھپتی ہے
ہمتوں سے ہوئی ہے جزوِ شکم رُوح بھی اب تو کورس جپتی ہے
اس غرض سے کہ سینہ پوش نہ ہو شیخ کی ریش روز نپتی ہے
پا سکے خامہ ٹھہر نہیں سکتا کس قدر یہ زمین تپتی ہے

جو عقل کھری تھی، کی وہ کھوٹی اس نے اچھے اچھوں سے چھینی روٹی اس نے
مستوں پہ شراب فاقہ مستی لائی پتلون کو کر دیا لنگوٹی اس نے

کہا جو میں نے کہ اُن کی ادا انوکھی ہے کہا بتوں نے کہ اُردو میاں کی چوکھی ہے

نکتہ یہ سنا ہے ایک بنگالی سے
کرنا ہو بسر جو تم کو خوش حالی سے
خالی ہو جگہ تو اپنے بھائی کو دلاؤ
غصہ آئے تو کام لو گالی سے

اُن کی تحریکوں سے یوں رہتا ہے دنیا بے چین
جس طرح پیٹ میں بیمار کے بائی دوڑے
ممبری کے لئے لپکا مری جانب وہ غول
گائے موٹی نظر آئی تو قصائی دوڑے

مار و کژدم رہ گئے، کیڑے مکوڑے رہ گئے
صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے
خضر عنقا ہو گئے، موذی بنے ہیں سدِ راہ
گر گئے سنگِ نشاں، سڑکوں پہ روڑے رہ گئے
پردہ دری کی رائے سن کر بیبیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ ابھرے ہیں اب
اُونٹ رخصت ہو گئے، پولو کے گھوڑے رہ گئے

جو وقتِ ختنہ میں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر
مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

عاشقی کا ہو بُرا، اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے۔ بی میں رہے، اغیار بی۔ اے ہو گئے

پردہ کا مخالف جو سُنا، بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ، علی گڑھ کے حوالے

کھائی مژگان و نظر کی جو قسم، بولا وہ شوخ
آپ اب قسمیں بھی کھاتے ہیں چھُری کانٹے سے

دیکھ لو حال مرا، آہ کی حاجت کیا ہے
دو اور اک تین پہ واللہ کی حاجت کیا ہے
بیچیے انجمن کے بس اب ہوئیں مسلمان بھائی
اب انہیں خضرؑ کی اور راہ کی حاجت کیا ہے
دادِ قرآں کی نہ دو بھائی، عمل اس پہ کرو
پیشِ درگاہِ خدا، واہ کی حاجت کیا ہے

ناک رگڑی برسوں اس ارمان میں
سن لیں میری بات اک دن کان میں

قصۂ منصور سُن کر بول اُٹھی وہ شوخ مس
کیسا احمق لوگ تھا، پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے
اور یہ کافر پکارے، در پناہِ من بیا[1]

کہتے ہیں، اکبر یہ تیری عقل کا کیا پھیر ہے
طبع تیری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ میں بھی ہوں گا حاضر عنقریب
ہو چکا ہوں پیر، بس نابالغی کی دیر ہے

ملتا نہیں گھی تو خشک روٹی ہی سہی
نعمت جو بڑی نہیں تو چھوٹی ہی سہی
میں قوم کی فربہی کا مشتاق نہیں
بس جائیے، میری عقل موٹی ہی سہی

نفرت تھی مجھ کو بے شک تھیٹر کے بولنے سے
کہتا تھا اپنے دل میں، بے چارہ کیا بُرا ہے
آخر کھُلا یہ عقدہ نفرت کا مجھ کو اکبر
آواز بے تُکی ہے، کم بخت بے سُرا ہے

چند ذرّے کیمیا سے رنگ کی پُڑیا بنے
شیخ صاحب ہوش بھی کھو بیٹھے اور گڑیا بنے

مغربی کل نے مجھ کو پیسا ہے
میرا چُونا ہے اور کلیسا ہے
آپ ہی گا کے جھوم لیتے ہیں
باربُد ہے نہ اب نکیسا ہے

نکالا شیخ کو مجلس سے اُس نے یہ کہہ کر
یہ بے وقوف ہے، مرنے کا ذکر کرتا ہے

تم ناک چڑھاتے ہو مری بات پہ اے شیخ
کھینچوں گا کسی روز میں اب کان تمہارے

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ سے، وہ دُور بھلا کب ہوتی ہے
رکھی ہے چنوٹی پاکٹ میں، پتلون کے نیچے دھوتی ہے

نہ تو انگریز بنے ہم، نہ مسلمان رہے
عمر سب مفت میں کھو دیا کیے نادان رہے
طاقتِ اسلام کی کہتی تھی مسلمانوں سے
جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے
ان کی سب سنتے ہیں، اپنی نہیں کہہ سکتے کچھ
کیا قیامت ہے، زباں کٹ گئی اور کان رہے
تھی بہت اُن کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر
بس رہے، مسجد کے تلے مے کا بھی سامان رہے
راحتِ جاں ہے تری نظمِ دل آویز اکبر
تندرستی رہے، ایمان رہے، جان رہے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں، اللہ نگہبان رہے

انگریز میں عظمتِ جہاں بانی ہے
ہم میں اک شانِ علم روحانی ہے
لیکن تم لوگ تو کسی میں بھی نہیں
بازو نہ قوی، نہ قلبِ نورانی ہے

[1] نقلِ کفر کفر نہ باشد۔